بھارت اور امریکہ

پاکستان کے دوست یا دشمن

آغا امیر حسین

بھارت اور امریکہ.......... پاکستان کے دوست یا دشمن؟ آغا امیر حسین کے سیاسی شذرات ہیں جو انہوں نے گذشتہ پانچ برسوں کے دوران لکھے۔ اگرچہ یہ شذرات حالات حاضرہ کے ذیل میں تحریر ہوئے لیکن ان میں پاک بھارت اور پاک امریکہ تعلقات کی تمام تر تاریخ نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ یہ تاریخ ان دونوں ممالک کے پاکستان کے ساتھ دوطرفہ تعلقات اور ان ممالک کے پاکستان کیلئے عزائم کی آئینہ دار ہے۔

پاکستان کے وجود میں آتے ہی بھارت نے پاکستان کیلئے کیا رویہ اپنایا۔ برصغیر کی تقسیم کا ایجنڈا کس طرح ادھورا رہ گیا؟ کشمیر کا تنازعہ کیوں الجھن کا شکار ہوا، مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے اسباب کیا تھے؟ بھارت نے پاکستان کو لولا لنگڑا اور اپنا طفیلی ملک بنانے کیلئے کیا کیا ہتھکنڈے اختیار کیئے؟ ہماری نئی نسل کو ان کی خبر نہیں۔ آج یہ سب کچھ یاد کرنے اور یاد دلانے کی ضرورت اس لئے ہے کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ ماضی کی تلخیوں کو بھول کر آگے بڑھنا ایک مثبت سوچ ہے۔ لیکن کیا بھارت مخلص ہے؟ کیا ماضی کی تلخیوں کو بھولا جاسکتا ہے؟ اور بہت بڑا سوال یہ ہے کہ یہ تلخیاں پیدا کس نے کیں؟

پاکستان نے اپنے قیام کے بعد سوویت یونین کی بجائے سمندر پار امریکہ سے کیوں تعلقات استوار کیئے؟ سرد جنگ میں امریکہ کا خاموش ساتھی اور افغان جنگ میں فرنٹ لائن اتحادی کیوں بنا؟ امریکہ کا اتحادی بننے کے بعد اسے بین الاقوامی سطح پر اس کی اعانت وحمایت میسر آئی؟ کیا امریکہ نے پاکستان کو مشکلات سے نکلنے میں کبھی مدد دی؟ سوویت یونین کے انہدام کے بعد امریکہ کا رویہ پاکستان کیلئے کیا رہا؟ نائن الیون کے بعد امریکہ نے پاکستان کو ڈکٹیٹ کیوں کیا؟ اور اب افغانستان اور عراق کے حوالے سے وہ پاکستان سے کیا چاہتا ہے؟ بات یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ ایک نیا سوال اٹھتا ہے کہ بھارت اور امریکہ (افغانستان میں بیٹھ کر) پاکستان کو سینڈوچ کیوں بنا رہے ہیں؟ ان سب سوالوں کا تفصیلی جواب آغا امیر حسین اس کتاب میں دیتے ہیں۔ وہ پاکستان کے ایک حساس شہری کی حیثیت سے افق پہ لہراتے ان سوالیہ نشانوں کو دیکھتے اور اپنے ہم وطنوں کو دکھانا چاہتے ہیں۔

بھارت اور امریکہ

پاکستان کے دوست

یا دشمن

آغا امیر حسین

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں
www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ترتیب

بھارت

قائداعظم سے سوال 7
عرضِ سدید 11
پیش لفظ 15
تقسیم کے دن تقسیم کی راتیں 17
جوناگڑھ...... بھارت کا پہلا شکار 35
حیدرآباد دکن...... بھارت کا دوسرا شکار 39
کشمیر...... بھارت کا تیسرا شکار 43
اکھنڈ بھارت 47
جنگ ستمبر 51
مشرقی پاکستان...... چوتھا شکار 61
بھارت کتنا قریب، کتنا دور 67
نہ تم بدلے نہ دل بدلا 99
بالادستی کا بھارتی جنون 105
حملہ ہونے والا ہے 113
بھارت کے بدھی مان 115
زیتون کی ڈالی یا جنگ 121
پاک بھارت مذاکرات، ایک نیا منظرنامہ 127
مذاکرات ایک ٹریپ 133
پردے کے پیچھے کیا ہے؟ 141
کیا یہ ممکن ہے 147
وہی ڈھاک کے تین پات 153

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سوالیہ نشان؟ 159

چار دن چوٹالہ کی قید میں 165

تین دن چوٹالہ کے ساتھ 183

پاک بھارت تعلقات 197

بھارت کیا چاہتا ہے؟ 199

امریکہ

امریکی لابی کی پاکستان دشمنی 207

پاکستان توڑنے کا امریکہ منصوبہ 217

پس چہ باید کرد 227

امریکی پلان پر عملدرآمد 235

نیشنل میزائل ڈیفنس پروگرام 243

امریکہ کو سوچنا چاہیے 251

نئی صورت حال 257

انتھراکس کا ڈرامہ 263

سمندر پار پاکستانی 269

ایشیا میں امریکی مفادات 275

نیا استعمار، ہلاکو کے نقش قدم 281

امریکی استعمار آگے بڑھ رہا ہے 287

عمل اور ردعمل 291

لندن بم دھماکے 297

امریکہ بھارت گٹھ جوڑ 303

امریکہ پاگل پن کے راستے پر 309

بھارت

نہ تم بدلے نہ دل بدلا نہ دل کی آرزو بدلی

قائداعظم سے سوال

انگریز دانشور نے قائداعظم سے سوال کیا۔

جب آپ کہتے ہیں کہ آپ مسلمان الگ قوم ہیں تو کیا آپ مذہب کے معنوں میں سوچ رہے ہوتے ہیں۔؟

اس پر بابائے قوم نے فرمایا۔

"جزواً کاملاً ہرگز نہیں۔ آپ یہ حقیقت کبھی نظرانداز نہ کریں کہ اسلام صرف نظام عبادت کا نام نہیں، یہ تو ایک ایسا دین ہے جو اپنے پیروکاروں کی زندگی کا ایک حقیقت پسندانہ اور عملی نظام حیات دیتا ہے، میں زندگی کے معنوں میں سوچ رہا ہوں، میں زندگی کی ہر اہم چیز کے معنوں میں سوچ رہا ہوں، ان تمام شعبوں میں ہمارا نقطہ نظر نہ صرف ہندوؤں کی زندگی میں ایسی کوئی چیز نہیں جو ہمیں بنیادی طور پر ہم رشتہ کر سکے۔ ہمارے نام، ہمارے لباس اور ہماری خوراک ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ہماری اقتصادی زندگی' ہمارے تعلیمی تصورات' جانوروں تک کے بارے میں ہمارا نقطہ نظر مختلف ہے۔ ہم زندگی کے ہر مقام پر ایک دوسرے کو چیلنج کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر گائے کا ابدی مسئلہ۔ ہم گائے کو کھاتے ہیں وہ اس کی عبادت کرتے ہیں۔ گزشتہ ایک ہزار سال سے یہ اختلافات جوں کے توں موجود ہیں۔ انگریز کی سامراجی سنگینوں سے بھی یہ اختلافات نہ مٹ سکے اور یورپ کے روشن خیال' لبرل اور سیکولر تصورات بھی برصغیر میں برپا تہذیبی تصادم کو نہ مٹا سکے۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پاکستان اور بھارت کے مظلوم عوام کے نام

جو آج تک آزادی کے ثمرات سے محروم ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

عرضِ سدید

آغا امیر حسین کا ادبی اور معلوماتی ماہنامہ ''سپوتنک'' ملتا ہے تو مجھے آزادی سے قبل کے دو صحافی دین دیال بھائیہ اور دھرم ویر یاد آتے ہیں جو لاہور سے اس دور کا ایک مقبول ترین فلمی پرچہ نکالتے تھے، لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اس فلمی پرچے کا اداریہ ہمیشہ سیاسی نوعیت کا ہوتا اور اس میں مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کی مخالفت کی جاتی تھی۔ کانگریس اور اکھنڈ بھارت کی زبردست حمایت کی جاتی تھی، میں نے ادب میں داخل ہونے کی کوشش کی تو دین دیال بھائیہ اور دھرم ویر نے میری انگلی پکڑی اور میرے افسانے اپنے فلمی پرچے میں نمایاں طور پر شائع کر کے میرے کچے پکے ذوق کی تربیت اور شہرت کی خواہش کو تسکین دینے میں معاونت کی، میں 17 ریلوے روڈ لاہور پر واقع اس رسالے کے دفتر میں اپنا افسانہ دینے کے لیے جاتا تو بھائیہ صاحب کو کانگریسی نیتاؤں کے ساتھ مصروف گفتگو دیکھتا اور بعض اوقات تو یوں لگتا، کہ انہوں نے دفتر کو میدانِ جنگ بنا رکھا ہے اور مسلم لیگ ی تحریک پاکستان کو ناکام بنانے کے منصوبے زیر بحث ہیں۔ ایک دن بھائیہ صاحب اکیلے ملے تو میں نے سوال کیا'' آپ کا پرچہ تو خالص فلمی ہے لیکن اس کا اداریہ سیاسی کیوں ہوتا ہے؟ بھائی صاحب سن کر مسکرائے اور بولے''سیاست میرا عشق ہے اور فلمی صحافت میرا پیشہ ہے۔ میں اپنے مقبول فلمی پرچے کے ذریعے اپنے سیاسی خیالات ہندوستان کے عوام تک پہنچاتا اور آل انڈیا کانگریس کے مقاصد کی ترجمانی کرتا ہوں۔'' یہ واقعہ جب کبھی یاد آتا ہے تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ آزادی سے قبل کے ہندوستانی صحافی اپنے سیاسی تصورات کے فروغ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں کتنی دلچسپی لیتے اور کس قدر راسخ العقیدہ تھے کہ پاکستان کے خلاف دشمنی کا جو بیج آزادی سے قبل انہوں نے ''ہندو جاتی'' کے دل میں بویا تھا، اس کی آبیاری اب تک کر رہے ہیں۔

دین دیال بھائیہ اور دھرم ویر کا یہ واقعہ ضمنی ہے لیکن ''سپوتنک'' جیسے بلحاظ قیمت ارزاں ادبی پرچے میں جب سرآغاز آغا امیر حسین کے اداریے پڑھتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ ادب کی اشاعت سے ان کا مقصد یقیناً انسانی جذبات کی تقلیب ہے لیکن وہ سیاست کے عمل سے بھی غافل نہیں جو قائداعظم محمد علی جناح کی وفات کے بعد سول اور فوجی قبضے میں چلی گئی اور قوم کو ارتقاء کا اگلا جمہوری قدم اٹھانے کی بجائے شخصی حکمرانی کے آزار میں مبتلا کرنے لگی، چنانچہ مجھے بہت کم قیمت پر ماہنامہ ''سپوتنک'' کی اشاعت سے آغا امیر حسین کا ایک مقصد یہ بھی نظر آتا ہے کہ وہ قبل از آزادی کے متذکرہ دو ہندو صحافیوں کی طرح عوام میں ایسے سیاسی موضوعات پر مباحثے جاری کرنے کے آرزومند ہیں جو فوجی حکومتوں کے پابند دور میں فکر و نظر کے ایسے گوشوں کو سامنے لا سکیں جن سے پاکستان کی فلاح کی راہ ہموار ہو اور ان مقاصد کی تکمیل ہو جن کے لیے زمین کا یہ ٹکڑا ہندوستان کے جغرافیے سے کاٹ کر حاصل کیا گیا تھا۔

۳۹ مضامین پر مشتمل اس کتاب میں ماضی اور حال کے بھارتی نیتاؤں کے سیاسی تصورات کو' جوان کی راسخ ''ہندوازم'' اور ''اکھنڈ بھارت'' کی دیرینہ آرزو میں لپٹے ہوئے ہیں، ایک ایسے پاکستانی تجزیہ نگار کی نظر سے دیکھنے کی کاوش کی گئی ہے جو تقسیمِ ہند کو ایک تاریخی واقعہ قرار دیتا ہے اور ہندو سیاستدانوں کے رویے کے برعکس دونوں خطوں کے عوام کا خیر خواہ اور ان کی ترقی کا آرزومند ہے۔ لیکن وہ اس المیے پر کفِ افسوس ملے بغیر نہیں رہ سکتے کہ لاٹھی چارج اور آنسو گیس سے مسلمانوں کو منتشر کرتے کرتے اور تین جنگوں کے ہولناک لیکن غیر فیصلہ کن عمل سے گزرنے اور کشمیر کو آتش فشانی کے عمل سے دوچار کرنے کے بعد بھارت نے خود کو ایٹمی طاقت بنا لیا لیکن یہ امن کا نہیں بلکہ تباہی کا عمل ہے۔ آغا امیر حسین نے تجزیہ کیا:

''بھارت اگر طاقت کے زعم میں مبتلا رہے گا۔ خودسری اور برتری کے نشے میں مخمور رہے گا اور ماضی کی طرح زور زبردستی سے اپنی بات منوانا چاہے گا تو پھر کچھ بھی نہیں بچے گا۔

سب کچھ تباہ ہو جائے گا اور اس کی ذمہ داری بھارت کی ہٹ دھرمی اور حق و انصاف سے بے نیازی ہو گی''

یہ فیصلہ کن بات ان مشاہدات کا حاصل ہے جو ان کے مضمون تقسیم کے دن، تقسیم کی راتیں'' میں سامنے آتے ہیں، آغا صاحب کا موقف بڑا واضح ہے:

''بھارتی قائدین نے گزشتہ ۵۶ برسوں میں برصغیر میں نفرتوں کے بیج بو کر جو فصل تیار کی ہے وہ اب کسی وقت کٹنے والی ہے۔ آپ جو بو کر گندم کاٹنے کی توقع کس طرح کر سکتے ہیں، بھارتی قیادت کی منافقت کب تک چلے گی۔ آپ کشمیریوں کو ان کا حق نہ دیں اور پھر بھی ان سے امن و آشتی کی توقع کریں تو یہ احمقانہ توقع بھارتی قیادت ہی کر سکتی ہے اور کشمیر تو ابھی تک تقسیم کے نامکمل ایجنڈے کی تکمیل چاہتا ہے۔''

آغا امیر حسین نے اپنے آنکھوں دیکھے واقعات، زمینی جغرافیے پر سیاحت' عوام اور خواص سے ملاقاتوں اور سیاسی لیڈروں کی باتوں کے تجزیے سے اس کتاب کے مضامین کا خمیر اٹھایا ہے تو ان کے موضوعات متنوع ہیں، انہوں نے خارجی طور پر بھارت اور امریکہ کے گٹھ جوڑ۔ امریکی استعمار کی انسانیت کشی، اعتماد کی بحالی کا مصنوعی ڈرامہ اور پاکستان توڑنے کے امریکی منصوبوں کو بڑی جرأت مندی سے بے نقاب کیا ہے۔ اور مذاکرات کو جو اعتماد اور امن کی بحالی کے علاوہ مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کے لیے پاکستان اور بھارت کے مابین امریکی دباؤ پر کئے جا رہے ہیں'' ایک ٹریپ'' قرار دیا جس میں پاکستان کو پھانسنا اور اس کے آزاد وجود کو ختم کرنا مقصود محسوس ہوتا ہے۔ اہم بات یہ کہ آغا امیر حسین نے خارجی محرکات کے ساتھ داخلی مسائل کو جن میں وزیرستان اور بلوچستان روز بروز ایک بڑا سوالیہ نشان بنتے جا رہے ہیں، بڑی وسعتِ نظر اور حالات کے سیاق و سباق سے پیش کیا ہے اور مشورہ دیا ہے کہ حاکمانہ نخوت کو بالائے طاق رکھ کر اور گولی کی زبان سے اجتناب کر کے مسائل کو سیاسی مذاکرات سے حل کیا جائے اور عوام کو ان کے بنیادی حقوق اور ترقیاتی وسائل کے حصے سے محروم نہ رکھا جائے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آغا امیر حسین کے یہ مضامین ماہنامہ "سپوتنک" میں چھپنے کے بعد قومی اخبارات میں بھی اشاعت پذیر ہوتے رہے ہیں، یہ مضامین ایک وسیع حلقے میں مثبت رائے پیدا کرنے کے علاوہ سوچ کو مہمیز بھی لگاتے رہے ہیں، اگرچہ مضامین کے عنوانات مختلف ہیں اور بحث کے زاویے بھی متنوع ہیں لیکن ان سب میں پاکستان کی بقا و بہبود کی رو یکساں رواں ہے اور معلومات افزائی ان کی اضافی خوبی نظر آتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اب یہ مضامین کتابی صورت میں پڑھے جائیں گے۔ تو تاثرات کی نئی گرہیں کھولیں گے اور پڑھنے والے اپنے نتائج خود مرتب کرنے میں سہولت محسوس کریں گے۔ یہ کتاب محب وطن شہری کی سیاست آشنائی، تجزیاتی صلاحیت اور حب الوطنی کی آئینہ دار ہے۔

لاہور ۳۱ جولائی ۔ ۲۰۰۶ء

انور سدید

پیش لفظ

میرے بہت سے دوست احباب کا کہنا ہے کہ میں بھارت کے ذکر پر برہم ہو جاتا ہوں۔ بھارتی حکمرانوں کی کسی بات کو قابل اعتماد نہیں سمجھتا۔ ان کی ہر بات کو تشکیک سے دیکھتا ہوں۔ کرہ ارض تیزی سے گلوبل ویلج بنتا جا رہا ہے۔ ان حالات میں ساری دنیا کے ممالک اپنی دوستیوں اور دشمنیوں پر نظر ثانی کر رہے ہیں۔ بالخصوص پڑوسی ممالک کے ساتھ کشیدگی اور عدم اعتماد کو ختم کیا جا رہا ہے۔ کوئی بھی ملک آج کی دنیا میں الگ تھلگ نہیں رہ سکتا۔ خود کو مقفل نہیں کر سکتا۔ جدید ترین بین الاقوامی رجحانات کا تقاضا ہے کہ اپنے اردگرد موجود ممالک کے ساتھ تناؤ ختم کر کے امن و آشتی اور افہام و تفہیم کے ساتھ رہا جائے۔ اگر بھارت اور پاکستان کی حکومتیں بھی نئے عالمی تناظر میں ایک دوسرے کے قریب آنا چاہتی ہیں تو یہ اچھی بات ہے یہی وقت کا تقاضا ہے۔ اسے جس قدر جلد سمجھ لیا جائے اور پورا کر لیا جائے بہتر ہے۔

مجھے بھی تسلیم ہے کہ نو آبادیاتی دور کے تقاضے کچھ اور تھے۔ تب بین الاقوامی تعلقات کی ضرورت مختلف تھیں۔ صنعتی دور آیا تو دنیا کی سوچ تبدیل ہوگئی۔ سماجی اور بین الاقوامی ضروریات بدل گئیں۔ پہلی اور پھر دوسری جنگ عظیم نے دنیا کا نقشہ تبدیل کر دیا۔ دنیا دو بلاکس میں تقسیم ہوگئی۔ بین الاقوامی تعلقات اور ضروریات نے نئی شکل اختیار کر لی۔ سوویت یونین کا انہدام ہوا تو دنیا یونی پولر ہوگئی اور بین الاقوامی تعلقات کی نئی ترتیب وجود میں آئی۔ اور اب 9/11 کے بعد تو بین الاقوامی تعلقات کو ایک ایسا رخ ملا ہے جس کا تصور ایک عشرہ پہلے تک کوئی سیاسی پنڈت نہیں کر سکتا تھا۔ حالات بدل چکے ہیں چنانچہ ہمیں بھی اپنی سوچ بدلنا چاہیے۔

احباب کا کہنا ہے کہ بھارت ہمارا پڑوسی ہے۔ ہم اپنا پڑوسی نہیں بدل سکتے۔ ہمیں پڑوسی کے ساتھ ہمیشہ رہنا ہے۔ اگر وہ ہماری طرف دوستی اور صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھاتا ہے تو ہمیں یہ موقع ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ اس میں ہم دونوں ملکوں کی بہتری ہے۔ بھارت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہمارے قریب ہے۔ ہمیں یہ قربت بڑھانی چاہئے۔ نئے دور میں نئے تقاضوں کے مطابق رہنا چاہئے۔ مجھے ان کے استدلال سے اتفاق ہے لیکن سوال یہ ہے کہ بھارت ہم سے کیا چاہتا ہے۔ کیا وہ دنیا بھر میں۔ مروج عدل وانصاف پر مبنی دوطرفہ تعلقات کا خواہاں ہے؟ کیا وہ ہمیں ایک خودمختار پڑوسی کا احترام دینے پر تیار ہے؟ اس کے لئے ہمیں باہمی تعلقات کے گذشتہ ساٹھ برسوں پر نظر ڈالنا ہوگی۔ دراصل یہ پون صدی کا قصہ ہے دوچار برس کی بات نہیں۔ پاکستان اور بھارت دنیا کے دیگر ممالک کی طرح محض پڑوسی نہیں۔ کئی پڑوسی ممالک کا ماضی جنگ وجدل سے بھرپور تھا۔ لیکن پھر وہ دوستی کے بندھن میں بندھ گئے۔ ماضی کو بھول گئے۔ وہاں صورت حال نہایت مختلف ہے۔ کسی دانشمند کا کہنا ہے کہ آپ مستقبل کا صرف تصور کر سکتے ہیں۔ لیکن ماضی کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ بھارت کے معاملے میں جب تک ہم ماضی کو اچھی طرح نہیں سمجھیں گے۔ مستقبل کا تصور نہیں کر سکتے۔

بھارت کے لئے میرے ذہنی تحفظات اور خدشات جذباتیت نہیں، میری سوچی سمجھی رائے ہے۔ اس کا اظہار میں ماہنامہ سپوتنک کے شذرات میں کرتا رہتا ہوں۔ زیرنظر کتاب انہی شذرات کا مجموعہ ہے۔ انہیں پڑھنے کے بعد آپ کو بھی اندازہ ہوجائے گا کہ بھارت پاکستان کے کتنا قریب اور کتنا دور ہے۔

اس کتاب میں کچھ مضامین امریکہ کے بارے میں ہیں۔ یہ امریکہ کی مفاد پرستی اور امریکہ بھارت گٹھ جوڑ کے حوالے سے ہیں۔ کچھ مضامین اپنی قومی سیاست کے حوالے سے ہیں۔ تو کچھ دیگر ممالک یا موضوعات پر لیکن آپ دیکھیں گے کہ کسی نہ کسی طرح بھارت کا حوالہ ضرور بنتا ہے۔ چنانچہ یہ سب ایک ہی عنوان رکھتے ہیں۔ اور ایک ہی مجموعہ میں شامل کئے گئے ہیں۔

اکتوبر 2006ء

آغا امیر حسین

تقسیم کے دن، تقسیم کی راتیں

جس وقت ہوش سنبھالا، اپنے اردگرد ایک ہی شور تھا۔ آزادی، آزادی، آزادی...... ان دنوں پورے برصغیر میں سیاسی وغیرسیاسی، مذہبی وغیرمذہبی، پڑھے لکھے اور ان پڑھ...... سب کا یہی موضوع تھا۔ ہندو جے ہند، جے ہند کے نعرے لگاتے تھے تو مسلمان بن کے رہے گا پاکستان، لے کے رہیں گے پاکستان...... ہندو اس کے جواب میں جے ماتا کی اور اکھنڈ بھارت کی حمایت میں نعرہ زنی کرتے۔ مسلمان اللہ اکبر اور نعرۂ حیدری بلند کرتے۔

میں ابھی دس برس کا تھا لیکن ہندو اور مسلمان کی تقسیم بُری طرح محسوس کرتا تھا۔ ہندو اور مسلمان ایک ہی ملک میں رہتے ہوئے ایک دوسرے سے الگ تھے۔ عموماً حالات کشیدہ ہوجاتے اور ایک دوسرے سے دست وگریباں بھی ہوجاتے۔ چاقو گھونپنے کی وارداتیں ایک معمول تھیں۔ ہم لوگ دلی میں رہتے تھے۔ دلی جیسے بڑے شہر میں سوائے نئی دہلی کے، باقی سارے شہر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی آبادیاں الگ الگ اور زیادہ تر آمنے سامنے تھیں۔ میں 1946ء کے دنوں کا ذکر کررہا ہوں۔ ان دنوں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان کشیدگی عروج پر تھی۔ شہر کی مختلف گلیوں اور محلوں میں حملوں کے خوف اور اچانک حملوں سے بچاؤ کیلئے جنگلے لگ چکے تھے۔ اس داخلی کشیدگی اور ایک دوسرے سے نفرت کے باوجود مشترکہ دشمن یعنی انگریز کے خلاف سب ایک تھے۔

ایک روز چاندنی چوک کے قریب مسجد فتح پوری سے پہاڑ گنج کی طرف جانے والی سڑک پر ایک احتجاجی جلوس کو منتشر کرنے کیلئے پولیس نے لاٹھی چارج اور آنسو گیس کا استعمال کیا۔ میں بھی اس جلوس میں شامل تھا۔ آنسو گیس کی وجہ سے میں بے ہوش ہوگیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک ہندو گھرانے میں پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ ایک خاتون میری دیکھ بھال کررہی تھی۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر اس نے کسی کو آواز دی اور مجھے پینے کیلئے پانی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دیا۔ میں بہت حیران ہوا۔ دراصل مسلمانوں کیلئے ہندوؤں کے رویہ میں نہایت شدت اور زبردست تعصب پایا جاتا تھا اور ابھی چند روز پہلے مجھے اس کا ایک تلخ تجربہ ہو چکا تھا۔

ہم لوگ دلی کے محلہ عزیز گنج میں رہتے تھے۔ میرے والد نے مجھے سکول کی چھٹیوں کے دوران ایک ہندو الیکٹریشن لکشمن کے پاس بجلی کا کام سیکھنے کیلئے اسکی شاگردی میں دیا ہوا تھا۔ اس کی دکان ہمارے محلہ کے سامنے اور باڑہ ہندو راؤ کے قریب ایک ہندو محلہ میں تھی۔ کام سیکھنے کا جنون مجھے ذاتی طور پر تھا۔ ان دنوں کام زیادہ تھا چنانچہ میرا زیادہ وقت وہاں "آرمیچر وائنڈنگ" میں گزرتا تھا۔ کھانا گھر سے آجاتا تھا۔ ایک روز کھانا کھانے کے بعد میں نے ہڈیاں دکان کے باہر سڑک پر پھینک دیں۔ کچھ دیر بعد ایک شخص دکان میں آیا اور اس نے لکشمن کے کان میں کچھ کہا۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھا اور مجھے اپنے ساتھ بلڈنگ کے اندر آنے کو کہا۔ بلڈنگ کے اندر صحن میں بنے کنوئیں میں اُترتے ہوئے اس نے مجھے بھی نیچے آنے کا اشارہ کیا۔ میں سمجھا کہ اس کنوئیں میں لگی موٹر خراب ہوگئی ہے اور اسے اتارنا یا وہیں ٹھیک کرنا ہے۔ پانی کی سطح سے ذرا اوپر ایک طرف ایک بڑا سا طاق بنا تھا۔ اسی میں موٹر لگی ہوئی تھی۔ کچھ جگہ خالی بھی تھی۔ لکشمن نے مجھے کہا کہ یہاں طاق میں خاموشی سے بیٹھ جاؤ اور کوئی آواز نہ نکالنا۔ جب تک میں نہ آؤں باہر نہ نکلنا۔ یہ کہہ کر وہ تیزی سے اوپر چڑھ گیا۔ میں حیران پریشان موٹر کے ساتھ دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد زبردست نعرے بازی کی آوازیں آنا شروع ہوگئیں۔ نعرے تو میری سمجھ میں نہیں آرہے تھے لیکن موسلے کو نکالو۔ زندہ نہیں چھوڑیں گے جیسی باتیں البتہ سمجھ میں آرہی تھیں۔ لکشمن کی تو تکار اور بحث کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ مجھے اس بات کا اندازہ تو ہوگیا کہ یہ شور شرابہ میری وجہ سے ہے لیکن کیوں ہے؟ اس کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد خاموشی چھا گئی۔ دو تین گھنٹے بعد جب میں خوف اور تھکن سے نڈھال غنودگی کی حالت میں تھا تو لکشمن کنوئیں میں آیا اور مجھے واپس اوپر لے گیا۔ شام ہو رہی تھی۔ وہ مجھے ہمارے محلے کے دروازے تک پہنچا کر واپس چلا گیا۔ میں دوڑ کر اپنے گھر پہنچ گیا۔ میرے والد اور دوسرے لوگوں نے مجھ سے تفصیلات جاننا چاہیں لیکن مجھے کچھ معلوم نہ تھا۔ دوسرے دن پتہ

چلا کہ میں نے ہڈیاں سڑک پر پھینکی تھیں جس پر علاقے کے ہندو مشتعل ہو گئے تھے۔ اس واقعہ نے پورے علاقے میں کشیدگی پھیلا دی۔ کئی دن تناؤ رہا۔

اس پس منظر میں جب آنسو گیس سے بے ہوش ہونے کے بعد مجھے ایک ہندو گھرانے نے سنبھالا تو میرے لئے حیرت کی بات تھی۔ ظاہر ہے اچھے بُرے لوگ ہر جگہ پائے جاتے ہیں لیکن اس زمانے میں ہندو پانی، مسلم پانی، ہندو ہوٹل، مسلمان ہوٹل، ہندو حجام مسلمان حجام کی تقسیم پورے ملک میں پائی جاتی تھی۔ بہت کم لوگ ایسے تھے جو ان تعصبات سے بالاتر ہو کر زندگی گزار رہے تھے۔ میں ہوش سنبھال رہا تھا۔ شعور کی آنکھ کھل رہی تھی۔ اپنے ماحول اور شہر کی فضا کو سمجھنے لگا تھا۔ اسی تقسیم کی کوکھ سے پاکستان کے مطالبہ نے جنم لیا تھا اور یہی تقسیم اور تعصب بعد میں بہت بڑے خون خرابے اور انتقال آبادی کا سبب بنی تھی۔ لاکھوں انسان اس تعصب، درندگی کا شکار ہوئے اور برصغیر کا جسم اور روح ہمیشہ ہمیشہ کیلئے زخمی ہو گئے۔

آج 56 سال بعد بھی جب مجھے اپنا بچپن یاد آتا ہے تو دلّی کی تلخ ترش اور شیریں دونوں طرح کی یادیں مجھے اپنے حصار میں لے لیتی ہیں۔ ہندو اکثریت کا تنگ نظر اور متعصبانہ رویہ مجھے آج بھی بدمزہ کر دیتا ہے۔ گزشتہ نصف صدی میں مجھے تین چار بار "بھارت یاترا" کا موقع ملا ہے۔ مجھے ہر دفعہ یہ دیکھ کر کوفت ہوئی کہ سیکولرازم کے داعی اور جمہوریت کے علمبردار بھارت میں ہر دفعہ پہلے سے زیادہ غربت اور پہلے سے زیادہ نفرت دیکھنے میں آتی ہے۔ یہ نفرت اور تعصب صرف مسلمانوں کیلئے ہی نہیں بلکہ عیسائیوں، سکھوں اور نچلی ذات کے ہندوؤں کیلئے بھی پوری شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ (میں حال ہی میں یعنی جون 04ء میں بھارت پنجاب اور دہلی میں چند روز گزار کر آیا ہوں۔ اس کی روداد گذشتہ ماہ کے سپوتنک اور روزنامہ خبریں میں شائع ہو چکی ہے لیکن یہ تحریر اس سے پہلے کی ہے) اصل نشانہ مسلمان ہیں جن کا تشخص مٹانے کی کوشش میں نت نئی راہیں نکالی جاتی ہیں۔ روزگار کا حصول ان کیلئے عذاب بن چکا ہے۔ وہ تمام آبادیاں جن میں مسلمان رہتے ہیں۔ ان کی پہچان ہی یہ ہے کہ وہ پسماندہ ترین علاقے ہیں۔ ان لوگوں کیلئے تعلیم،

www.iqbalkalmati.blogspot.com

صحت اور ترقی کے دروازے بند ہیں۔ ان کا جرم سیکولر بھارت میں مسلمان ہونا ہے۔ آج بھی فسادات ہوتے ہیں اور فرق یہ پڑا ہے کہ اب یہ زیادہ منظم ہوتے ہیں اور مسلح بلوائیوں کی پشت پناہی پولیس اور پیرا ملٹری فورسز کرتی ہیں۔ مرتے بھی مسلمان ہیں اور گرفتاریاں بھی مسلمانوں کی ہوتی ہیں۔

مجھے بے شمار مسلمان نوجوانوں نے بتایا کہ ان کے سامنے کوئی راستہ نہیں۔ سوائے اس کے کہ یا تو وہ ہندو بن جائیں یا پھر اپنے تشخص اور اپنی بقا کیلئے منظم تحریک چلائیں جیسی کہ کشمیر میں چل رہی ہے۔ 56 سال بعد بھی برصغیر آگ اور خون کی لپیٹ میں ہے۔ اب تلواروں، خنجروں، بموں اور دیسی بندوقوں کے ساتھ ساتھ جدید اسلحہ بھی لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ احمد آباد اور گجرات کے دوسرے علاقوں میں مسلمانوں کے قتل عام اور نسل کشی کا منظر ساری دُنیا نے دیکھا ہے۔ پورے بھارت میں مسلمانوں پہ ٹوٹ پڑنے کیلئے ہندو انتہا پسند تنظیمیں ہروقت تیار رہتی ہیں۔ بھارت کے ایٹمی دھماکوں کے بعد چونکہ پاکستان نے بھی اپنے ایٹمی طاقت ہونے کا ثبوت دے دیا ہے چنانچہ برصغیر میں بھارت کی ایٹمی بالادستی قائم نہ ہونے کا غصہ بھی بھارت کے مسلمانوں پہ نکالا جارہا ہے۔ بین الاقوامی سطح پر جہاں کہیں بھارت کو زک اُٹھانا پڑتی ہے۔ ردعمل میں بھارت کا مسلمان مارا جاتا ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف اور اظہار حال ہی میں سرکاری سطح پر ہوا ہے۔

عراق میں بھارتی باشندے اغوا ہوئے اور بھارت سرکار نے قطر میں اپنے مسلمان سفیر کو ان مغویوں کی بازیابی کیلئے بغداد بھجوایا تو برسراقتدار کانگریس کے رہنماؤں نے ملک بھر سے اپیل کی کہ مسلمان شہریوں سے کوئی ناروا سلوک نہ کیا جائے تاکہ عراق میں مغویوں کی بازیابی میں کوئی مشکل نہ پیش آئے۔ یہ سیکولر بھارت میں مسلمان شہریوں کے ہر وقت خطرے کی حالت میں رہنے کا برملا اعتراف ہے۔ سرکاری و غیر سرکاری ذرائع ابلاغ پہ "ہندوتا" (ہندو، ہندی اور ہندوستان) کی بات پورے زور شور سے کی جاتی ہے۔ گویا اس ملک میں اگر کسی کو رہنا ہے تو صرف ہندو بن کر رہ سکتا ہے۔ یہ بال ٹھاکرے ذہنیت اکھنڈ بھارت کے نعرے کے ساتھ پہلے بھی تقسیم کا سبب بنی تھی اور اب پھر بھارتی سماج کی

دراڑیں گہری کر رہی ہے۔

آج ہندوستان کی تمام ریاستوں میں علاقائی جماعتیں برسراقتدار ہیں۔ کوئی قومی جماعت تشکیل نہیں پا سکی۔ کانگریس کو ایک زمانے میں قومی جماعت ہونے کا دعویٰ تھا لیکن اب وہ وسیع تر اور ملک گیر مقبولیت سے محروم ہے۔ واجپائی سرکار درجنوں جماعت کا اکٹھ تھی۔ ان کی قدرِ مشترک پاکستان دشمنی تھی۔ مسلمانوں سے ازلی ابدی بیر رکھنے والی جماعتیں اس میں پیش پیش تھیں۔ انتخابات جیتنے کیلئے واجپائی سرکار نے پاکستان سے دوستی کا ناٹک بھی رچایا۔ پاکستان سے دوستی کے نام پر وہ مسلمانوں کا فیصلہ کن ووٹ حاصل کرنا چاہتی تھی۔ لیکن بات نہ بن سکی۔

گذشتہ چھپن برسوں میں بھارت کی ہر حکومت نے پاکستان دشمنی کو اپنا نصب العین رکھا ہے۔ سری نگر سے لیکر راس کماری تک کوئی ناخوشگوار واقعہ ہو جائے اس کا الزام پاکستان کو دیا جاتا ہے۔ پاکستان کو اپنا باجگزار بنانے کیلئے بھارت نے طاقت کی زبان استعمال کی تو جواب میں پاکستان بھی ایٹمی طاقت بن گیا۔ اپنے قیام کے ساتھ ہی پاکستان داخلی اور خارجی خطرات میں گھرا ہوا تھا۔ بھارت نے برصغیر کی تقسیم کو صدق دل سے قبول نہیں کیا تھا چنانچہ پاکستان کی قیادت جائز طور پر ان خدشات میں مبتلا رہی کہ بھارت، پاکستان کو ختم کرنے کے درپے ہے۔ پاکستان نے بھارت کے کسی ممکنہ فوجی حملے کا مقابلہ کرنے اور خطے میں طاقت کا توازن درست رکھنے کیلئے خود کو عسکری اعتبار سے طاقتور بنانے کا فیصلہ کیا اور بھارت کی مسلط کردہ تین جنگوں کے بعد آخری حل کے طور پر خود کو ایٹمی طاقت بنالیا۔ بھارت اگر طاقت کے زعم میں مبتلا رہے گا، خودسری اور برتری کے نشہ میں مخمور رہے گا اور ماضی کی طرح زور زبردستی سے اپنی بات منوانا چاہے گا تو پھر کچھ بھی نہیں بچے گا۔ سب کچھ تباہ ہو جائے گا اور اس کی ذمہ دار بھارت کی ہٹ دھرمی اور حق و انصاف سے بے نیازی ہوگی۔

میں جب ہندو قیادت کا آج کا رویہ دیکھتا ہوں تو مجھے 1946-47 کا ہندوستان یاد آ جاتا ہے۔ جس میں پاکستان کا ذکر سن کر ہندو مہا سبھائیوں کی آنکھوں سے شعلے اور زبانوں سے لفظوں کے کوڑے برسنے لگتے تھے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میرے والد ریلوے میل سروس (پوسٹ آفس) میں ملازم تھے۔ اوران دنوں دلی لاہور جایا کرتے تھے۔ میں ان کے ساتھ ضد کر کے لاہور کی سیر کرنے کیلئے چلا آیا۔ اسکول میں چھٹیاں تھیں۔ ہندوستان کی بعض ریاستوں میں فرقہ وارانہ فسادات ہو رہے تھے۔ دلی شہر میں بھی فضا کشیدہ تھی۔ کسی وقت بھی فساد پھوٹنے کا امکان تھا۔ چنانچہ میرے والد نے مجھے ساتھ لانے میں کسی روک کد کا اظہار نہ کیا۔ لاہور میں والد صاحب نے آر ایم ایس کے ریسٹ ہاؤس قلعہ گوجر سنگھ میں قیام رکھا۔ یہ سفر ان کی آخری ٹرین سروس ثابت ہوا۔ انہیں حکام نے لاہور میں روک لیا اور وہ لاہور اسٹیشن کے باہر بنے ریلوے پوسٹ آفس میں کام کرنے لگے۔

اچانک پورا پنجاب اور دہلی وغیرہ فسادات کی لپیٹ میں آ گئے۔ مشرقی پنجاب سے آنے والی ٹرینوں پر حملے ہونے لگے۔ جو ٹرین بھی لاہور پہنچتی وہ خون میں لت پت ہوتی۔ ان خون آلود ٹرینوں کی آمد نے بھی لاہور کو لہولہان کر دیا۔ کرفیو، فائرنگ، چھرا گھونپنے کی وارداتیں بڑھنے لگیں۔ لاہور میں بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کی آبادیاں آمنے سامنے یا پھر کمیونٹی کے اعتبار سے تھیں۔ ہندو آبادیوں میں مسلمان اور مسلمان آبادیوں میں ہندو نہیں رہتے تھے۔ اندرون شہر شاہ عالمی ہندوؤں کا گڑھ تھا۔ اسی طرح شہر کے باہر کرشن نگر، سنت نگر، گوال منڈی، برانڈرتھ روڈ، نسبت روڈ اور چیمبرلین روڈ ہندوؤں کی آبادیاں تھیں۔ بال روڈ اور انارکلی جیسے تجارتی مراکز بھی ہندوؤں کی گرفت میں تھے۔

لاہور میں مسلمانوں کے تباہ حال قافلے اترنا شروع ہوئے تو لاہور کے ہندو چوکنا ہو گئے۔ انہوں نے آہستہ آہستہ مذکورہ علاقوں سے انخلا شروع کر دیا۔ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں پہ سکھوں اور ہندوں کے مظالم کی خبروں نے لاہور کا پارہ چڑھا دیا۔ زبردست فائرنگ اور نعرہ زن جلوسوں میں کرفیو بے معنی ہو کر رہ گیا۔ لاہور میں پولیس اور فوج میں اکثریت غیر مسلموں کی تھی۔ اس لئے غیر مسلموں کا زیادہ جانی نقصان نہ ہوا۔ صرف وہ لوگ کام آئے جو اپنے مال و متاع، گھربار چھوڑنے کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے۔ شاہ عالمی پہ حملے اور آگ نے لاہور سے ہندوں کے قدم اکھاڑ دیئے۔ وہ پولیس اور گورکھا ڈوگرا رجمنٹوں کی حفاظت

میں پہلے کیمپوں میں اور پھر وہاں سے قافلوں کی صورت میں نقل مکانی کر گئے۔

واہگہ چونکہ قریب تھا اس لئے یہاں سے جانے والے قافلوں کو حملوں کا زیادہ خطرہ نہیں تھا جبکہ مشرقی پنجاب اور دہلی وغیرہ سے آنے والوں کو طویل فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا۔ راستے میں حملہ آوروں کے جتھے ہندو فوج اور پولیس کی سرپرستی میں قتل و غارت گری اور لوٹ مار کر رہے تھے۔ اس لئے مسلمانوں کا جانی اور مالی نقصان ہندوؤں کے برعکس بہت زیادہ تھا۔ چالیس ہزار سے زیادہ مسلمان عورتیں چھین لی گئیں۔ یہ ایک ایسا گھاؤ تھا جو زندہ بچ کر آنے والوں کو سکون سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ انتقام انتقام کی صدائیں گونج رہی تھیں۔ مسلمان عورتوں کی عصمت دری اور بچوں کے وحشیانہ قتل عام کی خبریں مغربی پنجاب میں مسلمانوں کی آتش انتقام کو ہوا دے رہی تھیں۔ شہر پر بربریت راج کر رہی تھی۔

قلعہ گوجر سنگھ سے نکلسن روڈ پہ چلتا ہوا میں روزانہ ریلوے سٹیشن جایا کرتا تھا۔ لاہور سٹیشن پر پہنچنے والی گاڑیاں روزانہ وحشت و بربریت کی نئی کہانیاں لیکر آتیں۔ ایک روز میں نکلسن روڈ کے فٹ پاتھ پر چلا جا رہا تھا کہ تیز رفتاری سے ایک فوجی ٹرک میکلوڈ روڈ کی طرف جاتا ہوا نظر آیا۔ اس ٹرک میں عجیب منظر تھا۔ دو فوجی جوانوں نے اپنے ساتھیوں پر بندوقیں تان رکھی تھیں۔ یہ جوان بلوچ رجمنٹ کے تھے۔ پیچھے کسی مقام پر ہندو ساتھیوں کی طرفداری کے جرم میں گن پوائنٹ پر ہیڈ کوارٹر لے جایا جا رہا تھا۔ لاہور میں یہ شکایت عام تھی کہ ہندو، سکھ اور گورکھا سپاہی جانبداری برتتے اور مقامی ہندوؤں کی حمایت میں بے دریغ گولی چلا دیتے ہیں۔ میں ابھی اس منظر میں گم اپنے خیال میں چلا جا رہا تھا کہ سڑک پار سے ایک گلی کے لوہے کے گیٹ پر کھڑے گورکھا سپاہی نے مجھے پر گولی چلا دی۔ میں یہ سمجھنے سے آج تک قاصر ہوں کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا اور پھر میری عمر بھی اتنی زیادہ نہیں تھی کہ میں کسی ناپسندیدہ سرگرمی میں ملوث ہوتا۔ مجھ سے کسی کو کیا خطرہ ہو سکتا تھا اور پھر میں ان سے کافی فاصلہ پر سڑک کے دوسری طرف فٹ پاتھ پر جا رہا تھا۔ گلیاں خالی تھیں۔ مکین یا تو چلے گئے تھے یا پھر اپنے اپنے گھروں کے دروازے بند کر کے بیٹھے تھے۔ گولی میرے پاؤں کے قریب فٹ پاتھ سے ٹکراتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں تیز تیز قدموں سے سٹیشن پہ جا پہنچا۔

اسٹیشن پہ سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ صبح کا وقت تھا۔ میں ابھی آر ایم ایس کے سامنے پہنچا ہی تھا کہ ایک تانگہ آ کر رکا۔ اس میں کچھ ٹرنک اور ایک بزرگ، ان کی بیوی، دو بیٹے اور ایک جوان بیٹی پر مشتمل ہندو خاندان تھا۔ ابھی وہ تانگے سے اچھی طرح اترنے بھی نہ پائے تھے کہ میرے دیکھتے دیکھتے چند لوگوں نے ان پر حملہ کر دیا۔ بڑھے بڑھیا کی چیخ و پکار کسی کام نہ آئی۔ ایک بیٹا وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دوسرا بھاگتا ہوا میری طرف آیا۔ اس کے پیچھے چند نوجوان تھے۔ وہ گرا تو ان وحشیوں نے ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر اس کا سر کچل دیا۔ یہ سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے چند فٹ کے فاصلہ پر ہوا۔ میں سکتہ کی حالت میں کھڑا دیکھتا رہ گیا۔ یہ 13 اگست کا دن تھا۔ اس کے بعد جو مار دھاڑ شروع ہوئی تو پورے اسٹیشن کے باہر لاشوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ ایک فوجی ٹرک آیا۔ اس کیلئے گزرنے کا راستہ نہ تھا۔ وہ فسادیوں پر فائرنگ کرتا ہوا لاشوں کے اوپر سے گزر گیا۔ خدا خدا کر کے جب یہ فساد تھما اور میں اسٹیشن کے اندر گیا تو وجہ معلوم ہوئی۔ لوگ ہندوستان سے آنے والی ٹرینوں سے اپنے عزیزوں کو لینے کیلئے سٹیشن پر آئے ہوئے تھے لیکن وہاں جو دو ٹرینیں اب تک پہنچی تھیں وہ خون میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ ڈرائیوروں کے علاوہ ان میں کوئی ذی روح نہیں تھا۔ دونوں ٹرینوں کے ڈرائیور بھی زخمی تھے۔ ان ٹرینوں میں سوار سب کے سب مسافر ہندو اور سکھ بلوائیوں نے قتل کر دیئے تھے۔ ٹرینوں کا یہ حال دیکھ کر اسٹیشن پر آنے والے لوگ غم و غصہ میں آگ بگولہ ہو گئے اور پھر اسٹیشن پہ قیامت برپا ہو گئی تھی۔

میں بھی روزانہ اسٹیشن پر اسی توقع میں جاتا تھا کہ شائد آج دلی سے آنے والی کسی ٹرین میں میرے بہن بھائی اور دیگر عزیز آ جائیں۔ میں ہندوستان سے آنے والی ہر ٹرین کو کھنگال ڈالتا کہ شائد کوئی اپنا چہرہ نظر آ جائے لیکن خون میں ڈوبی لاشوں اور زخمی انسانوں کو دیکھ دیکھ کر مایوسی کے ساتھ شام کو گھر چلا جاتا۔ پھر ان مناظر نے مجھے حوصلہ دیا۔ میں ڈبوں میں چڑھ جاتا۔ زخمیوں کو باہر لانے میں مدد دیتا۔ اب مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ ٹائیلٹ میں لوگ زخمی اور مردہ حالت میں ہوتے ہیں۔ میں ایک ایک بوگی کے ٹائیلٹ تک پہنچتا، وہاں

موجود زخمیوں کو باہر نکلنے میں مدد دیتا یا رضا کاروں کو بلا کر ان کی مدد کرتا۔ تھک کر چور ہو جاتا تھا۔ کھانے پینے کو اس ماحول میں کیا جی چاہتا۔ زخمیوں اور لاشوں کو دیکھ دیکھ کر آنکھیں پتھرا جاتیں۔

کئی روز تک یہی معمول جاری رہا۔ ہندوستان سے آنے والی ٹرینوں میں لاشیں ڈھونڈتے اور رضا کاروں کے ساتھ مل کر انہیں پلیٹ فارم پر لانے میں دن گزر جاتا۔ دن میں کئی ٹرینیں آتی تھیں۔ شام ہو جاتی تو قلعہ گوجر سنگھ کے ہوسٹل میں آ جاتا۔ پریشانی، انتظار اور شدت غم کے باوجود تھکن کی وجہ سے بہر حال نیند آ جاتی۔ عام حالات میں بھی گھر والوں سے اتنے دن دور رہنا مشکل ہوتا ہے لیکن اب تو صورت حال بھی غیر یقینی اور اذیت ناک تھی۔ رات کو عجیب و غریب خیالات میں ڈوبا سو جاتا۔ صبح نئی فکر اور اندیشوں کے ساتھ بیدار ہوتا۔ پھر اسی آس میں اسٹیشن کا رُخ کرتا کہ شاید آج اپنے گھر والے آ جائیں۔ میں تو سیر و تفریح کیلئے دلی سے لاہور آیا تھا لیکن لاہور میرے لئے ایک ایسا زندان بن جائیگا جس میں واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہو گا یہ بات میرے تصور میں بھی نہیں تھی۔ والد صاحب روزانہ تسلی دیتے کہ کل گھر والے آ جائیں گے یا ان سے رابطہ ہو جائے گا اور میں اگلی صبح کے انتظار میں بستر پر دراز ہو جاتا اور اگلے دن اسٹیشن پہ پہنچ جاتا۔

اسٹیشنوں پہ بوگیوں تک لانے لے جانے کیلئے ٹھیلے اور ٹرالیاں ہوتی ہیں۔ ان دنوں ان کے پہیئے لوہے کے ہوا کرتے تھے۔ آجکل ربڑ کے ٹائر ہوتے ہیں۔ ان ٹھیلوں میں سامان کی طرح ایک دوسرے کے اوپر لاشیں لوڈ کر دی جاتیں۔ پھر انہیں اسٹیشن سے باہر لا کر وہاں کھڑے گڈوں پر لاد دیا جاتا اور یہ گڈ ان لاشوں کو اجتماعی قبروں میں تدفین کیلئے لے جاتے۔ باقاعدہ تدفین و تکفین بھی قسمت والوں کو ملتی ہے۔ 1947ء کا اگست میرے لئے ایک بھیانک خواب ہے جو اب بھی مجھے بعض اوقات نیند سے جگا دیتا ہے۔ آج بھی خواب میں زخمیوں کی آہ و بکا اور لاشوں سے بھرے ٹھیلوں کی چنگاڑیں سنتا سنتا ہڑبڑا کر بیدار ہو جاتا ہوں۔

ایک روز میں حسب معمول آنے والی ٹرین کے انتظار میں آر ایم ایس کے سامنے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کھڑا تھا کہ ایک ٹرین پشاور کی طرف سے آئی جس پر ریلوے اسٹیشن کے اندر حملہ ہو گیا۔ ادھر سے آنے والی ٹرینوں کو کرفیو لگا کر کھڑا کیا جاتا تھا۔ لیکن افراتفری اور نفسانفسی کے اس دور میں انسانی قوانین اور انسانیت سب دم توڑ چکے تھے۔ ٹرین آئی تو درندگی کا آتش فشاں پھٹ پڑا۔ اس ٹرین میں سے کچھ سکھ مسافر جان بچا کر اس طرف دوڑے چلے آ رہے تھے جہاں میں کھڑا تھا۔ اچانک پولیس نے گولی چلا دی۔ 3 Not 3 کی گولی ایک سکھ کی پشت پر لگی اور سینہ پھاڑتی ہوئی باہر نکل گئی۔ یہ بدقسمت سکھ میرے پیروں کے قریب آ کر گرا۔ سینے میں چھ انچ قطر کا گھاؤ تھا۔ لمحے بھر میں اس کی جان نکل گئی۔ میں جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔ پاؤں جیسے زمین میں گڑ گئے تھے۔ یہ روح فرسا منظر میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ تھوڑی دیر بعد لاشیں ڈھونے کا عمل شروع ہو گیا۔ دہلی سے آنے والی ٹرینوں میں سے لاشیں نکال کر اب دہلی جانے والی ٹرینوں میں لاشیں لادی جانے لگیں۔ گویا جواب آں غزل کے طور پر ایک نیا معمول شروع ہو گیا۔

اب میں وقفے وقفے سے اپنے بہن بھائیوں کیلئے رہنے کا ٹھکانا ڈھونڈنے کا فریضہ بھی سرانجام دے رہا تھا۔ یہ فریضہ میں نے از خود سنبھال لیا تھا۔ والد صاحب کو اس کی خبر نہیں تھی۔ دراصل بابائے قوم قائداعظم اپنی تقریر میں کہہ چکے تھے کہ مہاجرین کو جو خالی مکان نظر آئے وہ اس کا تالہ کھولیں اور اس میں رہنا شروع کر دیں۔

بھارت سے لاکھوں مہاجرین کا سیلاب اُمڈا چلا آ رہا تھا۔ اس کو جذب کرنے کا حکومت کے پاس یہی ایک طریقہ تھا۔ حکومت نے آنے والے مہاجرین کیلئے جو کیمپ بنائے تھے ان میں والٹن کیمپ ہی وسیع و عریض تھا۔ لیکن وہ بھی ناکافی ثابت ہو رہا تھا۔ اسی وجہ سے قائداعظم نے بھارت کو نقل مکانی کر جانے والے لوگوں کے خالی مکانات مہاجرین کے تصرف میں لانے کا حکم دیا تھا۔ ایک روز میں نے نکلسن روڈ پہ جہاں سے میں روزانہ ریلوے سٹیشن آتا جاتا تھا۔ ایک دو منزلہ خالی مکان دیکھا۔ مجھے اچھا لگا۔ میں تالہ توڑ کر اس پر قابض ہو گیا اور والد صاحب کا انتظار کرنے لگا۔ انہوں نے اسی سڑک پر سے گزرنا تھا۔ ساڑھے چار بجے کے قریب وہ مجھے نظر آئے۔ میں نے دوڑ کر ان کا راستہ روکا اور بتایا کہ

میں نے ایک بہت اچھے مکان پر قبضہ کر لیا ہے۔ آئیں آپ بھی اسے دیکھ لیں۔ ان کے چہرے پر ناگواری ابھری اور انہوں نے پوچھا کہ میں نے ایسا کیوں کیا ہے۔

میں نے قائداعظم کی تقریر کا حوالہ دیا۔ والد صاحب غصہ میں آگ بگولا ہو گئے اور ایک زبردست تھپڑ رسید کرتے ہوئے انہوں نے مجھے کہا۔ ہم مہاجر ہوئے ہیں لٹیرے نہیں بنے۔ ہمیں اللہ تعالیٰ نے ملک دیا ہے ہم اسے کچھ دیں گے۔ لیں گے نہیں۔ اسے ترقی دینا ہے۔ ہمیشہ اس کیلئے کام کرنا ہے اس سے کچھ لینا نہیں ہے۔

میں نے بہت اصرار کیا کہ یہ کوئی غیر قانونی کام نہیں۔ قائداعظم نے اس بات کی اجازت دی ہے۔ مہاجرین بہت زیادہ ہیں۔ جب والدہ اور بہن بھائی آئیں گے تو پھر کوئی ٹھکانہ ڈھونڈنے میں مشکل ہو گی۔ ان کے آنے سے پہلے ہی انتظام کر لینا چاہیے مگر والد صاحب مان ہی نہیں رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کسی کے مال پر قبضہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ سب کی قسمت ان کے ساتھ ہوتی ہے۔ محنت کر و حق حلال کی کمائی سے کھانے پینے اور چار دیواری حاصل کرنے کی عادت ڈالو۔ چنانچہ مجھے اس مکان سے دستبردار ہونا پڑا۔ اگست کا پورا مہینہ گھر والوں کے انتظار میں گزر گیا۔ دلی سے آنے والے کچھ لوگوں سے پتہ چلا کہ وہ دہلی کے پرانے قلعہ والے کیمپ میں ہیں۔ ان کی سرتوڑ کوشش کے باوجود انہیں پاکستان آنے کی اجازت نہیں مل رہی تھی۔

ستمبر 47ء میں راستے نسبتاً محفوظ ہو گئے تو وہ لوگ لاہور پہنچے۔ اب مکان کی تلاش شروع ہوئی۔ کرائے کے مکان کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ خالی مکانات بھر چکے تھے۔ امرتسر اور گرد و نواح کے لوگوں نے گوالمنڈی اور نسبت روڈ پر قبضہ جما لیا تھا۔ صاحب حیثیت لوگوں نے ماڈل ٹاؤن فتح کر لیا تھا۔ یوں ہر علاقے میں مقامی یا مہاجر جس کو موقع ملا اس نے کوئی نہ کوئی عمارت اپنے قبضہ میں لے لی اور پھر جب محکمہ ”بحالیات“ قائم ہوا تو تمام قبضے الاٹ منٹوں کے ذریعے باضابطہ کر دیئے گئے۔ ہمارے والد بھی بالآخر کوئی مکان الاٹ کروانے پر راضی ہو گئے اور انہیں شاہ عالمی میں وچھو والی گلی میں ایک پرانا مکان الاٹ ہو گیا۔ جب اس دو منزلہ مکان میں پہنچے تو اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ ہر وقت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دھڑکا لگا رہتا تھا کہ نہ جانے کس وقت یہ زمیں بوس ہو جائے۔ بہر حال سر چھپانے کو ایک چھت مل گئی تھی۔ سو رہنا شروع کر دیا۔ میرے حصہ میں نیچے کی منزل تھی جس میں دو کمرے تھے۔ سردیاں شروع ہو چکی تھیں۔ گرم کپڑا، لحاف یا سوئیٹر جیسی کوئی چیز سردی سے بچنے کیلئے نہیں تھی۔ ان دنوں کڑاکے کی سردی ہوا کرتی تھی۔ زبردست ٹھنڈ میں ساری ساری رات آگ جلا کر اور سرسوں کا تیل جسم پر مل کر جاگتے گزرتی۔ صبح چار بجے روزی کی تلاش میں نکل جاتا۔

میں ہاکر بن چکا تھا۔ اخبار بیچنے اور تقسیم کرنے کی وجہ سے میں لاہور کی گلیوں اور سڑکوں سے واقف ہوتا جا رہا تھا۔ ہر گلی محلہ میں لوگوں کا جائزہ لینے کا بھی موقع ملتا۔ میں نے دیکھا کہ جو لوگ جدی پشتی غربت کے اسیر تھے اور ان کے خدوخال، شکل وصورت اور طور اطوار خاندانی پس منظر کی چغلی کھا رہے تھے انہوں نے عالی شان مکانوں پر قبضہ کر لیا اور چھتوں پر سے گزر کر خالی مکانوں میں جا اترے اور سامان اپنے گھروں میں منتقل کر لیا تھا۔ ان لوگوں کے برعکس جو صاحب حیثیت اور نیک طبع لوگ اپنا سب کچھ ہندوستان میں چھوڑ کر یہاں آئے تھے وہ قانون قاعدے اور ضابطوں کے چکر میں پڑے رہے اور مسلسل ذلیل وخوار ہوئے۔ انقلاب اسی کو کہتے ہیں۔

گھر اور کاروباری مراکز 1950ء تک الاٹ ہوتے رہے۔ 1950ء ہی میں ایک معاہدے کے تحت ہجرت کر جانے والے لوگ اپنی خواتین کی برآمدگی اور مدفون دولت کی بازیافت کیلئے ایک دوسرے ملک میں آتے جاتے رہے۔ میں نے خود دیکھا کہ انارکلی کی چند دکانوں سے ان کے مالکان نے بھارت سے آ کر خفیہ مقامات پر مدفون بڑی بڑی تجوریاں نکالیں اور دولت اپنے ساتھ لے گئے۔ دونوں طرف یقیناً ایسے بہت سے لوگ تھے جنہوں نے اپنی نقدی اور زیورات چھپا دیئے تھے لیکن چند ایک ہی ایسے خوش قسمت تھے جنہیں دوبارہ یہ دولت حاصل کرنے کا موقعہ ملا۔

بھارتی پنجاب سے مسلمان خواتین کی بازیافت البتہ ایک ادھورا اور ناکام عمل تھا۔ سکھوں اور ہندوؤں کے ہتھے چڑھنے والی زیادہ تر خواتین نے خودکشی کر لی تھی جو بچ رہیں ان

میں سے اکثریت کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ واپس اپنے خاندان میں جائیں اور ان کا یہ فیصلہ یقیناً درست تھا کیونکہ جن خواتین کو واپس لایا گیا انہیں خاندان نے قبول نہ کیا۔

اندرون شہر ہندوؤں کا بڑا مرکز شاہ عالمی گیٹ تھا۔ یہ پورا علاقہ زبردست آتش زدگی کے باعث تقریباً تباہ ہو چکا تھا۔ حکومت نے بعد میں اسے بلڈوز کر کے جدید اور ملٹی سٹوری بلڈنگیں بنا دیں۔ اب یہ شاہ عالم مارکیٹ لاہور کی ایک بڑی ہول سیل مارکیٹ ہے۔ دوسری بڑی مارکیٹ اکبری منڈی تھی۔ یہاں کھانے پینے کی اشیاء فروخت ہوتی تھیں۔ یہ آج بھی اسی حالت میں موجود ہے۔ اس میں پرانی اور بوسیدہ عمارات تھیں۔ اب ان میں سے کچھ نئی بلڈنگوں میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ زیادہ تر دکانیں سنگل اسٹوری تھیں۔ وہ آج بھی ویسی ہی ہیں۔ البتہ شہر کی آبادی بڑھ جانے سے کاروبار پہلے سے کئی گنا زیادہ ہو چکا ہے۔

تقسیم سے پہلے لاہور شہر کی آبادی بمشکل 25/20 لاکھ ہوگی۔ اب یہ پچھتر لاکھ سے تجاوز کر رہی ہے۔ اب یہ شہر پاکستان کا دوسرا بڑا شہر اور بین الاقوامی حیثیت کا حامل ہے۔ آزادی سے پہلے کے لاہور اور آج کے لاہور میں کوئی مماثلت نہیں ہے۔ لاہور کے خدوخال اور مزاج دونوں تبدیل ہو چکے ہیں۔ آزادی کے کافی عرصہ بعد لاہور کی قسمت جاگی اور اس شہر کو توسیع وترقی نصیب ہوئی۔ کرشن نگر میں ہندو اور سنت نگر میں زیادہ سکھ آباد تھے۔ سنت نگر کے باہر آریہ سماج کالج اور اس کا ایک بڑا ہوسٹل تھا جو تقسیم کے وقت لاہور میں مقامی ہندوؤں اور سکھوں کا ایک محفوظ کیمپ تھا۔ یہاں سے آخری ہندو اور سکھ بھی حفاظت کے ساتھ بھارت پہنچا۔ لاہور یا پنجاب کے کسی بھی عارضی ہندو کیمپ پر کوئی منظم حملہ نہ ہوا جبکہ مشرقی پنجاب اور دہلی کے مسلمان کیمپوں پر منظم حملے کیے گئے۔ مشرقی پنجاب میں تو خاص طور پر بہت جانی نقصان ہوا۔ جو قافلے پیدل پاکستان کیلئے روانہ ہوتے ان پر منظم جتھے حملے کرتے۔ قتل وغارت اور عورتوں کی عصمت دری کے بہیمانہ واقعات ہوئے۔ بچ بچا کر آنے والے لوگ اپنی بپتا سناتے تو سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ اگر ہندوستان سے آنے والے مہاجرین کے ساتھ انسانیت سوز سلوک نہ ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ لاہور کے رہنے والے ہندو اور سکھ آج بھی یہاں پرسکون زندگی گزار رہے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہوتے۔ یہ انتقام کی آگ تھی جس نے لاہور کو لہولہان کر دیا۔

لاہور میں سب سے زیادہ مشتعل امرتسر، جالندھر اور نواحی علاقوں سے آنے والے مہاجرین تھے۔ یہ لوگ اپنے غصہ میں حق بجانب تھے۔ جانی اور مالی نقصان سے زیادہ ان کی غیرت کا مسئلہ تھا۔ سکھوں اور ہندوؤں نے ان کی چالیس ہزار سے زائد خواتین کی بے حرمتی کی تھی۔ ایک بڑی تعداد میں خواتین چھین لی گئی تھیں۔ سینکڑوں مرد اور خواتین اپنی آنکھوں کے سامنے ہونے والی درندگی کو یاد کر کے بلکتے اور آہ و فغاں کرتے تھے۔ ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والے قافلوں کے پاس قیمتی سامان کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا وہ تو بڑی مشکل سے صرف اپنی جانیں بچا کر آنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ مجھے اپنے خاندان کا حال معلوم تھا۔ دہلی کے محلہ عزیز گنج میں اچھا بھلا گھر تھا۔ دہلی کے قریب گوڑ گاؤں کے ضلع میں سادات کی سات بستیوں میں اور موضع رسول پور میں سیدوں کی زرعی اراضی اور حویلی تھی۔ یہ بستیاں کسی زمانے میں علاقے کی بیشتر جاگیر کی وارث تھیں اور جنگ آزادی 1857ء میں یہاں کے مکینوں یعنی میرے بزرگوں نے اپنا خون دیا تھا۔ لیکن یہ سب کے سب لوگ زراعت سے وابستہ تھے یا ملازمت پیشہ تھے۔ کم از کم میرے والد نے ایک پیسہ کا کلیم داخل نہیں کیا تھا۔ انہوں نے کسی قسم کی مدد طلب نہیں کی تھی۔ میرا مشاہدہ یہی ہے کہ جو صاحب حیثیت تھے ان میں سے اکثر تقسیم کے نتیجہ میں کنگال ہو گئے۔ پاکستان میں نظم و نسق اور امور مملکت چلانے کیلئے قائداعظم اور لیاقت علی خان کو دفاتر، ان کی بنیادی ضروریات اور فنڈز کی ضرورت تھی۔ ہندوستان نے پاکستان کے حصہ کے تمام اثاثے ضبط کر لئے تھے۔ پاکستان کو اس کا حصہ دینے سے مسلسل انکار کی صورت حال تھی۔ یوں پاکستان کی حکومت مہاجرین کی مدد کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ مہاجرین کی دیکھ بھال کا بڑا بوجھ عوام نے امداد باہمی کے ذریعے مل کر خود اٹھایا۔ ان دنوں عوام میں ایک خاص جذبہ دیکھنے میں آتا تھا اور یہ جذبہ ملک کو درپیش ہر چیلنج کے موقع پر سامنے آیا۔ لاہور میں رہنے والے ہندو اور سکھ مسلمانوں کے مقابلہ میں خوشحال تھے۔ زندہ دل لاہوری کہلاتے تھے۔ گنگا رام نے ہسپتال اور دیال سنگھ نے کالج اور ٹرسٹ لائبریری جیسے فلاحی ادارے قائم کر

رکھے تھے۔ اسی طرح گلاب دیوی ہسپتال اور چند چھوٹے چھوٹے رفاہی ادارے ہندوؤں کی مالی اعانت سے چل رہے تھے۔ ان کے مقابلے میں انجمن حمایت اسلام کا ٹرسٹ اور تعلیمی ادارے چلائے جا رہے تھے۔ لیکن لاہور کی اقتصادیات پر ہندوؤں کا مکمل قبضہ تھا۔ پاکستان بننے سے پہلے پورے ملک کی معیشت پر ہندوؤں کا قبضہ تھا۔ صنعت و تجارت میں خال خال مسلمان پائے جاتے تھے۔

انگریزوں کی دو سو سالہ سرپرستی میں ہندوؤں نے ملازمتوں، تعلیمی اداروں، صنعت و حرفت اور تجارت کو مسلمانوں کیلئے شجر ممنوعہ بنا دیا تھا۔ سرسید احمد خان کے زمانے میں مسلمانوں کو اس بات کا شدت سے احساس ہوا اور سرسید اور ان کے ساتھیوں نے تلافی مافات کی بھرپور کوششیں کی۔ اگرچہ بعد میں اس کے ثمرات سامنے آئے لیکن تب بہت دیر ہو چکی تھی۔ ہندو ہر شعبہ میں غالب آ چکے تھے۔ تاہم سرسید احمد خان نے قوم کو آگے بڑھنے کا راستہ دکھا دیا۔

ایک علیحدہ قوم کی حیثیت سے زندہ رہنے کیلئے مسلم لیگ اور قائداعظم محمد علی جناح نے مسلمانوں کو متحرک کیا تھا۔ اس موقع پر آزادی اور سیکولرازم کے نعرہ کے ساتھ مسلمانوں کے خدشات کو پیش نظر رکھ کر اگر ہندو، مسلمانوں کو ''قومی دھارے'' میں شامل رکھنے کیلئے انہیں ''ویٹو'' کا حق دے دیتے تو پاکستان بنانے کی کبھی ضرورت پیش نہ آتی۔ ہندوؤں نے آزادی ملنے سے پہلے ہی برملا سیکولرازم کی تشریح یہ کر دی ہندو، ہندی، ہندوستان...... چنانچہ مسلمانوں کے پاس اب اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ دو قومی نظریہ کی بات کرتے۔ مسلمانوں کو اس کیلئے بیدار کرتے۔ دو قومی نظریہ آج بھی ایک زندہ حقیقت ہے۔ اسے تسلیم نہ کرنے والے محض دیوار سے سر ٹکرا رہے ہیں۔ 1971ء میں بھارتی سازش اور پھر باقاعدہ فوج کشی نے مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش تو بنوا دیا اور اندرا گاندھی نے بڑی نخوت سے اعلان کر دیا کہ اس نے دو قومی نظریہ کو بحر ہند میں غرق کر دیا ہے لیکن عملاً ایسا نہ ہو سکا۔ اگر مشرقی پاکستان، مغربی بازو سے الگ ہو کر ہندوستان میں ضم ہو جاتا تو پھر واقعی دو قومی نظریہ ختم ہونے کا دعویٰ کیا جا سکتا تھا۔ اس معاملے میں تو بنگلہ قومیت کا جادو بھی نہ چل سکا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بنگالی مسلمان بنگالی ہندو کے ساتھ رہنے کو تیار نہیں۔ اس نے اپنا علیحدہ تشخص قائم رکھا۔ یوں دوقومی نظریہ برقرار رہا۔

بھارت کے ہندوؤں نے آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد پاکستان اور مسلمانوں کے خلاف مسلسل سازشیں اور ریشہ دوانیاں جاری رکھیں ہیں۔ بھارتی قیادت کی ہٹ دھرمی اور سامراجی ذہنیت نے باہمی تناؤ کو اس حد تک پہنچایا کہ دونوں ملک عسکری قوت کے حصول اور ایٹمی طاقت بننے کے خبط میں کروڑوں عوام کو غربت وافلاس کی دلدل میں دھکیلنے پر مجبور ہو گئے۔ جب بھی پاکستان میں کوئی قومی قیادت برسراقتدار آئی جو انشاء اللہ زیادہ دور کی بات نہیں اور اس نے انہی خطوط پہ بھارت کو جواب دینے کا منصوبہ بنایا تو دُنیا دیکھے گی کہ نام نہاد جمہوریت اور سیکولرازم کے غبارے سے کس طرح ہوا نکلتی ہے اور اکھنڈ بھارت پارہ پارہ ہوکر کتنی مختلف آزاد اور خودمختار ریاستوں میں تقسیم ہوتا ہے۔

بھارتی قائدین نے گزشتہ 56 برسوں میں برصغیر میں نفرتوں کے بیج بوکر جو فصل تیار کی ہے وہ اب کسی وقت کٹنے والی ہے۔ آپ جو بو کر گندم کاٹنے کی توقع کیسے کر سکتے ہیں۔ بھارتی قیادت کی منافقت کب تک چلے گی۔ آپ کشمیریوں کو ان کا حق نہ دیں اور پھر بھی ان سے امن وآشتی کی توقع کریں تو احمقانہ توقع بھارتی قیادت ہی کرسکتی ہے اور کشمیر تو ابھی تک تقسیم کے نامکمل ایجنڈے کی تکمیل چاہتا ہے۔

تقسیم کے بعد بھارت سے آنے والے مہاجروں نے اپنی بے سروسامانی کے باوجود صنعت وحرفت اور تجارت کے شعبوں میں اپنی شبانہ روز محنت اور لگن سے شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ اس کا فائدہ پوری مسلم امہ کو پہنچا۔ پاکستان میں بسنے والی قومیتوں کو سیاسی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی اندرونی بیرونی سازشیں ہوتی رہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ ہماری قیادت نے پاکستان کے پسماندہ طبقات کو آزادی کے ثمرات سے بہرہ ور نہیں ہونے دیا۔ لیکن پھر بھی اگر بھارت کے پسے ہوئے اور مظلوم طبقات سے پاکستان کے ان طبقات کا موازنہ کیا جائے تو آپ کو زمین آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ اگر بھارت پاکستان سے عدل وانصاف کی بنیاد پر دوستی کی بات کرتا ہے تو اس کی مخالفت کوئی نہیں کرے گا۔ لیکن

اگر بڑا ملک ہونے کے زعم، میں بھارت اپنی بالادستی چاہتا ہے اور وہ پاکستان کو چودہ کروڑ صارفین کی مارکیٹ کے طور پر اپنی گرفت میں لینا چاہتا ہے تو یہ نہیں ہو سکے گا۔ لیاقت نہرو معاہدے پر عمل درآمد، سیاچن سے انخلا اور کشمیر کا مسئلہ حل کئے بغیر بھارت اور پاکستان کے تعلقات کس طرح معمول پہ آ سکتے ہیں۔

تقسیم ہند کے وقت فسادات کے موضوع پر شائد ہی کوئی پاکستانی ادیب ہو جس نے کچھ نہ لکھا ہو۔ سعادت حسن منٹو، قراۃ العین حیدر، احمد ندیم قاسمی، ایم اسلم، رئیس احمد جعفری اور نسیم حجازی جیسے بڑے بڑے ادیبوں سے لیکر چھوٹے چھوٹے قلمکاروں تک نے اس المیہ پر قلم اٹھایا۔ فسادات کے دوران ہونے والے المناک واقعات کا تذکرہ افسانہ تراشی یا داستان گوئی نہیں تھا اس میں ہندوؤں کی ذہنیت اور مسلمانوں کیلئے ان کے لاشعور میں رچی نفرت کا اظہار ملتا ہے۔

بھارت میں بھی تقسیم کے موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن یہ تقسیم کو ایک غلط فیصلہ اور بھارت ماتا کے ٹکڑے ہونے کے المیہ کے طور پر لیا گیا۔ تقسیم کو ایک افسوسناک اقدام قرار دیکر اسے ختم کرنے کے جذبہ کو فروغ دینے کی بات ہمیشہ کی گئی۔

ستمبر 2004ء

ریاست جونا گڑھ...... بھارتی استبداد کا پہلا شکار

جونا گڑھ ان ریاستوں میں شامل تھی جنہوں نے پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ اور اعلان کیا لیکن بھارتی استبداد نے اسے اپنے فیصلے پر عملدر آمد نہ کرنے دیا۔ اگست 1947ء میں جونا گڑھ کے دیوان وائسرائے کونسل کے سابق ممبر اور بمبئی سندھ پبلک سروس کمیشن کے چیئرمین سر شاہ نواز بھٹو تھے 23 جون کو اعلان آزادی کے ساتھ ہی جونا گڑھ میں حالات تبدیل ہونا شروع ہوگئے۔ ریاست کو بھارت یا پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کرنا تھا۔ ریاست میں اگرچہ ہندوؤں کی اکثریت تھی مگر لوگ نواب جونا گڑھ سے مطمئن اور خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔ اگست کے شروع میں سر محمد ظفر اللہ خان کو مشورہ کے لئے جونا گڑھ بلایا گیا۔ ان دنوں وہ حد بندی کمیشن میں پاکستان کا کیس پیش کرنے میں مصروف تھے۔ انہوں نے کہا کہ جونا گڑھ کو پاکستان سے الحاق کا قانونی طور پر پورا پورا حق ہے اس کے ساتھ ہی الحاق کا مسودہ بھی تیار کیا گیا۔ یہ نواب صاحب کے فرمان کی صورت میں جونا گڑھ کے سرکاری گزٹ میں 13 اور 14 اگست کی درمیانی رات کو شائع کیا گیا اور 14 اگست سے جونا گڑھ پاکستان کا ایک حصہ بن گیا۔

اعلان الحاق کے بعد ہندوستان میں شائع ہونے والے گجراتی اخباروں میں اعلان کے خلاف پراپیگنڈہ کا زور بڑھ گیا بے بنیاد خبریں چھپنے لگیں اور لوگوں میں خوف و ہراس پھیلانے کی کوششیں شروع ہوگئیں چنانچہ کچھ ہندوؤں نے ریاست چھوڑ کر دوسرے علاقوں کا رخ کر لیا۔ اسی دوران ایک سیاسی ٹولے نے ہندوستان کی حکومت کی شہ پر بمبئی میں جونا گڑھ کی "عارضی حکومت" کے قیام کا اعلان کر دیا اور اسکے والنٹیر ریاست کی سرحد کے آس پاس انتشار پھیلانے لگے۔

ہندوستان نے جونا گڑھ کے گرد اپنا حصار مضبوط کرنا شروع کر دیا۔ ستمبر کے آخری دنوں میں جونا گڑھ سے باہر جانے کے تمام راستے بند ہو چکے تھے۔ ادھر سے کسی شخص کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اشیائے ضرورت کی درآمد بند ہوگئی ڈاک تار کا سلسلہ بھی منقطع ہوگیا۔ جونا گڑھ اب پوری طرح گھر چکا تھا۔ ریاست کی پولیس میں ایک نئی بٹالین کا اضافہ کیا گیا۔ ریاستی وسائل اور اطراف کی مدد سے ہتھیار اکٹھے کئے گئے۔ اور نئی بٹالین کی تربیت شروع کر دی گئی۔ ریاست میں آباد سندھیوں کا ایک فوجی دستہ بھی تیار کیا گیا۔ لوگوں کے حوصلے بڑھانے کیلئے ان نئے دستوں کو شہر میں گھمایا گیا۔

ریاست کی ناکہ بندی کے باوجود اشیاء کی قلت نہ ہونے دی گئی۔ ڈاک اور تار کا سلسلہ بحال کرنے کے لئے پاک بحریہ کے جوانوں سے مدد لی گئی جو ایک وائرلیس سیٹ لیکر آگئے۔ کسی طرح فضائی رابطہ بھی بحال ہوگیا۔ ادھر عارضی حکومت والوں کو بھارت کی حمایت حاصل تھی۔ انہوں نے سرحدی گاؤں کے لوگوں کو پریشان کرنا شروع کر دیا۔ جونا گڑھ کے کچھ گاؤں پڑوسی ہندو ریاستوں کی سرحدوں پر تھے۔ یہ لوگ ہندو ہونے کے باوجود نواب صاحب سے وفاداری رکھتے تھے اور ان کو "باپو" کہتے تھے۔ انہی کی رعایا بن کر رہنا چاہتے تھے لیکن رفتہ رفتہ دشواریاں بڑھ گئیں۔ ان دیہات تک پہنچنا مشکل ہوگیا اور لوگوں سے ریاستی حکومت کا رابطہ ٹوٹ گیا۔

عارضی حکومت کے والنٹیر دراصل ہندوستانی سپاہی تھے اور وردی کے بغیر گھومتے تھے مگر ستمبر کے آخر میں باوردی فوجی بھی سرحدوں پہ نظر آنے لگے۔ صاف نظر آنے لگا کہ دہلی کی حکومت کیا چاہتی ہے۔ ہندوستان کی ریاستی امور کی وزارت کے سیکرٹری مسٹر وی پی مینن نے ریاست کو ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی۔ وہ خوف زدہ کر کے ریاست کا الحاق پاکستان سے منسوخ کرانا چاہتے تھے۔ مگر سر شاہنواز بھٹو نے واضح کر دیا کہ جونا گڑھ اپنے فیصلہ پر ڈٹا رہے گا۔ دہلی حکومت نے جونا گڑھ کی ماتحت ریاستوں مانا دور اور منگرول کو ورغلایا کہ اگر ان کے والیان ہندوستان سے الحاق کا اعلان کر دیں تو انہیں جونا گڑھ کی بالادستی سے نجات مل جائے گی مانا دور کے والی نے انکار کر دیا البتہ منگرول کے والی نے رضامندی ظاہر کر دی۔

عارضی حکومت کے والنٹیرز کی کارروائیوں میں شدت آگئی سرحدی دیہات پر حملے

ہونے لگے۔ لیکن اسکے برعکس اخبارات میں جونا گڑھ میں مظالم کی جھوٹی خبریں شائع کی جانے لگیں تا کہ دہلی حکومت کو کارروائی کا جواز مہیا کیا جائے۔ پڑوسی ہندو ریاستوں نے پراپیگنڈہ شروع کر دیا اور دہلی کی مرکزی حکومت کو جھوٹی رپورٹیں ارسال کرنے لگیں کہ ہزاروں ہندو ریاست چھوڑ کر آ رہے ہیں۔ ہندو اخباروں کے پراپیگنڈے اور سرحدوں پر ہندوستانی افواج کی نقل و حرکت نے اپنا کام دکھانا شروع کر دیا۔ ہندوستان سے جنگ ناممکن تھی۔ کہا جا رہا تھا کہ ریاست کا وزیر اعظم سر شاہنواز بھٹو غیر ریاستی ہے اور اپنے صوبے سندھ کے ساتھ ریاست کو ملانا چاہتا ہے۔ رعایا پاکستان سے الحاق نہیں چاہتی۔ اکتوبر کے تیسرے ہفتہ میں ہندوستان نے مانا دور پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ اب جونا گڑھ اسکا اگلا نشانہ تھا۔ نواب جونا گڑھ اور ان کا خاندان کراچی منتقل ہوگیا۔

مانا دور پہ قبضہ کے بعد ہندوستان نے منگرول پر چڑھائی کی پھر جونا گڑھ کے وسیع حصہ پر تسلط جما لیا۔ ہندوستانی فوجی روزانہ کسی نہ کسی گاؤں پر قبضہ کرتے ہوئے دارالحکومت کی طرف پیش قدمی کرنے لگے۔ جونا گڑھ کی کابینہ میں ایک انگریز وزیر نے ہندوستانی فوج کو جونا گڑھ میں داخل ہونے کی دعوت دے دی۔ 8 نومبر کو سر شاہنواز بھٹو مجبوراً کراچی آگئے۔ 9 نومبر کو ہندوستانی فوجیں جونا گڑھ میں داخل ہوگئیں۔ تقسیم کے فارمولا میں طے کیا گیا تھا کہ والیان ریاست کو حق حاصل ہوگا کہ وہ نئی مملکتوں بھارت یا پاکستان کے ساتھ الحاق کر لیں۔ جونا گڑھ کے والی نے پاکستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کیا لیکن بھارتی حکومت نے تمام اخلاقیات کو پس پشت ڈالتے ہوئے اپنی توسیع پسندی اور بالادستی کے مکروہ عزائم پر عمل درآمد کا آغاز کر دیا...... اسکے بعد ریاست حیدر آباد اور کشمیر میں جو کچھ ہوا اس نے کانگریسی قیادت کے گھناؤنے کردار کو بے نقاب کر دیا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ریاست حیدر آباد دکن...... بھارتی استبداد کا دوسرا شکار

ریاست حیدر آباد دکن کے نظام نے 3 جون کے منصوبہ کے اعلان کے بعد فیصلہ کیا تھا کہ وہ نہ تو ہندوستان کے ساتھ الحاق کرے گا اور نہ پاکستان سے بلکہ اپنی ریاست کے لئے ڈومینین کا درجہ حاصل کرے گا۔ ریاست حیدر آباد، کا رقبہ 82 ہزار مربع میل اور آبادی ایک کروڑ ساٹھ لاکھ نفوس تھی۔ اس کی آبادی کی اکثریت ہندو تھی لیکن حکمران...... نظام...... مسلمان تھا۔ اس نے جولائی 1947ء میں ایک وفد وائسرائے کے پاس بھیجا۔ وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا کہنا تھا کہ حکومت برطانیہ ریاست حیدر آباد کو ڈومینین کا درجہ دینے پر آمادہ نہیں ہوگی۔ بہتر یہی ہے کہ ہندوستان سے الحاق کر لیا جائے۔ نظام حیدر آباد کو یہ بات قبول نہیں تھی۔ ریاست کی جغرافیائی صورتحال ایسی تھی کہ اس کے پاس سمندر تک کوئی راستہ نہ تھا۔ چاروں طرف ہندوستانی علاقہ اسے گھیرے ہوئے تھا۔

اعلان آزادی ہو گیا۔ ہندوستانی کابینہ نے نظام حیدر آباد کے ساتھ مذاکرات کا کام گورنر جنرل ماؤنٹ بیٹن کے حوالے کر رکھا تھا۔ نظام ریاست کے دفاع، امور خارجہ اور مواصلات کے معاملات کے لئے بھارت کے ساتھ اشتراک کا معاہدہ کرنے پر تیار تھا مکمل الحاق کا حامی نہیں تھا۔ بھارت کی حکومت الحاق پر مصر تھی۔ 29 نومبر 1947ء کو بھارت اور حیدر آباد کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کے تحت موجودہ صورت حال کو جوں کا توں رکھنے پر اتفاق ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے وعدہ لیا تھا کہ وہ پاکستان سے الحاق نہیں کرے گا۔ بھارت کا دعویٰ تھا کہ اس معاہدہ کے تحت حیدر آباد کسی غیر ملک کے ساتھ کسی طرح کے تعلقات قائم نہیں کر سکتا۔

بظاہر بھارت نے ریاست حیدر آباد کی خود مختاری کو تسلیم کر لیا تھا لیکن ریاست میں اپنی خواہش کے مطابق حالات پیدا کرنے کے لئے سازشیں شروع کر دیں۔ حیدر آباد میں بمبئی کے ایک سابق وزیر اور اکھنڈ بھارت کے پرجوش حامی کے ایم منشی کو بھارت کا ایجنٹ جنرل

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مقرر کیا گیا۔اس نے ریاست کے ہندوؤں کو اکسانے اور نظام حیدر آباد کے اقتدار کے خاتمہ کیلئے در پردہ کام شروع کر دیا۔حیدر آباد میں مسلمانوں کی تنظیم اتحاد المسلمین اور اس کے رہنما قاسم رضوی کی طاقت روز بروز بڑھ رہی تھی۔ان کی ہمدردیاں پاکستان کے ساتھ تھیں۔نظام سے اتحاد المسلمین کو خلاف قانون قرار دینے اور رضا کاروں کی تنظیم ختم کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔1948ء میں نہرو نے کہا کہ رضا کاروں کی سرگرمیوں سے حیدر آباد کے عوام کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہوا تو بھارت کی حکومت ریاست حیدر آباد میں یقیناً مداخلت کرے گی۔نظام کو جونا گڑھ کا انجام بھی یاد دلایا گیا۔بھارتی لیڈروں کا دعویٰ تھا کہ حیدر آباد کے عوام بھارت سے الحاق کے حق میں ہیں چنانچہ ریاست کے مستقبل کا فیصلہ عوام پر چھوڑ دینا چاہیے۔اگست 1947ء میں ماؤنٹ بیٹن انگریز افسروں کی زیر نگرانی استصواب کی پیش کش بھی کر چکا تھا۔اب مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ حیدر آباد میں فوراً ذمہ دار حکومت قائم کی جائے کیونکہ ریاست کی آبادی کی اکثریت کی نمائندہ حکومت کے بغیر استصواب عوام سے فریب ہوگا۔

1948ء میں ریاست کا اقتصادی محاصرہ کر دیا گیا۔فوجی تیاریاں بھی شروع تھیں۔حیدر آباد اور بھارت دونوں طرف سے سرحدوں کے آر پار حملوں کے الزامات کے ساتھ ساتھ معاہدہ کی خلاف ورزیوں کے الزامات بھی لگائے گئے۔نہرو کا لہجہ روز بروز سخت ہوتا جا رہا تھا اس کا کہنا تھا۔جب بھی ضروری ہوا، ہم حیدر آباد کے خلاف فوجی کارروائی شروع کر دیں گے۔ریاست کی حکومت غنڈوں کے ہاتھ میں ہے الحاق کی بجائے حیدر آباد کو بھارت میں مدغم کرنا ضروری ہے۔اس صورت میں حیدر آباد کے خلاف کارروائی کو جنگ کا نام نہیں دیا جائے گا۔

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی رحلت اور تدفین کے دوسرے دن یعنی 13 ستمبر 1948ء کو پاکستانی قوم رنج وغم سے نڈھال تھی کہ بھارت نے موقعہ غنیمت سمجھا اور کسی اعلان کے بغیر اچانک حیدر آباد پر حملہ کر دیا۔ رضا کار میدان میں کود پڑے اور بھارتی افواج کو دندان شکن جواب دینے لگے۔ریاست پر 22 مقامات سے حملہ ہوا تھا۔لیکن حیدر

آباد کی باقاعدہ افواج ابھی تک حرکت میں نہیں آئی تھیں۔ایک ابہام اور گومگو کی کیفیت تھی۔ اس سے پہلے کہ بین الاقوامی برادری کوئی ردعمل ظاہر کرتی نظام حیدر آباد میر عثمان علی خان نے حیرت انگیز بیان جاری کر دیا۔رضا کاروں کی تنظیم ختم کر کے جنگ بندی کا اعلان کر دیا گیا۔ بھارتی افواج کو بلارم اور سکندر آباد آنے کی اجازت دیدی گئی۔ حیدر آباد دکن پر بھارتی فوج کا قبضہ ہوگیا۔

حیدر آباد دکن کے حکومت برطانیہ سے متعدد معاہدے موجود تھے۔ برطانوی حکومت عملی مدد کرنے کی مجاز ہی نہیں پابند بھی تھی لیکن اس نے صرف قرارداد مذمت منظور کرنے پر اکتفا کیا۔حیدر آباد دکن پر بھارتی تسلط اکھنڈ بھارت کا خواب شرمندہ تعبیر کرنے کی طرف ایک اور قدم تھا۔ جونا گڑھ کے بعد حیدر آباد پر اس کی کھلی جارحیت مستقبل میں اس کے مذموم عزائم کی جھلک تھی۔ جونا گڑھ اور حیدر آباد دکن پر قبضہ کرتے ہوئے اس کا استدلال تھا کہ ان ریاستوں کی آبادی ہندو اکثریت پر مشتمل ہے۔ ہندو بھارت کے ساتھ الحاق بلکہ ادغام چاہتے ہیں چنانچہ ان کی اخلاقی سیاسی عسکری مدد کرنا بھارت کا فرض تھا۔لیکن اسی اصول کو اس نے کشمیر میں نظر انداز کر دیا۔ریاست کشمیر کے عوام کی اکثریت مسلمان تھی۔ لیکن وہاں کا حکمران ایک ڈوگرہ ہندو تھا۔اس کی طرف سے کشمیر کا الحاق بھارت کے ساتھ کرنے کے اعلان کو بنیاد بنا کر ریاست کو جبراً بھارتی تحویل میں لے لیا گیا۔یہاں دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کو جمہور کی آواز سننے سے انکار کر گئی۔ریاست کے والی سے بھارت کے ساتھ الحاق کا اعلان کس طرح کر لیا گیا، یہ ایک الگ داستان ہے۔

ریاست کشمیر...... بھارتی استبداد کا تیسرا شکار

3 جون 1947ء کو تقسیم کے فارمولے کا اعلان کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ ریاستیں اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کریں گی کہ وہ بھارت کے ساتھ رہنا چاہتی ہیں، پاکستان کے ساتھ الحاق کریں گی یا ڈومینین کا درجہ حاصل کرنا چاہیں گی۔ طے پایا کہ اسکا اعلان خود والیان ریاست کریں گے۔ جونا گڑھ کے نواب نے پاکستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کیا لیکن بھارت نے دلیل پیش کی کہ اس ریاست کی آبادی ہندو اکثریت پر مشتمل ہے اور وہ بھارت کے ساتھ رہنا چاہتی ہے چنانچہ ان کی رائے کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ نواب جونا گڑھ کے فیصلے کو مسترد کرتے ہوئے بھارتی افواج نے ریاست جونا گڑھ اور اس کی ماتحت ریاستوں مناور اور منگرول پر زبردستی قبضہ کر لیا۔ اسی دلیل کو بنیاد بنا کر موقف اختیار کیا گیا کہ حیدر آباد دکن کی آبادی بھی ہندو اکثریت پر مشتمل ہے اور وہ بھارت کے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔ اگرچہ نظام دکن ریاست کے لئے ڈومینین کا درجہ چاہتے تھے اور ابتدا میں بھارتی حکومت نے اس کی موجودہ صورت حال کو قبول کرتے ہوئے معاہدہ بھی کر لیا لیکن پھر اس معاہدہ کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ بھارتی افواج حیدر آباد کے عوام کے تحفظ کے نام پر ریاست میں دندناتی ہوئی داخل ہو گئیں اور حیدر آباد دکن کی ریاست کو بھارت میں ضم کر دیا۔

مقامی آبادی کی خواہش کے احترام کا ڈھنڈورہ پیٹنے والی بھارتی حکومت کشمیر کے معاملے میں اپنے ہی موقف کی نفی کرتے ہوئے ایک نئے روپ میں سامنے آئی۔ اکتوبر 1947ء میں ریاست جموں و کشمیر کے بھارت کے ساتھ الحاق کا ڈرامہ رچایا گیا۔ ریاست کے حکمران مہاراجہ ہری سنگھ کی طرف سے اعلان کرایا گیا کہ وہ بھارت سے الحاق چاہتے ہیں۔ صورت حال یہاں بھی جونا گڑھ اور حیدر آباد جیسی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ حکمران غیر مسلم اور مقامی آبادی کی اکثریت مسلمان تھی۔ مسلمان فطری طور پر پاکستان سے الحاق چاہتے تھے لیکن بھارتی حکومت کو یہاں مقامی آبادی کی خواہشات کا کوئی احترام نہیں تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کشمیر کو بھارت کا اٹوٹ انگ بنانے کے لئے بھارتی حکمرانوں‘ ریاست کے حکمران راجہ ہری سنگھ اور ریاست میں نیشنلزم کے علمبردار شیخ عبداللہ کے گٹھ جوڑ سے بھارت کے ساتھ ریاست جموں وکشمیر مسلم کانفرنس 19 جولائی 1947ء کے اجلاس میں مقامی آبادی کی نمائندگی کرتے ہوئے پاکستان کے ساتھ ریاست جموں وکشمیر کا متفقہ مطالبہ منظور کر چکی تھی۔ 1946ء میں ریاستی اسمبلی کے انتخابات میں مسلمانوں کے لئے مختص اکیس نشستوں میں سے سولہ نشستوں پر کامیابی حاصل کرنے کے بعد مسلم کانفرنس ریاستی مسلمانوں کی غیر سرکاری پارلیمنٹ کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔

اس الحاق کی غیر قانونی حیثیت اس لئے بھی تھی کہ 15 اگست 1947ء کو مہاراجہ ہری سنگھ اور حکومت پاکستان کے مابین ایک معاہدہ طے پا چکا تھا۔ جس کے تحت حکومت ریاست جموں وکشمیر کو حکومت پاکستان کے ساتھ اسی طرح کے تعلقات برقرار رکھنا تھے۔ جس طرح کے تعلقات پہلے اس کے اور برطانوی حکومت کے مابین استوار تھے۔ اس معاہدہ کی موجودگی میں مہاراجہ ہری سنگھ کسی دوسرے ملک کے ساتھ کوئی معاہدہ کرنے کا مجاز نہیں تھا۔

بھارت کے ساتھ کشمیر کے الحاق کی سازش میں ہندو کانگریس کے ساتھ ساتھ انگریز بھی پوری طرح شریک تھے۔ انہوں نے تقسیم کے اصول کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ریڈکلف ایوارڈ کے ذریعے مسلم اکثریت کا ضلع گورداس پور بھارت کے حوالے کرکے بھارت کو کشمیر تک پہنچنے کا راستہ مہیا کیا تھا۔ ورنہ بھارت کے لئے کشمیر پر اپنا غاصبانہ تسلط جمانا کسی صورت ممکن نہیں تھا۔

الحاق کا اعلان جس صورت حال میں کیا گیا وہ بھی محل نظر رہے یہ اعلان 27 اکتوبر کو کیا گیا۔ اس سے پہلے 24 اکتوبر 1947ء کو مجاہدین ریاست کے ایک تہائی حصہ کو ڈوگرہ سامراج سے آزاد کرانے میں کامیاب ہونے کے بعد آزاد حکومت ریاست جموں وکشمیر کے نام سے ایک باقاعدہ حکومت کا اعلان کر چکے تھے۔ اس حکومت نے راجہ ہری سنگھ کو معزول کر دیا تھا۔ ہری سنگھ نے مجاہدین کے خوف سے جموں میں پناہ لے رکھی تھی۔ یہیں اس نے بھارت کے ساتھ ریاست کے الحاق کا اعلان کیا تھا۔ اسی نام نہاد الحاق کو بنیاد بنا کر

بھارت نے اپنی فوجیں سری نگر میں اتاریں تھیں۔ ڈوگرہ فوج کے خلاف برسرپیکار مجاہدین بھارتی افواج کے خلاف بھی ڈٹ گئے۔ ان کی مسلسل کامیابیوں سے خوف زدہ ہو کر بھارت اپنی روایتی مکاری سے کام لیتے ہوئے اس مسئلہ کو اقوام متحدہ میں لے گیا۔ وہاں طے پایا کہ کشمیری عوام بھارت یا پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ اقوام متحدہ کی نگرانی میں آزادانہ رائے شماری سے کریں گے۔ یہ فیصلہ برصغیر کی تقسیم کے اصولوں کی روشنی میں کیا گیا تھا۔ چنانچہ 5 جنوری 1949ء کو کشمیر میں جنگ بندی ہوئی اور سیز فائر لائن وجود میں آئی۔ بھارت نے اس طرح جموں وکشمیر کو اپنے ہاتھوں سے نکلنے سے بچالیا اور پھر رائے شماری کے ذکر پر بدکنے لگا۔

اس معاملے میں بھی اس کا موقف ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ والا تھا۔ پاکستان بغداد پیکٹ میں شامل ہوا تو بھارت کے وزیراعظم مسٹر جواہر لال نہرو نے پینترا بدلا اور کہا کہ چونکہ پاکستان غیر جانبدار نہیں رہا اس لیے کشمیر میں رائے شماری نہیں ہوسکتی۔ پھر کشمیر میں کرائے جانے والے انتخابات کو رائے شماری کا متبادل قرار دیا جاتا رہا ہے۔ کشمیریوں کی تحریک آزادی کو پاکستان کی دہشت گردی قرار دے کر وہ عالمی رائے عامہ کو گمراہ کرتا رہتا ہے۔

بھارت کشمیریوں کو ان کا حق دینے پر کبھی آمادہ نہیں ہوا۔ اب وہ اقوام متحدہ میں کشمیر کے بارے میں قراردادوں کو فرسودہ قرار دیتا ہے پاکستان کا دعوی ہے کہ کشمیری عوام پاکستان سے الحاق چاہتے ہیں۔ اور یہ دعویٰ بے بنیاد نہیں کیونکہ تقسیم کے وقت کشمیری عوام کی مسلمان اکثریت پاکستان سے الحاق چاہتی تھی اور اس کی ترجمانی 19 جولائی 1947ء کو آل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس کے خصوصی کنونشن میں قرارداد منظور کرکے کی گئی تھی۔ قرارداد میں کہا گیا......

مسلم کانفرنس کا یہ کنونشن اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ جغرافیائی حالات، مجموعی آبادی کی اسی فیصد مسلم اکثریت‘ پنجاب کے اہم دریاؤں کی ریاست میں سے گذرگاہ‘ لسانی‘ ثقافتی‘ نسلی اور معاشی تعلقات اور ریاست کی سرحدوں کا پاکستان کی سرحدوں سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اشتراک، یہ سب حقائق اس امر کو ضروری قرار دیتے ہیں کہ ریاست جموں و کشمیر پاکستان کے ساتھ الحاق کرلے۔

مذکورہ بالا قرارداد کشمیری مسلمانوں کی نمائندہ سیاسی تنظیم نے منظور کی تھی۔ پاکستان کا استدلال اس وقت بھی یہی تھا جب بھارت کشمیر کا مسئلہ سلامتی کونسل میں لے گیا تھا۔ وہاں اس نے استصواب رائے کو اس خیال سے قبول کرلیا تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کشمیری عوام بھارت سے الحاق کو قبول کرلیں گے یا انہیں تحریص و ترغیب کی بدولت اس فیصلے کے لئے قائل کرلیا جائے گا اور پھر مناسب وقت آنے پر رائے شماری کے ذریعے ان کی مہر تصدیق ثبت کرالی جائے گی۔ لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ آج بھی کشمیری عوام پاکستان سے الحاق چاہتے ہیں اور وادی میں پاکستان زندہ باد کے نعرے گونجتے ہیں۔

کشمیر کی آزادی تک بھارت کی بربادی تک
جنگ رہے گی جنگ رہے گی۔

اکھنڈ بھارت

جغرافیائی اعتبار سے بھارت ہم سے بہت قریب ہے۔ بلکہ ایک طویل عرصہ تک ہم برصغیر میں ایک ہی سیاسی وحدت رہے ہیں۔ سینکڑوں برس تک سلاطین دہلی اور مغلیہ سلطنت میں اور پھر انگریز دور میں ہندوؤں کے ساتھ رہے ہیں۔ ہماری بہت سی تہذیبی اور سماجی قدریں مشترک تھیں۔ لیکن انگریزوں کے دور میں اور بالخصوص تحریک آزادی کے دوران یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ ہندوؤں کے ساتھ رہتے ہوئے بھی ہم ان سے بہت دور ہیں۔ اگر کچھ تہذیبی اور سماجی قدریں مشترک ہیں تو اسی تہذیب اور سماج میں ہمارے درمیان ایسی خلیجیں حائل ہیں جو کبھی ختم نہیں ہوسکتیں۔ کچھ ایسے بنیادی اختلافات ہیں جو ہمیشہ رہیں گے۔ ان کے لئے ہماری رواداری اور کشادہ ظرفی بھی کسی کام نہیں آسکتی۔ جہاں ہندو پانی اور مسلم پانی کی تفریق ہو، جہاں گائے کو ذبح کرنے والوں کو اپرادھی اور ہتیارا کہا جائے وہاں "ہم ایک ہیں" کا نعرہ کیسے درست ہوسکتا ہے۔

سرسید احمد خان سے قائداعظم تک بھی مسلمان قائدین نے اس حقیقت کو شدت سے محسوس کیا اور انگریزوں سے مطالبہ کیا کہ وہ ہندوستان کو آزاد کرتے ہوئے مسلمانوں کو الگ وطن میں آزادی دیں۔ ورنہ مروجہ جمہوریت میں مسلمان اقلیت میں رہیں گے اور ہمیشہ ہمیشہ ہندو کی غلامی میں رہیں گے۔ جو مسلمانوں کو ملیچھ اور اچھوت سمجھتے ہیں تحریک پاکستان کے قائدین نے اپنا مطالبہ منوالیا اور پاکستان بن گیا انتہا پسند ہندو اکھنڈ بھارت کے حامی تھے۔ انہیں پاکستان کا قیام کسی صورت میں قبول نہیں تھا۔ ان کے نزدیک یہ تقسیم بھارت ماتا کو ٹکڑے کرنے کے مترادف تھی اور وہ اسے مہاپاپ سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہندوستان کو تو آزاد ہونا ہے آج نہیں تو کل ہوکر رہے گا اور ہم آزادی لے کر رہیں گے لیکن بھارت کی تقسیم ان کی لاشوں پر سے گذر کر ہی ممکن ہوگی۔

کانگریس نے انہیں تسلی دی کہ تقسیم ہونے دو۔ پاکستان بننے دو۔ یہ بے سروسامان پاکستان کتنے دن کی بات ہوگی۔ ان سے نہ تو سیاست ہوگی اور نہ معیشت سنبھالی جائے گی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دو چار برس کی بات ہے ان پاکستان کے خبطیوں کا خبط دور ہو جائے گا۔ یہ گڑگڑا کر ہم سے درخواست کریں گے کہ ہم واپس ہندوستان میں مدغم ہونا چاہتے ہیں۔ ہمیں واپس لے لو۔ لیکن پاکستان خدا کے فضل سے قائم رہنے کے لئے بنا تھا اور قائم رہا ہم آگے بڑھنے سے پہلے اپنی نوجوان نسل کو یاد دلانا چاہتے ہیں کہ ہندو انتہا پسندوں کا اکھنڈ بھارت کا تصور محض پاکستان دشمنی اور متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں پر حکومت کی خواہش نے تراشا تھا۔ تاریخی حقیقت یہ ہے کہ بھارت ...... کبھی بھی اکھنڈ بھارت نہیں رہا۔ انگریزوں اور مغلیہ سلطنت سے پہلے کبھی بھی ہندوستان ایک سیاسی وحدت نہیں تھا۔ جنوبی ایشیاء میں یقیناً چھوٹی چھوٹی ہندو ریاستیں تو تھیں لیکن پورا برصغیر کبھی بھی کسی ایک ہندو حکمران کے جھنڈے تلے سیاسی وحدت نہیں رہا۔ اشوکا کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ ایک وسیع و عریض سلطنت کا فرمانروا تھا لیکن یہ مبالغہ آرائی ہے۔ اس کی حکومت شمالی ہندوستان اور وسطی ہندوستان کے کچھ علاقوں تک محدود تھی۔ لیکن بقیہ سارے برصغیر پر دیگر راجوں مہاراجوں کی حکومتیں تھیں۔

متحدہ ہندوستان کی عملی صورت تو مسلمانوں کے ادوار حکومت میں ممکن ہوئی۔ جس اکھنڈ بھارت کا واویلا انتہا پسند ہندو کرتے ہیں وہ مغلیہ سلطنت اور پھر انگریزوں کی عملداری کا نتیجہ تھا۔ اگر مسلمان فاتحین نے کسی اکھنڈ بھارت جیسے ملک پر قبضہ کیا ہوتا تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مسلمانوں نے متحدہ ہندوستان پر قبضہ کیا تھا۔ چنانچہ آزادی دیتے ہوئے انگریزوں کو وہی سیاسی اور جغرافیائی وحدت واپس کرنا چاہیے۔ اسے بھارت اور پاکستان میں تقسیم کر کے ہندوؤں کے تاریخی اور مذہبی ورثہ کو پامال نہیں کرنا چاہیے۔ بھارت نہ تو کبھی اکھنڈ تھا اور نہ رہ سکتا تھا...... یہ محض سیاسی بلیک میلنگ اور عام ہندو کو مسلمانوں اور پاکستان کے خلاف پورے مذہبی جوش و خروش کے ساتھ متنفر کرنے کا ایک ہتھکنڈہ تھا جسے اب بھی سادہ لوح ہندوؤں کو جذباتی کرنے کے لئے استعمال کیا جارہا ہے۔

پاکستان بن گیا، انتہا پسند ہندوؤں کے سینے پر سانپ لوٹ گئے۔ بھارت ماتا کے ٹکڑے ہونے پر مہا سبھائی شعلے اگلنے لگے۔ پاکستان کو ایک ناکام ریاست بنانے کی سازشیں شروع ہو گئیں۔ ہندو اکثریت کے علاقوں میں رہنے والے مسلمانوں پر قیامت ڈھا دی گئی۔ فسادات پھوٹ پڑے۔ لاکھوں مسلمانوں کو پاکستان کی طرف دھکیل دیا گیا۔

کچھ لوگ تو اپنی مرضی سے پاکستان آنا چاہتے تھے لیکن مسلمانوں کی اکثریت کو ہجرت پر مجبور کر دیا گیا۔ لیکن جس طرح ان کو ہجرت پر مجبور کیا گیا۔ ان پر مظالم توڑے گئے۔ قتل عام کیا گیا۔ عصمتیں لوٹی گئیں۔ بچوں کو نیزوں کی انی پر مارا گیا۔ اس وحشت و بربریت پر شیطان بھی کانپ اٹھا ہوگا۔ لیکن یہ سب اس لئے کیا گیا تھا کہ مسلمان خوف زدہ ہو کہ پاکستان کا رخ کریں اور یہ نوزائیدہ مملکت لاکھوں مہاجرین کا بوجھ برداشت نہ کرتے ہوئے سنبھلنے سے پہلے ہی گر پڑے۔ اور اکھنڈ بھارت کا خواب پورا ہو جائے۔

بھارتی قیادت نے مہاجرین کے مسئلہ میں الجھی ہوئی پاکستانی حکومت کو مزید کمزور کرنے کے لئے پاکستان کے طے شدہ اثاثے روک لئے۔ حیدرآباد دکن کی حکومت نے پاکستان سے ایک معاہدہ کے تحت قرضہ فراہم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن بھارتی حکومت نے وہ سرکاری تمسکات منسوخ کر دیئے جن کی صورت میں پاکستان کو یہ قرضہ فراہم کیا جانا تھا۔ ریاست جونا گڑھ پر قبضہ کر لیا کہ اس کے حکمران نے پاکستان سے ادغام کا اعلان کر دیا تھا۔ خوشحال ریاست جونا گڑھ پاکستان کی مالی اعانت کر سکتی تھی۔ چنانچہ یہ راستہ بھی بند کر دیا گیا۔ اس کے لئے موقف اختیار کیا گیا کہ ریاست کی آبادی کی اکثریت ہندو ہے اور وہ پاکستان کے ساتھ نہیں بھارت کے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔ ریاست جموں و کشمیر کو قائداعظم پاکستان کی شہ رگ قرار دے چکے تھے۔ اس شہ رگ پر اپنا قبضہ جمانے کے لئے اپنے ہی سابقہ موقف کی نفی کرتے ہوئے کہا گیا کہ ریاست جموں و کشمیر کی آبادی کی اکثریت تو مسلمان ہے لیکن کشمیر کے ڈوگرہ راجہ ہری سنگھ نے بھارت کے ساتھ الحاق کا فیصلہ اور اعلان کر دیا ہے چنانچہ اب یہ بھارت کا اٹوٹ انگ ہے۔

یہ سبھی اقدامات پاکستان کو مفلوج، ناکام اور نااہل ریاست بنانے کے لئے تھے تاکہ بھارت ماتا کا تقدس بحال کرنے کے لئے پاکستان کا وجود ختم کیا جا سکے۔ پاکستان کو ختم کرنے یا کم از کم زک پہنچانے کا وہ کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ پنجاب کے دریاؤں پر قبضہ' گوادر حاصل کرنے کی کوشش' رن کچھ ہتھیانے کی کوشش، جنگ ستمبر میں بین الاقوامی سرحدیں پامال کر کے لاہور اور سیالکوٹ پر قبضہ کی کوشش، مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنانا، بلوچستان میں گڑبڑ وغیرہ۔ سازشوں اور مذموم ہتھکنڈوں کا ایک تسلسل ہے کہ ختم ہونے میں نہیں آرہا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جنگ ستمبر

کچھ یادیں کچھ باتیں

چھ ستمبر 65 کے روز معمول کے مطابق میں صبح نو بجے کے قریب اپنی بک شاپ (کلاسیک، چوک ریگل) شاہراہ قائداعظم پہنچا۔ زندگی معمول پہ تھی۔ سڑک پہ اکا دکا گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ شاہراہ قائداعظم ابھی نیم خوابیدہ تھی۔ یہاں ہمیشہ زندگی دس بجے کے بعد انگڑائی لے کر بیدار ہوتی ہے اور پھر آجکل کی طرح گاڑیوں کا اژدھام بھی نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ مال ابھی نیم بیداری کی کیفیت میں تھا۔ زیادہ تر دکانیں ابھی بند تھیں۔ کبھی کوئی گاڑی ہارن بجاتی ہوئی ماحول کی کسلمندی دور کرنے کی کوشش میں گذرتی ہوئی نظر آتی۔ دور دور تک کسی غیر معمولی صورت حال کے آثار نہیں تھے۔ میں ابھی ترتیب میں نہیں آیا تھا کہ ہمارے پڑوسی چودھری صاحب بوکھلائے ہوئے وارد ہوئے اور سر پر ہاتھ رکھ فرش پہ آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئے۔ میں نے حیرت سے پوچھا۔ کیوں چودھری صاحب خیریت ہے؟ وہ جیسے چونک کر بولے...... تمہیں کچھ نہیں معلوم۔ بھارت نے صبح صبح لاہور پر حملہ کر دیا ہے۔ جنگ چھڑ گئی ہے۔ واہگہ کی سرحد پر گھمسان کا رن پڑا ہے۔ اللہ جانے کیا ہوگا؟

کشمیر کے محاذ پر گذشتہ کئی دنوں سے لڑائی اور آزاد کشمیر کی فوجوں کے ساتھ پاک فوج کی پیش قدمی کی خبریں تو ہم لوگ سن رہے تھے لیکن لاہور پہ حملے کی خبر واقعی چونکانے والی تھی۔ کشمیر ایک تنازعہ تھا۔ وہاں جھڑپیں کچھ اور بات تھی۔ لیکن واہگہ پاکستان کی بین الاقوامی سرحد ہے۔ یہاں حملہ کھلی جارحیت تھی۔ لیکن مجھے اس میں سراسیمہ ہونے والی کوئی بات محسوس نہ ہو رہی تھی۔ میں نے چودہری صاحب کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ دیکھیں سب کچھ معمول کے مطابق ہے۔ آپ کیوں حواس باختہ ہو رہے ہیں۔

چوہدری صاحب میرے اطمینان پہ جیسے چراغ پا ہو گئے۔ بھڑک کر بولے۔ جنگ تو جنگ ہوتی ہے۔ اس میں تباہی اور بربادی کے سوا کیا ہوتا ہے۔ معمول کے مطابق کچھ بھی نہیں۔ سنا ہے بھارت نے بہت بڑا حملہ کیا ہے۔ وہ رن کچھ اور کشمیر کا بدلہ لاہور میں لینا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چاہتا ہے۔ ہماری فوجیں صبح سے واہگہ کی طرف جارہی ہیں۔ صدر ایوب قوم سے خطاب کرنے والے ہیں۔ کیا یہ سب کچھ معمول کے مطابق ہے؟ اگر دشمن کا قبضہ لاہور پہ ہو گیا تو ہمارا کیا بنے گا؟ چودھری صاحب نہ جانے کیا اول فول ارشاد فرمائے جارہے تھے۔ میں جھپٹ کر کاؤنٹر پہ پڑے اخبارات کی طرف لپکا لیکن اخبارات میں کشمیر کے محاذ پر خبروں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ اخبارات کو چھوڑ کر میں ٹیلیفون کی طرف متوجہ ہوا۔ دو تین اخبارات کے دفاتر میں فون کرنے کی کوشش کی لیکن لائنیں انگیج مل رہی تھیں۔ ریڈیو آن کیا تو

اے خاصہ خاسان رسل وقت دُعا ہے...... نشر ہو رہا تھا۔

میں چودھری صاحب کی طرف متوجہ ہوا۔ ”چودھری صاحب خوف و ہراس پھیلانے والی باتیں مت کریں۔ دیکھتے ہیں کہ اصل صورت حال کیا ہے۔ ابھی سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ اگر واقعی حملہ ہو گیا ہے تو اللہ مالک ہے۔ قوموں پہ ایسے وقت آیا ہی کرتے ہیں۔ بھارتی فوج اگر حملہ آور ہوئی ہے تو ہماری فوجیں بھی تو بے خبر نہیں ہوں گی۔ لیکن چودھری صاحب مسلسل مضطرب تھے۔

اب دوکان پہ گاہک بھی آنا شروع ہو گئے تھے۔ جو بھی آتا جنگ کے بارے میں استفسار کرتا۔ دو ایک احباب ایسے بھی آئے جو بہت باخبر بن رہے تھے۔ باہر سڑک پہ گزرنے والوں کی زبانوں پر اب ایک ہی بات تھی۔ ظاہر ہے جنگ کی خبر جنگل کی آگ سے کم تو نہیں تھی۔ لیکن صحیح صورت حال معلوم ہونے میں نہیں آرہی تھی۔ گھر پہ اس روز میں صبح سات بجے کی خبریں ریڈیو پہ نہیں سن پایا تھا۔ بچوں کو سکول پہنچانے کے بعد ناشتہ کیا اور شاپ پہ آ گیا تھا۔ تب تک کہیں کوئی غیر معمولی کیفیت دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ گیارہ بجے کے قریب فضا میں جنگی جہازوں کی آواز گونجنے لگی۔ میں دکان سے باہر نکلا۔ سب لوگوں کی نظریں آسمان کی طرف تھیں۔ دو جہاز فضا میں تیزی سے گزرتے ہوئے نظر آئے۔ پھر فضا میں فائرنگ اور دھماکوں کی آوازیں ابھریں۔ چودھری صاحب کی حالت بگڑنے لگی۔ اب میرے لئے چودھری صاحب کو سنبھالنا ایک مسئلہ بن گیا۔ اتنے میں باہر ایک گاڑی رکی۔ ہمارے ایک دوست آ گئے۔ چودھری صاحب سے ان کی بے تکلفی تھی۔ چنانچہ وہ چودہری

صاحب کو اطمینان دلاتے ہوئے باتوں میں مصروف ہو گئے۔ میں نے پھر ٹیلیفون کا ڈائل گھمانا شروع کر دیا۔ لیکن ریڈیو پاکستان یا اخبارات میں سے کسی کی لائن نہ مل سکی۔ اتنے میں کسی اخبار کا ضمیمہ آ گیا۔ بھارت نے علی الصبح واہگہ کے بارڈر پہ حملہ کر دیا۔ آخری خبریں آنے تک پاک فوج نے بھارتی فوج کو بی آر بی نہر پہ روک رکھا تھا۔ ہنگامی حالت کا اعلان ہو گیا تھا اور صدر مملکت کی طرف سے بارہ بجے ریڈیو پہ قوم سے خطاب کا اعلان بھی موجود تھا۔ اب ریڈیو پاکستان بھی وقت دعا کے دور سے نکل کر...... وقت شہادت ہے آیا جیسے جنگی ترانے نشر کر رہا تھا۔

جہاں جہاں ریڈیو سیٹ موجود تھے وہاں لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے۔ سب کو ”جنرل ایوب“ کی تقریر کا انتظار تھا۔ ہماری شاپ پہ بھی لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ ریڈیو پاکستان پہ قومی ترانہ بجایا گیا اور پھر صدر مملکت جنرل ایوب خان کی بھاری بھرکم آواز گونجی۔ عزیز ہم وطنو! دشمن کو معلوم نہیں کہ اس نے کس قوم کو للکارا ہے۔ انہوں نے ہم وطنوں سے سیسہ پلائی دیوار بن جانے کی درخواست کی۔ صدر مملکت کی تقریر نے لوگوں کا جوش و جذبہ آسمان پہ پہنچا دیا۔ واقعی لوگوں میں ایک نئی روح پھونک دی۔ لگتا تھا کہ ہر شہری جہاد کے جذبہ سے سرشار ہو چکا ہے۔

شام کو پتہ چلا کہ عام شہریوں بلکہ کہنا چاہیے لاہوریوں کی ایک بہت بڑی تعداد واہگہ کی سڑک پہ رواں دواں رہی۔ کسی کے پاس ڈھنگ کا ہتھیار نہیں تھا لیکن وہ ہندوؤں کا مقابلہ کرنے کے جوش میں نکل کھڑے ہوئے تھے۔ پاک فوج انہیں شالامار باغ کے قریب روک رہی تھی کہ محاذ جنگ پہ لڑنا آپ لوگوں کا کام نہیں۔ یہ کام فوج کا ہے اور وہ پوری لگن سے اسے نبھا رہی ہے۔ آپ لوگ اپنے گھروں میں جائیں اور فوج کی اس طرح مدد کریں کہ شہری زندگی میں کوئی خلل نہ آئے۔ سب کچھ معلوم کے مطابق چلتا رہے۔

صدر مملکت کی تقریر کے بعد ریڈیو سیٹوں کے سامنے سے ہجوم منتشر ہو گیا لیکن اب جگہ جگہ لوگ ٹکڑیوں میں بے صورت حال پہ تبصرے کر رہے تھے۔ مال روڈ اب پوری طرح آباد تھا۔ ٹریفک رواں تھی۔ ٹریفک میں اضافے کی وجہ سکول کالج بند کر دیئے جانے کی اطلاع تھی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کچھ لوگ بچوں کو سکولوں سے لینے کیلئے جا رہے تھے۔ کچھ لیکر واپس آ رہے تھے۔ لیکن اس ٹریفک میں کبھی کبھی سامان سے لدی گاڑیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ ان سب کا رخ راوی کے پل کی طرف تھا اور یہ پوش علاقے کے آسودہ حال لوگ تھے جو جنگ کا نام سن کر محفوظ مقامات کی طرف دوڑ لگائے ہوئے تھے۔ غریب اور متوسط طبقہ اطمینان سے اپنے معمولات میں مصروف تھا لیکن وطن عزیز نے جنہیں عزت دولت اور منصب دیا تھا وہ وطن پہ آزمائش کی گھڑی آتے ہی اپنی جانیں بچانے کی فکر میں تھے۔ عام آدمی تو آج حب الوطنی کے گہرے جذبے سے سرشار تھا۔ فضا میں جنگی طیاروں کی آوازیں سن کر یہ عام آدمی یوں گلیوں سڑکوں پہ نظارہ کرنے نکل آتا جیسے فضائی حملہ نہیں ہوا فضا میں پاکستان اور بھارت کے درمیان پتنگوں کا پیچ ہو رہا ہے۔ کسی کو اس بات کا اندیشہ یا وسوسہ نہیں تھا کہ جنگی طیارے انہیں کوئی کھیل دکھانے نہیں آتش و آہن کا ہلاکت خیز منظر دکھانے کیلئے حملہ آور ہو رہے ہیں۔ لیکن لاہورئیے تو یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ سبز ہلالی پرچم والے پاکستانی طیارے بھارتی حملہ آوروں کی کیا درگت بناتے ہیں۔ وہ یہ سب کچھ براہ راست اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے تھے۔

6 ستمبر کے روز ابھی خندقیں نہیں کھودی گئی تھیں لیکن اگلے روز جب یہ کام سول ڈیفنس والوں نے شروع کیا تو شہریوں نے پورے جنگی جذبے سے یہ خندقیں کھودنے میں ان کی مدد کی لیکن جنگ کے پورے دنوں میں شائد ہی کبھی کسی نے کوئی خندق فضائی حملہ کے وقت استعمال کی ہو۔ ان کا استعمال البتہ دیگر فوری ضروریات کے تحت ہوتا رہا۔

دوپہر ایک بجے کے قریب خطرے کے سائرن بجنے لگے۔ اس بار سات آٹھ بھارتی طیارے لاہور کی فضا میں داخل ہوئے۔ پاکستانی سیبر طیاروں نے انہیں گھیر رکھا تھا۔ لاہور کے شہریوں نے زبردست ڈگ فائٹ دیکھی۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ایک جہاز سے دھواں نکلنا شروع ہوا اور وہ جہاز لڑکھڑاتا ہوا مغرب کی سمت کہیں جا گرا۔ پھر کہیں دور سے زوردار دھماکہ ہوا۔ فضا میں تڑتڑاہٹ کی آوازیں طیاروں کے دور جانے کے ساتھ ساتھ معدوم ہو گئیں۔

سہ پہر کے وقت لاہور کے ادیب شاعر اور صحافی پاک ٹی ہاؤس میں جمع ہو گئے۔ بھارتی جارحیت کی پرزور مذمت کی گئی۔ وطن کیلئے اپنے قلم وقف کرنے کا عہد ہوا۔ ادیبوں

کے اس اجتماع نے جنگ کے دوران قلمی محاذ پر دکھائی جانے والی تاریخ ساز کارکردگی کی بنیاد رکھی۔ دفاع وطن کیلئے لاہور کے شاعروں اور ادیبوں نے جو کردار ادا کیا اس کی مثال شائد کسی قوم کے فنکار آج تک پیش نہیں کر سکے۔ فنکاروں کیلئے دفاع وطن کا محاذ پرنٹ میڈیا اور ریڈیو پاکستان تھا۔ انہوں نے یہاں اپنے جوہر، حب الوطنی کے پورے جوش و خروش کے ساتھ دکھانا شروع کئے۔

ٹیلی ویژن کی نشریات کا دائرہ ان دنوں بہت محدود تھا۔ چنانچہ عوام تک پہنچنے کا موثر ترین ذریعہ ریڈیو پاکستان ہی تھا۔ اس کے کارپردازان نے بھی ایک لحہ کی غفلت کئے بغیر اپنے فرائض ادا کرنا شروع کئے۔ خبروں کے بلیٹن عوام کو جنگ کی تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کر رہے تھے تو دیگر پروگرام جذبہ جہاد کو اوج ثریا پہ پہنچا رہے تھے۔ ریڈیو پاکستان پہ موسیقاروں، مغنیوں اور براڈ کاسٹروں نے ڈیرے ڈال دیئے۔ ہر فرد اپنے شعبہ میں وطن کی خدمت کے جذبے سے سرشار تھا۔ ایسے ایسے ملی نغمے اور فیچر نشر ہوئے جس نے قوم کو سیسہ پلائی دیوار بننے میں پوری پوری مدد کی۔

6 ستمبر نے زندگی کے تمام شعبوں میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ تمام اختلافات ختم ہو گئے۔ بس ایک جذبہ اور ایک خواہش تھی کہ دشمن کو عبرت ناک سزا دی جائے۔ ریڈیو پاکستان لاہور کے یوں تو سبھی پروگرام مقبول ہوئے لیکن خصوصی طور پر دو پروگرام مقبولیت کی چوٹی پر تھے۔ ان میں سے ایک نصیر انور کا ندائے حق اور دوسرا اجمل حسین کا شہرنامہ۔ جنگ کے دوران اور کچھ عرصہ بعد تک بھی ندائے حق میں میاں جی اور مہاشے کے کرداروں کی گفتگو ہندو ذہنیت کے "ڈھول کا پول" کھولتی رہی۔ سرحد پار اس پروگرام کی چبھن واضح طور پر محسوس کی جاتی تھی۔

نصیر انور کا معمول تھا کہ وہ اپنے گھر واقع نسبت روڈ سے نکلتے اور سیدھے کلاسیک پہ میرے پاس تشریف لاتے۔ حالات حاضرہ پہ گفتگو ہوتی۔ ندائے حق کے نئے نشریہ پہ بات ہوتی۔ پھر وہ پاک ٹی ہاؤس چلے جاتے۔ ان دونوں مقامات پہ جنگ ستمبر کے دوران بھرپور محفلیں جمنا شروع ہو گئیں۔ تازہ ترین صورت حال کو سامنے رکھا جاتا۔ اس کے بعد تمثیل ضبط تحریر میں لائی جاتی۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ تمثیل ابھی زیر تحریر ہے اور پروگرام آن

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایئر ہے۔ جو سلپ مکمل ہوتی ہے وہ "میاں جی اور مہاشے" کو پہنچ رہی ہے۔ آخری سلپ ختم ہونے سے پہلے نئی سلپ فراہم کردی جاتی۔ "لائیو براڈ کاسٹ" میں غالباً یہ پہلا پروگرام تھا جو ساتھ ہی ساتھ تحریر بھی ہوا۔ گویا یہ فی البدیہہ پروگرام تھا۔

ایک صبح اپنے ساتھ عجیب منظر لائی۔ محمد صفدر میر مرحوم جو ترقی پسند تحریک کے سربلند اور باوقار شخصیت تھے، ٹرک پر سوار، ٹرک اندرون شہر کشمیری بازار میں رواں دواں تھا۔ لاؤڈ سپیکر پر صفدر میر اپنی تازہ نظمیں سنا رہے تھے۔

علی حیدر علی حیدر

چلو واہگہ کی سرحد پر

لہو جو سرحد پر بہہ رہا ہے
ہم اُس لہو کا خراج لیں گے!

بہت بڑا ہجوم ٹرک کے ساتھ ساتھ ایک ایک مصرعہ بار بار دہرا رہا تھا یوں اس ٹرک نے پورے شہر کا چکر لگایا اور قوم میں جوش و جذبہ کی نئی روح پھونک دی ادیبوں کی طرف سے محمد صفدر میر کی، عوام کے ساتھ یک جہتی کی یہ ایسی مثال ہے جس کی تاریخ عالم میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔

6 ستمبر 65ء تاریخ پاکستان کا وہ دن ہے جس نے 14 اگست کے بعد پہلی دفعہ منظم پاکستانیت دیکھی۔ جنگ ستمبر نے پہلی اور آخری مرتبہ اس غیر منظم ہجوم کو ایک قوم کے روپ میں دیکھا۔ بنگالی، پنجابی، سندھی، بلوچی، سرحدی کی کوئی تفریق نہ تھی۔ سب ایک وحدت میں نظر آئے۔ انہوں نے حالات کا مقابلہ "پاکستانی قوم" کے طور پر کیا۔

6 ستمبر 65ء کی شام کو ابلاغ کی دنیا میں معتبر اور مستند سمجھے جانے والے ایک عالمی ادارے "بی بی سی" نے بے پر کی اڑا دی۔ اس نے دنیا بھر میں خبر پھیلا دی کہ بھارت نے لاہور پہ قبضہ کرلیا ہے۔ ہم لوگ لاہور میں بیٹھے تھے۔ کہیں کسی دور دراز مقام پہ ہوتے تو "بی بی سی" کی خبر پر یقین نہ کرلینے کا سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ اور ہوا بھی ایسا۔ دوسرے شہروں

اور ملکوں میں بسنے والے پاکستانیوں کا حال یہ خبر سن کر جو ہوا ہوگا اُس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ بی بی سی کی خبر کا پس منظر یہ تھا کہ لاہور پہ حملے کا حکم دیکر بھارتی فوج کے سربراہ جنرل چودھری نے اپنی فوجی برتری کے زعم میں اعلان کیا تھا کہ آج شام کو میں اپنے دوستوں کے ساتھ لاہور جم خانہ میں جشن فتح مناؤں گا۔ بی بی سی کے نمائندے کے مطابق ایسا نہ ہونے کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ پھر ایک اور واقعہ نے جنرل چودھری کے دعوے پر جیسے مہر تصدیق ثبت کردی۔ ہوا یہ کہ جب 6 ستمبر کی رات کے آخری پہر جب بھارتی فوجی کسی اعلان جنگ کے بغیر خاموشی سے سرحد پار آئے تو میدان صاف تھا۔ کوئی مزاحمت نہیں تھی۔ ان کی ایک ایڈوانس پارٹی سرحدی گاؤں تک آ گئی۔ لیکن مزاحمت نہ پاکر ٹھٹک گئی کہ یہ خاموشی کوئی جنگی چال نہ ہو۔ وہاں لاہور اومنی بس سروس کی ایک ڈبل ڈیکر کھڑی تھی۔ بھارتی فوجی واپس جاتے ہوئے یہ بس دھکیلتے ہوئے اپنی سرحدی چوکی اٹاری پہ لے گئے۔ بھارتی فوجی افسروں نے لاہور پہ قبضہ کی اس نوید اور دلیل کو امرتسر پہنچا دیا۔ جہاں دنیا کے سامنے اسے ایک ثبوت کے طور پر پیش کردیا۔ ادھر بھارتی فوجوں کی آہٹ پاکر پاک فوج لاہور چھاؤنی سے نکلی اور دشمن کو بی آر بی نہر پہ جالیا۔ دشمن کو سختی سے وہیں روک کر نہر کا پل توڑ دیا گیا۔ پھر اگلے پندرہ دن تک جنرل چودھری کے سورماؤں کا بس نہ چل سکا کہ وہ لاہور پہ قبضہ کرکے اپنے سینا پتی کی دعوت کا انتظام کرسکیں۔

جھوٹے دعووں کی حد تک تو بہت کچھ ہوا۔ جنگ کے دوران بھارتی ذرائع ابلاغ سے کبھی دعوی کیا گیا کہ لاہور ایئر پورٹ پر بھارتی سینا نے قبضہ کرلیا ہے اور امریکیوں نے اسے استعمال کرنے کیلئے بھارت سرکار سے اجازت دینے کی درخواست کی ہے۔ کبھی کہا گیا کہ بھارتی فوجی لاہور شہر سے صرف چھ میل دور ڈیرے ڈالے بیٹھے ہیں۔ ایک بات مسلسل دہرائی جاتی رہی کہ لاہور خالی ہو چکا ہے۔ شہری خوف زدہ ہوکر محفوظ مقامات کو چلے گئے ہیں۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ آکاش وانی (بھارتی ریڈیو سروس کا سرکاری نام) کے جھوٹ کے پول کھلتے رہے۔

ادھر لاہور ہی کیا پورے پاکستان کے باسیوں کا مورال آسمان کو چھو رہا تھا۔ لاہور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے جانے والے مسافروں کی تعداد کم اور آنے والوں کی زیادہ ہوتی تھی۔ عین جنگ کے دنوں میں بھی سماجی تقریبات جاری تھیں۔ اس جنگ نے ایک نئی پاکستانی قوم کو جنم دیا جو منظم تھی منضبط تھی۔ جس میں اتحاد تھا ایک جہتی تھی۔ صوبائیت کا نام ونشان نہیں تھا۔ لاہور ریڈیو سے بنگالی میں خبریں نشر ہو رہی تھیں اور ڈھاکہ میں لوگ پنجابی ملی ترانے گاتے ہوئے دیکھنے میں آتے تھے۔ سیاسی جماعتوں نے بھی اختلافات بالائے طاق رکھ کر دشمن کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بننے کا عملی مظاہرہ کیا۔

جنگ کے دنوں میں دنیا بھر میں لوگ خوفزدہ ہو کر سامان خورد ونوش ذخیرہ کر لیتے ہیں۔ تاجر چیزوں کی قیمتیں بڑھا دیتے ہیں۔ لیکن پاکستان میں ایسا نہ ہوا۔ نہ ذخیرہ اندوزی ہوئی نہ روزمرہ استعمال کی اشیاء میں گرانی آئی۔ اخلاقی سطح اتنی بلند ہوئی کہ جھگڑے جھیلے، چوری چکاری یوں مفقود ہوئے جیسے کبھی اس معاشرے میں پائے نہ جاتے تھے۔ انسانی ہمدردی کا ایسا پر جوش مظاہرہ دیکھنے میں آیا کہ دنیا حیران رہ گئی۔ خون کے عطیات دینے والوں کی روزانہ لمبی لمبی قطاریں ختم ہونے میں نہ آتی تھیں۔ فوجی بھائیوں اور جنگ سے متاثرہ علاقوں کے لوگوں کے لئے عطیات کے ڈھیر لگ جاتے۔ دفاعی فنڈ میں حصہ لینے والوں کا جوش وخروش بھی دیدنی تھا۔ سرکاری وغیر سرکاری ملازمین نے اپنے پوری پوری تنخواہیں دفاعی فنڈ میں دے دیں۔ عورتوں نے اپنے زیور اتار کر جمع کرا دیئے۔ سڑکوں اور گلیوں سے گداگر یوں غائب ہوئے جیسے کبھی ہوتے ہی نہیں تھے۔

رات دن ہوائی حملے کے سائرن، بمباری اور توپوں کی گھن گرج عوام کے اعصاب کو ذرہ برابر متاثر نہ کر سکی۔ دو موریہ پل کے اس پار نولکھا پولیس سٹیشن سے تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلہ پر بھارتی فضائیہ نے دو بم گرائے۔ یہ بم دراصل ریلوے اسٹیشن کو نشانہ بنانے کیلئے گرائے جانے تھے لیکن اینٹی ایئر کرافٹ گنوں کی فائرنگ سے بچتے ہوئے بھارتی سورما انہیں جہاں بھی جی آیا گرا کر چلے گئے۔ عمارات کو زیادہ نقصان پہنچا۔ جانی نقصان توقع سے بہت کم تھا۔ اب اگر کوئی کمزور اعصاب کی قوم ہوتی تو اسٹیشن کے اردگرد کا علاقہ خالی ہو جاتا کہ نہ جانے آئندہ حملہ میں کون نشانہ بن جائے لیکن اہم تنصیبات اور مقامات

کے اردگرد پائی جانے والی بستیوں کے لوگ اپنی اپنی جگہ پڑے رہے۔

راوی پل پہ ایک حملہ کے وقت میں قریبی سٹیل مل میں موجود تھا۔ ان دنوں دریائے راوی پہ ایک ہی پل تھا جسے اب پرانا پل کہتے ہیں۔ دشمن نے اس پل کو تباہ کر کے لاہور کا رابطہ جرنیلی سڑک سے کاٹنا چاہا۔ خطرے کا سائرن ہوا تو ہم سٹیل مل کی پانی کی ٹینکی کے نیچے سائے میں کھڑے تھے۔ اتنے میں تین بھارتی طیارے منڈلانے لگے۔ وہ پل کو نشانہ بنانا چاہتے تھے لیکن پاک فوج کی اینٹی ایئر کرافٹ گنوں کی فائرنگ انہیں قریب نہیں آنے دے رہی تھی۔ چند منٹ کی بیکار جدوجہد کے بعد انہوں نے کچھ فاصلہ پر اپنے بم ریت میں گرائے اور دم دبا کر بھاگ گئے۔ اس فائرنگ کی زد سے میں بھی بال بال بچا لیکن اس وقت ان باتوں کی پرواہ کسے تھی۔

جنگ کے دنوں میں لوگوں کی محبوب شخصیات میں صدر مملکت ایوب خان اور وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو تھے۔ صدر ایوب کی چھ ستمبر کی تقریر اور ذوالفقار علی بھٹو کی اقوام متحدہ میں ہزار سال تک جنگ جاری رکھنے کی للکار نے انہیں مقبولیت کے آسمان پر بٹھا دیا تھا۔

بین الاقوامی برادری کا طرز عمل بھی لوگوں کے زیر بحث رہتا۔ چین، انڈونیشیا اور ایران کی برادرانہ حمایت وامداد زبان زد خاص عام تھی۔ ستمبر 65ء کے دن رات حقیقی طور پر پاکستانی قوم کے دن رات تھے۔ اس قوم کی رگوں میں ایک جذبہ اور سرشاری تھی۔ لیکن افسوس یہ صورت حال جو تصوراتی یا افسانوی نہیں تھی۔ ہماری قیادت اسے جنگ کے بعد قوم کا مزاج بنانے میں ناکام رہی۔ یہ مثالی دور جنگ ستمبر کے اثرات ختم ہونے کے بعد کچھ ہی عرصہ میں یوں تحلیل ہوا جیسے کبھی آیا ہی نہیں تھا۔ شائد اسی لئے شاعر مشرق نے کہا تھا۔

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

کیا جنگ کے بغیر ہماری قوم اپنی اصلاح کیلئے جنگی جذبہ پیدا نہیں کر سکتی۔ کاش ایسا ہو جائے۔ پاکستان کیلئے اپنی نئی نسلوں کے مستقبل کیلئے۔ آمین

ستمبر 2001ء

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مشرقی پاکستان...... بھارتی استبداد کا چوتھا شکار

16 دسمبر 1971ء کو سقوط ڈھاکہ کے ساتھ ہی مشرقی پاکستان ماضی کی داستان بن گیا۔ یہ داستان قرارداد پاکستان کے ساتھ شروع ہوئی تھی جسے 1940 میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور میں شیر بنگال مولوی فضل الحق نے پیش کیا تھا۔ قائداعظم کی قیادت میں تحریک پاکستان شروع ہوئی اور سات سال کے اندر برصغیر میں مسلمانوں کے الگ وطن کا خواب حقیقت بن گیا۔ دنیا کی اس پہلی اسلامی نظریاتی مملکت کا ایک حصہ مشرقی پاکستان تھا۔

قیام پاکستان کے 23 سال بعد مشرقی پاکستان الگ ہوگیا۔ پلٹن میدان میں یہ داستان خونچکاں انجام سے دوچار ہوئی۔ پاکستان کو دولخت کرنے میں اپنوں کی غلطیاں اور غیروں کی سازشیں سبھی شامل تھیں۔ اس ضمن میں بھارت نے بھیانک کردار ادا کیا۔ یہ درست ہے کہ پاکستان کے دونوں حصوں کے درمیان ایک ہزار میل کا فاصلہ تھا اور اسلام کے مقدس رشتے کے سوا کوئی بھی قدر مشترک نہیں تھی۔ یہ بھی درست ہے کہ قیام پاکستان کے بعد مرکزی حکومتوں نے مغربی پاکستان کو مشرقی پاکستان پر اہمیت دی یا اس کا تاثر پیدا ہوا۔ مشرقی پاکستان کے لوگوں کو یقین دلا دیا گیا کہ مغربی پاکستان نے ان کو نوآبادی بنا رکھا ہے۔ یہ پراپیگنڈہ وہاں زبان زد خاص و عام تھا کہ مشرقی پاکستان کا زرمبادلہ مغربی پاکستان ہڑپ کر جاتا ہے۔ چنانچہ مشرقی پاکستان میں احساس محرومی پیدا کر دیا گیا لیکن علیحدگی کے انتہائی قدم کو بھارتی سازشوں نے ممکن بنایا۔

دونوں حصوں کی سماجی ساخت اور سیاسی سوچ بھی مختلف تھی۔ مغربی پاکستان جاگیرداری کی لپیٹ میں تھا۔ یہاں وڈیرے' خان' ملک اور چودھری سیاست دان تھے۔ ان کا مزاج مشرقی پاکستان کے سیاستدانوں سے مختلف تھا۔ جو جاگیرداری تو کیا لوئر مڈل کلاس سے تعلق رکھتے ہیں۔ میرے نزدیک مغائرت پیدا کرنے والے بنیادی عوامل میں سے اہم ترین یہی ایک تھا۔ دونوں حصوں کی قیادتوں کے مفادات یا نقطہ ہائے نظر ہی مختلف تھے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مغربی پاکستان کے سیاستدان خائف تھے کہ مشرقی پاکستان کی قیادت اپنے صوبہ کی اکثریت کی بنیاد پر اقتدار کے ایوانوں میں یا کم از کم مرکزی قانون ساز ادارے میں غلبہ نہ حاصل کر لے۔ چنانچہ ون یونٹ اور پیریٹی جیسے انتظامات کئے گئے۔

مغربی پاکستان کے لئے منافرات پیدا کرنے کی سازشیں بھارت نے روز اول سے ہی تیار کرنا شروع کر دی تھیں۔ بھارت نے مشرقی پاکستان میں موجود ہندو تاجروں، ٹیچروں، صنعتکاروں اور سرمایہ داروں کو استعمال کرنا شروع کر دیا۔ ہندو تو مغربی پاکستان میں بھی موجود تھے۔ لیکن مشرقی پاکستان کے ہندوؤں کی طرح نہ تو زیادہ تعداد میں تھے اور نہ ان کی طرح اقتصادی اور سیاسی زندگی پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ ہندو مشرقی پاکستان میں اشیائے خوردنی کی قلت پیدا کئے رکھتے، گندم اور چاول وغیرہ مغربی بنگال کو سمگل کر دیتے اور پراپیگنڈہ کیا جاتا کہ مغربی پاکستان میں چیزیں وافر اور سستی ہیں۔ ہمارے خون پسینہ سے مغربی پاکستان کے لوگ عیش کر رہے ہیں۔ انہیں نوآبادی بنا دیا گیا۔

مشرقی پاکستان میں غربت کے اپنے اسباب تھے۔ مغربی پاکستان میں دودھ اور شہد کی نہریں نہیں بہہ رہی تھیں۔ پچانوے فیصد سے زیادہ لوگ یہاں بھی غربت کی چکی میں پس رہے تھے۔ دونوں صوبوں کے عوام پر معاشی دباؤ ذرا مختلف تھا۔ مشرقی پاکستان میں شرح پیدائش بہت زیادہ تھی ہر خاندان میں افراد کی اوسط مغربی پاکستان سے زیادہ تھی۔ چنانچہ ان کی ضرورت زیادہ تھیں۔ روزگار اور معاش کے ذرائع تو دونوں طرف محدود تھے لیکن بنگال میں آبادی کی اکثریت معاشی دباؤ کو سنگین تر بنا رہی تھی۔ وہاں تقریباً ہر سال آنے والے سیلاب معاشی نشوونما کو روکے ہوئے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے مغربی پاکستان کی سیاسی قیادت یا مرکزی قیادتوں نے کبھی مشرقی پاکستان کے لوگوں کو یہ بتانے کی زحمت نہ کی کہ مغربی بازو مشرقی بازو کا کتنا بوجھ بانٹتا رہتا ہے۔ چنانچہ احساس محرومی بڑھتا رہا۔

مشرقی پاکستان میں لوگوں کو بتایا جاتا کہ ملازموں میں بنگالیوں کو آبادی میں اکثریت کے باوجود مناسب حصہ نہیں دیا جاتا۔ بیوروکریسی میں بنگالی آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ فوج میں بنگالیوں کا داخلہ بند ہے۔ اس طرح یہ تاثر گہرا کر دیا گیا کہ حکومت میں مغربی

پاکستانیوں کا عمل دخل زیادہ ہے اور وہ مشرقی پاکستان کو ایک نوآبادی سمجھ کر اس کا استحصال کر رہے ہیں۔ اس کے مصائب کا ذمہ دار مغربی پاکستان ہے۔ کاروبار، سیاست اور ملازمتوں میں اس کو بالادستی حاصل ہے۔ بھارتی حکومت اپنے ایجنٹوں کے ذریعے گمراہ کن اعداد و شمار پھیلا رہی تھی۔ حکومت سے ناراض مشرقی پاکستانی سیاست دان اور سیاسی کارکن بھی دانستہ یا نادانستہ طور پر اس پراپیگنڈہ مہم میں شریک تھے۔ عوامی لیگ مشرقی پاکستان میں مقبول جماعت تھی۔ بھارتی انٹیلی جنس ایجنٹوں نے اپنے تنخواہ دار ایجنٹ اس میں شامل کر رکھے تھے۔

صدر ایوب خان کے دور میں دونوں صوبوں میں اقتصادی ناہمواری دور کرنے کی پوری سنجیدگی سے کوششیں کی گئیں۔ مشرقی صوبہ میں ترقی کی رفتار بھی تیز ہوئی لیکن مرکزی حکومت وہاں بھارتی پراپیگنڈہ پر توجہ دینے میں کبھی سنجیدہ نہ ہوئی۔ تقسیم کے وقت مسلم افواج میں بنگالیوں کا حصہ صرف ایک فی صد تھا۔ ایوب خان کے دور میں 1968ء تک چار رجمنٹس تیار ہو چکی تھیں جن میں صرف بنگالی تھے۔ آبادی کے اعتبار سے مشرقی پاکستان کی نمائندگی فوج میں معمولی تھی لیکن اس کمی کا سبب خود بنگالیوں کا رجحان تھا۔ وہ فوج کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ اور احتجاج کی سیاست پسند کرتے تھے۔

دونوں بازوؤں کو اجنبی بنانے والا ایک اور عامل جنگ ستمبر میں ابھر کر سامنے آیا۔ جنگ شروع ہوتے ہی مشرقی پاکستان نہ صرف مغربی پاکستان بلکہ ساری دنیا سے کٹ کر رہ گیا۔ چنانچہ دونوں صوبوں کے درمیان فوجی رابطہ اور تعلق متاثر ہوا۔ قومی اسمبلی میں بتایا گیا کہ مشرقی پاکستان کا تحفظ چین نے کیا تھا بنگالیوں میں ایک نیا عدم تحفظ پیدا ہو گیا۔

مشرقی پاکستان کے عدم تحفظ اور محرومی کے احساس میں شدت پیدا کرنے کے بعد پاکستان کو دولخت کرنے کے منصوبہ کو آخری شکل دینے کیلئے اگرتلہ سازش تیار کی گئی۔ اس کا انکشاف 1967ء میں ہوا۔ وعدہ معاف گواہوں نے حلفاً بتایا کہ شیخ مجیب الرحمٰن اس سازش میں ستمبر 1964ء میں ہی ملوث ہو گیا تھا۔ اسی لئے پاکستان کو الگ کرنے کے لئے انقلابی تنظیم قائم کی گئی تھی۔ علیحدگی پسندوں اور بھارت کے نمائندوں کا اجلاس 12 جولائی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

1967 کواگرتلہ میں ہو۔ان سازشیوں کو دسمبر 1967ء میں گرفتار کرلیا گیا۔ان میں مجیب الرحمٰن بھی شامل تھا۔انکشاف ہوا کہ بھارت نے ہتھیار اور مالی امداد فراہم کرنے کے علاوہ مشرقی پاکستان میں منظم بغاوت کا وعدہ بھی کر رکھا تھا۔

مارچ 1969ء میں ایوب خان کی جگہ یحییٰ خان برسراقتدار آ گیا مجیب الرحمان کے خلاف غداری کے ٹھوس ثبوت ہونے کے باوجود یحییٰ خان نے اسے اپنا دست راست بنا لیا۔اسے حب الوطنی اور پاکستان دوستی کا سرٹیفکیٹ دے دیا گیا۔مغربی پاکستان کی پرانی سیاسی جماعتیں یحییٰ خان کے اشاروں پر ناچ رہی تھیں۔مجیب الرحمان نے کھلے بندوں اپنے پیغام کا پرچار شروع کر دیا۔لیکن عجیب ستم ظریفی تھی۔حکومت میں کوئی شخص مشرقی پاکستان کے حالات کا نوٹس نہیں لے رہا تھا۔مجیب الرحمٰن اپنی تقریروں میں مغربی پاکستان کے خلاف زہر اگل رہا تھا۔اس کا استدلال تھا کہ 1954ء میں لوگوں نے عوامی لیگ کو اقتدار میں بھیجا لیکن ظالموں نے اس کا تختہ الٹ دیا ہمارے پاس چھ نکات پر عمل درآمد کے علاوہ نجات کا کوئی راستہ نہیں۔مجیب الرحمٰن کے چھ نکات بنگالیوں کیلئے صحیفہ آسمانی بن گئے۔آنے والے انتخابات کے لئے عوامی لیگ نے اپنے چھ نکات کو انتخابی مہم بنا لیا۔

انتخابات ہوئے اور مشرقی پاکستان میں مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ سو فیصد کامیاب ہوگئی۔مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی کو اکثریت ملی۔لوگوں کا خیال تھا کہ جمہوریت کے لئے دو عوامی پارٹیاں قائم ہوگئی ہیں۔پاکستان اب ترقی خوشحالی کے راستے پر چل پڑے گا۔لیکن یحییٰ خان کے عزائم کچھ اور تھے۔وہ تو زندگی بھر پاکستان کا صدر رہنا چاہتا تھا۔انتخابات کے نتائج اس کی توقع اور منصوبے کے خلاف تھے۔

انتخابات کے بعد آئینی تقاضا تھا کہ یحییٰ خان اسمبلی کا اجلاس بلاتا۔قومی نمائندوں کو 120 دن کے اندر آزادانہ بحث کرنے اور آئین بنانے کا موقعہ دیا جاتا مگر اس نے ٹال مٹول سے کام لینا شروع کر دیا۔مشرقی پاکستان میں ردعمل طوفان بنتا جا رہا تھا۔خرابی بسیار کے بعد قومی اسمبلی کے اجلاس کا اعلان کیا گیا۔لیکن پس پردہ یحییٰ خان دوسرے انتظامات کر رہا تھا۔25 مارچ 1971ء کو یحییٰ خان نے اپنے انتظامات مکمل کر لئے۔مشرقی پاکستان میں

ملٹری ایکشن کا حکم دے دیا گیا۔مجیب الرحمٰن کو گرفتار کر لیا گیا۔دس مہینے تک مشرقی پاکستان آگ اور خون کی ہولی کھیلتا رہا۔بھارت دنیا کی توجہ اس طرف مبذول کراتا رہا۔لیکن یحییٰ خان نے تباہی کا جو راستہ اختیار کیا تھا اس پر چلتا رہا بھارت کو جب یقین ہو گیا کہ اسکی جارحانہ مداخلت کامیاب رہے گی تو اس نے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا۔مقامی آبادی پاکستان کی فوج کے خلاف تھی۔عوامی لیگ کی مکتی باہنی اور مجیب باہنی نے بھارتی فوج کا ساتھ دیا اور پاکستانی فوجی ایک ہاری ہوئی جنگ لڑتے رہے۔16 دسمبر 1971ء کو پلٹن میدان ڈھاکہ میں پاکستانی فوج نے ہتھیار ڈال دیئے۔

یحییٰ خان اپنا کام کر گیا۔پاکستان میں حکومت عوامی نمائندوں کو دے دی گئی۔مجیب الرحمٰن کامیاب ہو گیا۔راولپنڈی سے رہا ہونے کے بعد لندن اور نئی دہلی کے راستے وہ ڈھاکہ پہنچا۔اس نے لاکھوں افراد کے سامنے تسلیم کیا کہ میں کئی سال سے بنگلہ دیش بنانا چاہتا تھا۔آج میری کوشش کامیاب ہو گئی۔لیکن یہ اس کی کامیابی نہیں بھارت کی کامیابی تھی۔پاکستان دشمنی میں اس نے ایک کاری وار کیا تھا۔لیکن یہ آخری وار نہیں۔بھارت نے پاکستان دشمنی نہیں چھوڑی۔سوال صرف یہ ہے کہ کیا پاکستانی قوم نے اس تاریخی ہزیمت سے کچھ سیکھا؟ کیا اب بھارت قابل بھروسہ ہو گیا ہے؟؟

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بھارت۔ کتنا قریب، کتنا دور

27 مئی 2004ء

لاہور میں رات تیز ہوا پھر آندھی اور صبح صبح بارش نے مئی کا 27 واں دن انتہائی خوشگوار بنا دیا تھا۔ صبح آٹھ بجے فلیٹیز ہوٹل پہنچا۔ جانے پہچانے چہرے فلیٹیز پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔ بہت سے احباب کو ایک جگہ دیکھ کر اور زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے شناسا چہروں میں شامل ہو کر کانفرنس میں شرکت کا فیصلہ نہایت درست محسوس ہوا۔ ذوق نے کہا تھا۔ ہدم دیرینہ کا ملنا' ملاقات مسیحا و خضر سے بہتر ہے۔ آج ذوق کے شعر پہ انداز میں داد دینے کو جی چاہ رہا تھا۔

ساڑھے آٹھ بجے بسیں آ گئیں۔ TDCP کی یہ بسیں محض ایئر کنڈیشنڈ نہیں تھیں، مسافروں کی بھرپور آسائش کو پیش نظر رکھ کر بنائی گئی تھیں۔ ہلکی بارش اور ٹھنڈی ہوا نے ویسے بھی سفر آسان بنا دیا تھا۔ نہر کے کنارے سفر کرتے ہوئے نو بجے کے قریب واہگہ امیگریشن و کسٹم پوسٹ پہ پہنچ گئے۔ ویزہ پر خاص طور پر لکھا تھا۔ واہگہ بائی فٹ لیکن ضروری اندراجات کے عمل میں ڈیڑھ گھنٹہ مصروف رہنے کے بعد جب بارڈر بائی فٹ عبور کرنے کا ارادہ کیا تو کسٹمز سپرنڈنٹ نے مجھے اور جوش صاحب سے کہا کہ میری گاڑی میں بیٹھئے میرا ڈرائیور آپ کو اٹاری پہنچا دے گا۔ چنانچہ ویزہ پر لکھے بائی فٹ کو عملاً "بائی کار" بنا دیا گیا۔

اٹاری میں ہمارے سواگت کے لئے کچھ سردار صاحبان گیندے کے پھول لئے موجود تھے۔ انہوں نے ہم سب کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے۔ "جی آیاں نوں" کہا اور زبردست پذیرائی کی، مشروبات پیش کئے۔ اب ہم واہگہ کے اس پار تھے جہاں سے نصف صدی تک لاہور اور پاکستان کو دانت نکوس کر اور غرا کر دیکھا جاتا تھا۔ اب اسی سرزمین پہ راجا اور پرجا ہم پاکستانیوں کو "دل ماروشن دل ماشاد" کے پیغام دے رہی ہے۔ یہ کایا پلٹ کیوں ہے؟ ایک طویل موضوع ہے۔ اس پہ ہم سیمونتک میں گاہے بگاہے اپنا نکتہ نظر پیش کرتے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رہتے ہیں۔اس وقت تو ہم دسویں عالمی پنجابی کانفرنس کے پاکستانی مندوب تھے اور سامنے اٹاری چیک پوسٹ۔

پھر وہی اندراجات کا عمل شروع ہو گیا۔ بھارتی امیگریشن والوں نے ایک نیا فارم تھما دیا۔اسے پر کر کے دے دیا تو سوال اٹھا کہ آپ کے پاس کرنسی کون سی اور کتنی ہے؟ جواب دیا تو ایک نیا فارم سامنے آ گیا۔اس میں پوچھی گئی معلومات مہیا کر دیں تو شان استغنا سے ارشاد ہوا۔"یہ سب فضول کی ایکسر سائز ہے۔اب تو ویسٹرن یونین بنک آ رہا ہے۔آپ دنیا کے جس ملک میں چاہیں اپنے اکاؤنٹ سے روپیہ لے سکتے ہیں۔اٹاری کے امیگریشن، کسٹمز کمپلیکس میں ٹورازم کا بھی دفتر ہے اور یہاں کرنسی تبدیل کرنے کی سہولت موجود ہے۔ بوندا باندی جاری تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میں کسی کھلی جگہ پہ کھڑا ہوں۔ دراصل کسٹمز کمپلیکس کی چھت ٹپک رہی تھی۔

باہر نکلے تو پورٹر چمٹ گئے۔"روشن اور خوشحال بھارت" سے ہمارا پہلا تعارف ہو رہا تھا۔ان پورٹروں میں سکھوں کی تعداد زیادہ تھی۔ان کے چہروں اور لباس سے ٹپکتی ہوئی مفلسی ہمیں یقین دلا رہی تھی کہ ہم برصغیر کے ایک بڑے ملک میں ہیں۔منی چینجر ہاتھوں میں بھارتی نوٹوں کی گڈیاں پکڑے استفہامیہ نظروں سے ایک ایک کو دیکھ رہے تھے۔ایک ہزار پاکستانی روپوں کے عوض سات سو بھارتی روپے مل رہے تھے۔دس پندرہ برس پہلے معاملہ اس کے برعکس ہوا کرتا تھا۔

ہم لوگ بارش کی پھوار میں کھلی جگہ کھڑے تھے۔امرتسر سے آنے والی بسوں کا انتظار ہو رہا تھا۔میں نے وقت دیکھا ٹھیک بارہ بج رہے تھے۔مقامی وقت کا خیال آیا اور گھڑی کی سوئیاں آدھا گھنٹہ آگے کر دیں۔کافی دیر انتظار کے بعد ایک بس آئی۔اس پر "اجوکا تھیٹر" والوں نے قبضہ جما لیا۔پھر آدھے گھنٹہ کے بعد دوسری بس آئی۔ہم لوگ اس میں بیٹھ گئے لیکن بسیں چلنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔استفسار پر معلوم ہوا کہ ابھی فخر زمان نہیں آئے۔ وہ آئیں گے تو پائلٹ پولیس کی حفاظت میں یہ قافلہ پورے پروٹوکول کے ساتھ روانہ ہوگا۔ VVIP فخر زمان خصوصی پجیرو میں پائلٹ کے پیچھے اور ان کے پیچھے 135 ارکان چار

بسوں میں روانہ ہوئے۔ڈیڑھ بجے کے قریب امرتسر میں موہن انٹرنیشنل ہوٹل بھارتی سرزمین پر ہمارے سفر کا پہلا پڑاؤ تھا۔

دونوں دیشوں کے درمیان مصنوعی دیوار اور غیر فطری تقسیم کی باتیں پراپیگنڈہ کی حد تک تو ٹھیک ہیں لیکن لاہور کی سرحد سے صرف تیس میل کے فاصلہ پر موجود امرتسر شہر کا ماحول دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ نہ تو تقسیم مصنوعی ہے اور نہ حد بندی غیر فطری۔ ہمارے اور ان کے سماج میں اتنی تبدیلی آ چکی ہے کہ اب "مراجعت" کے خواب محض دیوانے کے خواب ہیں۔ امرتسر کی سڑکوں پر گندگی میں لتھڑے سور آزادی سے پھرتے نظر آتے ہیں۔ اسکوٹروں پر سوار خواتین کے پیچھے مرد بیٹھے ہیں۔سائیکل رکشہ پر پانچ پانچ سواروں کو لے جاتے ہوئے استحصال زدہ محنت کش، بھارت کو کسی اور "دشا" میں ہانک رہے ہیں۔

موہن انٹرنیشنل میں کھانے کا اہتمام اعلیٰ درجہ کا تھا۔لیکن اس سے پہلے تقریروں کا موضوع وہی مصنوعی لکیر اور دھرتی کے رشتوں کا تھا۔ یہاں امرتسر کی ضلعی حکومت نے کھانے اور ثقافتی پروگرام کا انتظام کر رکھا تھا۔پنجاں پانیاں دی وراثت، نامی تنظیم، شریک میزبان تھی۔امرتسر کے کمشنر اور ڈپٹی کمشنر مہمانان خصوصی تھے۔اخباری نمائندے اور ٹی وی چینلوں والے اپنا کام کر رہے تھے میزبانوں کے خطاب کے بعد پاکستانی وفد کے قائد اور ورلڈ پنجابی کانگریس کے چیئرمین فخر زمان نے تقریر کی۔انہوں نے کہا کہ ہم پاکستان سے امن اور دوستی کا پیغام لیکر آئے ہیں۔پاکستان سے آنے والے وفود میں یہ سب سے بڑا "امن قافلہ" ہے۔دونوں ملکوں کے درمیان بہتر تعلقات اور امن و دوستی کی چابی پنجاب کے ہاتھ میں ہے۔پنجابیوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کیلئے پنجابی کانفرنسوں کا سلسلہ شروع کیا گیا تھا۔اب یہ تحریک کی صورت میں آگے بڑھ رہا ہے۔پاکستان میں پنجاب کی حکومت پنجابی زبان اور کلچر کی ترقی کے لئے بہت کام کر رہی ہے۔ورلڈ پنجابی کانگریس کا مقصد بھی یہی ہے اور اسی لئے آج ہم یہاں موجود ہیں۔پاکستان سے وفد میں شامل فنکارہ روزینہ کوثر نے "ولٹھے دی چادر" لوک گیت خوبصورت انداز میں پیش کیا۔آخر میں مقامی فنکار نے ایک فوک سنایا اور خاصا بور کیا۔لیکن پھر کھانے کی نوید نے لوگوں کو کھانے کی میزوں کی طرف

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دوڑا دیا۔ اب حلال حرام کی تمیز کئے بغیر لوگوں نے اپنی پلیٹیں بھر لیں۔ جو اس فرق کو سمجھتے تھے انہوں نے دال روٹی اور سادے چاولوں سے پیٹ پوجا کی۔ مشروبات میں ''وہ'' بھی تھی لیکن زیادہ لوگوں نے منرل واٹر سے استفادہ کیا جو گلاس کی شکل میں پیک تھا۔ اس پر چھپی قیمت کے حساب سے یہ تین روپے بھارتی اور چار روپے پاکستانی کا تھا۔ یہاں تقریباً دو گھنٹے قیام رہا۔ تازہ دم ہو کر پھر بسوں میں سوار ہو گئے۔ یہ بسیں ''راجوٹریولز'' کی تھیں لیکن ان کا معیار PTDC سے کم تھا۔

امرتسر خالصہ کالج اور جالندھر کی تقریبات منسوخ کر دی گئیں تھیں اور اب ہم سیدھے چنڈی گڑھ جا رہے تھے۔ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر، سنگل سڑک کے ٹوٹے پھوٹے کنارے اور رینگتی ہوئی بسیں...... لیکن ہماری بسیں ایئر کنڈیشنڈ تھیں چنانچہ زیادہ تکلیف محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ سڑک کے ساتھ دیہی بستیاں گزرتی رہیں اور پھر بڑے شہر کے آثار پیدا ہوئے۔ چونکہ جالندھر میں اب کوئی تقریب نہ تھی اس لئے شہر کو بائی پاس کر کے ہمیں چند کلومیٹر کے فاصلہ پر ''حویلی ریسٹوراں'' میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں بھی سواگت کا بھرپور مظاہرہ تھا۔ جالندھر کے ڈپٹی کمشنر نے وفد کا استقبال کیا۔ راستے کے دونوں طرف پیڈسٹل فین چھ چھ فٹ کی بلندی سے خوشبودار پانی ہوا کے پریشر سے فضا میں پھینک کر ماحول کو معطر کر رہے تھے۔ اس استقبالیہ راہداری سے گذر کر ہم لوگ یکا یک تازہ دم ہو گئے۔ یہاں چائے کا پر تکلف اہتمام تھا۔ ٹماٹر کا سوپ اور پھر دیگر لوازمات پیش کئے گئے۔ حویلی ریسٹورنٹ لاہور کے ولیج ہوٹل کا منظر پیش کر رہا تھا۔ چھوٹی اینٹوں سے بنی اس عمارت میں پنجاب کا کلچر محفوظ کرنے کی بھرپور اور کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ عمارت کو چار پانچ حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصے کو مختلف قدیم وجدید دیہاتی فرنیچر سے آراستہ کیا گیا ہے۔ ایک جگہ ٹرک کا اگلا حصہ اس طرح دیوار میں نصب ہے جیسے کوئی تیز رفتار ٹرک دیوار توڑ کر اندر گھس آیا ہے۔ حویلی کے باہر برآمدے میں دیہاتی گھروں کے کچھ جیتے جاگتے منظر ترتیب دیئے گئے ہیں۔ سوہنی مہینوال کے مجسمے ایستادہ ہیں۔ میں اپنے ساتھ کیمرہ لانا بھول گیا تھا۔ اب قدم قدم پر مجھے اپنی اس بھول پر ملال ہو رہا تھا۔ کیمرہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ مناظر محفوظ نہ کر سکا۔ جائے

ضرور یہ کیلئے لیڈیز ٹوائلٹ کے باہر مٹیار اور جنٹس ٹوائلٹ کے اوپر ''گھبرو'' لکھا ہوا ہے۔ دور دور تک ابھی تعمیراتی کام جاری تھا۔

تحقیق پر پتہ چلا کہ جالندھر کا ایک کاروباری گروپ ''گوا'' میں ہوٹل چلا رہا تھا۔ ان کا پروگرام بنا کہ جالندھر میں ایک مثالی کمپلیکس تعمیر کیا جائے۔ چنانچہ یہ کام مکمل طور پر پرائیوٹ شعبہ میں ہو رہا ہے اور صرف ایک فرد کروا رہا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد جالندھر شہر کے لوگوں کو تفریح کا ایک بہترین مقام اور مسافروں کو شاندار جدید قسم کا ڈھابا مل جائے گا۔

حویلی اور اس کے اردگرد مقامی لوگ پاکستانیوں کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ جیسے یہ کسی اور سیارے کی مخلوق ہیں۔ بھارت کے ذرائع ابلاغ نے پاکستانیوں کے بارے میں نہ جانے کیسا تاثر بھارتی عوام کے ذہن میں اتار رکھا ہے۔ ویسے بھی ان لوگوں کے لئے پنجاب میں پاکستانیوں کو اور وہ بھی پنجاب سرکار کے مہمان کی حیثیت سے دیکھنا یقیناً اچنبھے کی بات تھی۔

حویلی سے نکلتے نکلتے چار بج گئے۔ ایک بار پھر سفر شروع ہوا اور اب اگلی منزل اور شیڈول کے مطابق آخری منزل چنڈی گڑھ تھی۔ سڑک کے دونوں طرف سفیدے کے درخت اور ان کے پیچھے ہریالی تھی۔ نہری پانی کا نظام جو پہلے ہمارے پنجاب میں مثالی تھا۔ اب مشرقی پنجاب کا امتیاز بن چکا ہے۔ ہماری بسیں رواں دواں تھیں۔ اگرچہ رفتار زیادہ نہیں تھی۔ لیکن مسلسل محو سفر تھیں۔ چنڈی گڑھ ابھی بہت دور بتایا جا رہا تھا۔ تین گھنٹے کے بعد ایک جگہ بسیں رکیں۔ بتایا گیا کہ یہ ''ہاپڑ'' ہے اب یہ بات کسی علم میں نہیں تھی کہ کیا یہ ہاپوڑ...... بابائے اردو مولوی عبدالحق کی جنم بھومی تو نہیں۔ یہاں ڈرائیوروں نے چائے پانی سے خود کو تروتازہ کیا اور پھر آگے چل پڑے۔

رات نو بجے کے قریب چنڈی گڑھ کے آثار نمودار ہوئے۔ شہر سے باہر مہالی میں سکھ بیر سنگھ سندھو کے فارم ہاؤس ''سشماشاہی'' میں رات کے کھانے کا انتظام تھا۔ فارم ہاؤس میں عالمی پنجابی کانفرنس کی تمام انتظامیہ اور عہدیداران موجود تھے۔ یہاں بھی وفد کے ارکان کو گیندے کے پھولوں سے لاد دیا گیا۔ لان میں جگہ جگہ کرسیاں آراستہ تھیں۔ بیرے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مشروبات لئے پھر رہے تھے۔ بیئر' وہسکی اور مختلف کولاز پیش کئے جا رہے تھے۔ تقریباً پون گھنٹے کے بعد کھانا شروع ہوا۔ دال چاول' سبزی' پنیر سبزی اور مرغ' سبھی کچھ تھا۔ میٹھے میں بھی تین چار ڈشز تھیں۔

کھانے کے بعد اراکین کو شوالیک ویو ہوٹل پہنچایا گیا۔ یہ ہوٹل چندی گڑھ کے بیچوں بیچ ہے۔ چندی گڑھ کے بارے میں بتایا گیا کہ یہ بھارت کا اکلوتا شہر ہے۔ جو باقاعدہ ایک نقشے اور منصوبہ کے مطابق 1950ء کے عشرہ میں بنایا گیا۔ مختلف سیکٹروں میں تقسیم چندی گڑھ کی سڑکیں کشادہ اور سڑکوں کے کنارے سبزہ اسے ایک خوش منظر شہر بناتا ہے۔ سکون اور خاموشی نے بہت متاثر کیا لیکن یہ صبح کا منظر تھا۔ شہر بیدار ہوا تو بسوں اور رکشوں کے شور میں ڈوب گیا۔ فٹ پاتھ تجاوزات کی نذر ہو گئے۔

شوالیک ویو ہوٹل ہی ہمارا قیام اور یہیں کانفرنس کا انعقاد تھا۔ ایک ایک کمرے میں دو دو ساتھیوں کو ٹھہرایا گیا۔ کمروں کی الاٹ منٹ میں رات کے بارہ بج گئے تھے۔ میرے ہم کمرہ ...... اظہر غوری بنے جنہوں نے بعد ازاں پورے سفر میں مجھے ادب و احترام سے نوازا۔ صبح دس بجے کانفرنس کا افتتاحی اجلاس تھا چنانچہ ہم لوگ جلد سونے کا فیصلہ کر کے دراز ہو گئے۔

28 مئی 2004ء

صبح دس بجے ہوٹل کے آڈیٹوریم میں کانفرنس کا افتتاحی سیشن منعقد ہونا تھا۔ علی الصبح بیدار ہوئے۔ نماز سے فارغ ہو کر کھڑکی سے چندی گڑھ کا نظارہ کیا۔ ڈائننگ ہال میں ناشتہ ہمارا منتظر تھا۔ ناشتے کے بعد آڈیٹوریم کا رخ کیا۔ رجسٹریشن' انکوائری اور انفارمیشن کمیٹی کے کاؤنٹر سجے تھے۔ بھارتی اور بیرون ملک سے آنے والے مندوبین کی رجسٹریشن کا مرحلہ شروع ہوا۔ پاکستانی مندوبین کیلئے علیحدہ کاؤنٹر بنا دیا گیا۔ آڈیٹوریم میں داخل ہونے والوں کو سیکورٹی چیک سسٹم سے گزارا گیا۔ پنجابی اکیڈمی دہلی کی طرف سے ہر مندوب کو بیج اور بیگ دیئے گئے۔ خوبصورت ہینڈ بیگ میں کانفرنس کا تمام پروگرام بروشر میں موجود تھا۔

دسویں عالمی پنجابی کانفرنس کا افتتاحی اجلاس ساڑھے گیارہ بجے شروع ہوا۔ پنجابی و

کانگریس کے چیئرمین جناب فخر زمان نے صدارت کی۔ سٹیج پر پاکستان مندوبین اداکار غلام الدین' پرویز عاطف' افضل احسن رندھاوا' پروفیسر ستندر سنگھ نور' ڈاکٹر روہیل سنگھ' اے پال اور مشرقی پنجاب کے دو وزراء بٹھائے گئے۔ پروفیسر ستندر سنگھ نور نے "پنجابی کلچر کا خطہ" عنوان سے مضمون پڑھا۔ پاکستانی مندوبین غلام محی الدین' افضل احسن رندھاوا اور وزیر ثقافت عاطف نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مشرقی پنجاب کے وزیر تعلیم ہرنام داس جوہر اور وزیر ثقافت اشون شیکھری کے خطاب کے بعد فخر زمان نے گفتگو کی۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے 1984ء میں ورلڈ پنجابی کانگریس کی بنیاد رکھی تھی۔ ہم نے مخالفت برداشت کی۔ طعنے سہے لیکن ہمت نہیں ہاری۔ نویں کانفرنس لاہور میں ہوئی۔ یہ دسویں کانفرنس ہے جس میں پاکستان سے تقریباً 150 مندوبین شامل ہوئے ہیں۔ ان کانفرنسوں کا یہ فائدہ ہوا ہے کہ ناروے' امریکہ' برطانیہ' کینیڈا اور دنیا کے دیگر ممالک میں پنجابی بولنے اور لکھنے والے ایک لڑی میں پروئے گئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ پنجابیت سے ہماری مراد شاونزم نہیں بلکہ صوفی ازم ہے۔

پہلا شخص ڈیڑھ بجے ختم ہوا۔ سیشن مکمل ہوتے ہی دوپہر کے کھانے کا اعلان ہو گیا۔ کھانے کے بعد اکیڈمک اور ٹیکنیکل سیشن میں پنجاب یونیورسٹی پٹیالہ کے پروفیسر سچا سنگھ گل نے "دونوں پنجابیوں کا اقتصادی تعاون ...... ایک سلگتا ہوا مسئلہ" کے عنوان سے مضمون پڑھا۔ پھر سوال و جواب کی نشست میں پنجابی زبان اور اس کے رسم الخط پر بات ہوئی۔ میزبانوں نے خود ہی اپنی گورمکھی کے مقابلے میں ہمارے رسم الخط کو شاہ مکھی کا نام دیدیا۔ پنجابی زبان کے دو مختلف رسم الخط جو مسائل پیدا کر رہے ہیں ان پر گفتگو ہوتی رہی۔ مختلف تجاویز پیش کی گئیں کوئی قابل قبول حل سامنے نہ آسکا۔ ساڑھے پانچ بجے یہ نشست ختم ہوئی۔

شام چھ بجے ٹیگور تھیٹر میں "جنے لہور نئیں ویکھیا جمیا نئیں" نامی ڈرامہ پیش کیا گیا۔ ڈرامے کا موضوع 1947ء کی تقسیم اور فرقہ وارانہ فسادات کا المیہ تھا۔ دکھایا گیا کہ لکھنؤ کی ایک فیملی تقسیم کے بعد لاہور پہنچتی ہے۔ اسے ایک حویلی الاٹ کی جاتی ہے۔ لیکن حویلی میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک بوڑھی ہندو عورت مقیم ہے۔ یہ خاتون حویلی خالی کرنے پر تیار نہیں ہوتی۔ لکھنو کے بڑے صاحب ہر جتن کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ غنڈوں کی مدد لینے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔ لیکن کامیابی نہیں ہوتی۔ بڑے صاحب کی بیگم ایک رحمدل خاتون ہیں۔ وہ بڑے صاحب کو درگذر سے کام لینے پر مائل کر لیتی ہیں پھر پوری فیملی ہندو خاتون کی دیوانی ہو جاتی ہے۔ دیوالی دھوم دھام سے اکٹھے مناتے ہیں۔ محلے کے غنڈے یہ سب کچھ برداشت نہیں کرتے۔ مسجد کے مولوی صاحب بوڑھی خاتون اور بڑے صاحب کے حامی ہوتے ہیں۔ غنڈے مولوی صاحب کو قتل کر دیتے ہیں۔ بوڑھی خاتون ''سورگباش'' ہو جاتی ہے۔ مسلمان اس کی ارتھی اٹھاتے اور ہندو دھرم کے مطابق شمشان لے جا کر جلا دیتے ہیں۔ اس ڈرامے کا نام۔ ''جنے لہور نئیں ویکھیا، جمیا نئیں'' موضوع سے مطابقت نہیں رکھتا پھر تمام کردار اردو بولتے ہیں۔ حتیٰ کے لاہور کے غنڈے بھی۔ بتایا گیا کہ بوڑھی خاتون کا کردار مادھوری وکٹاریہ نے ادا کیا جو چنڈی گڑھ میں سینئر مجسٹریٹ ہیں۔

ڈرامے کے بعد بھارتی پنجاب کے نامور بھنگڑا گروپ ''پپی بھائی'' نے ڈھولوں کی تھاپ پر نہایت شاندار پرفارمنس دی۔ پاکستانی وفد میں شامل نامور رقاصہ زریں پنا نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور ہال میں موجود ہر فرد جھوم اٹھا۔ تھکاوٹ سے میرا بدن چور تھا۔ بخار کے ساتھ درد سے سر پھٹا جا رہا تھا۔ بھنگڑا گروپ کی پرفارمنس کے دوران ڈھول کی آوازیں' دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برستی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ دماغ پر پڑنے والی چوٹوں نے بخار اور سردرد ختم کر دیا۔ شائد علاج کا ایک طریقہ یہ بھی۔ اسے ڈھول تھراپی کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ میرا تجربہ تو بہر حال یہی کہتا ہے۔

رات کا کھانا مہالی میں سشما شاہی' فارم ہاؤس میں تھا۔ ٹیگور تھیٹر سے رات گیارہ بجے فارم ہاؤس میں پہنچے۔ یہ جگہ شہر سے تقریباً دس کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔ آج یہاں کا ماحول ذرا مختلف تھا۔ لان بڑی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ یونیفارم میں ملبوس بیرے مشروبات سرو کر رہے تھے۔ لال پری بار بار پیش کی جا رہی تھی لیکن ہم ٹھہرے بدذوق۔ اس طرح کی چیزیں ہمارے نصیب میں ہی نہیں۔ چنانچہ حلق سے نیچے اتارنا تو کیا ہونٹوں تک

لانے کا بھی حوصلہ نہیں تھا۔ لیکن ہمارے وفد کے باذوق حضرات جام پہ جام لنڈھائے جا رہے تھے۔

ہم مختلف گروپوں میں بٹ کر گپ شپ کر رہے تھے۔ ایک گھنٹہ بعد کھانے کا دور شروع ہوا۔ کھانے کے دوران بھی مقامی لوگوں سے گفتگو رہی۔ سکھوں اور ہندوؤں کے انداز گفتگو میں واضح فرق محسوس ہو رہا تھا۔ سکھوں کا خلوص' محبت کا اظہار اور مہمانوں کے لئے ان کا احترام قدم قدم پر سامنے آ رہا تھا۔ کھانے کے دوران ایک سردار صاحب نے کہا کہ میں ہر سال یوم آزادی کے موقع پر 47ء کے دس لاکھ شہیدوں کو اٹاری کے مقام پر بنائی گئی یادگار پہ جا کر شردھانجلی پیش کرتا ہوں۔ گپ شپ کے دوران میں نے بھارت کی ایک جانی مانی شخصیت سے پوچھا کہ ویٹی کن میں پوپ جان پال نے تو سینکڑوں برس پہل لڑی جانے والی صلیبی جنگوں کے دوران مسلمانوں پر کئے جانے والے عیسائیوں کے مظالم پر معافی مانگ لی ہے لیکن بھارت میں تقسیم کے وقت بے گناہ' نہتے اور بے بس مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ کیا گیا۔ جس طرح عورتوں کی بے حرمتی اور بچوں کے ساتھ شقی القلبی کا مظاہرہ کیا گیا، اس پر کسی ندامت' کسی تاسف یا معذرت کا بھی ذکر نہیں کیا گیا۔ کیا اس کے لئے بھی سینکڑوں برسوں کا انتظار کرنا پڑے گا۔ قوموں کے درمیان دوستی پیار اور محبت کے رشتے ماضی کو بھلا کر نہیں، اپنے کردار کی خامیوں کو کھلے دل سے قبول کر کے اور ظلم و زیادتی پر معذرت خواہ ہو کر قائم کئے جاتے ہیں۔

کھانے کا دور جاری تھا کہ ایک خاتون نے اپنا تعارف کسی انسٹی ٹیوٹ کی ڈائریکٹر کے طور پر کرایا۔ راولپنڈی کی رہنے والی تھیں۔ انہوں نے وہاں کے حالات جاننے کے لئے بات چھیڑی اور پھر یہاں تک کہہ دیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم یہ تسلیم کر لیں کہ ''تقسیم کا فیصلہ درست نہیں تھا۔ ہم اگر دوبارہ ایک ہو جائیں تو دنیا میں بہت جلد اپنا مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ میں نے خاتون سے سوال کیا کہ بی بی مہاتما گاندھی کو کیوں قتل کیا گیا تھا؟ اس پر وہ چونکیں اور پھر اپنی پلیٹ لیکر غائب ہو گئیں۔ اسی طرح ایک سابق فوجی نے کہا کہ ایک دن تو بھائیوں کو ملنا ہی ہے۔ کب تک جدا رہیں گے۔ کھانے کی اس محفل کے بعد میں باہر لان

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں فخر زمان صاحب کے گروپ میں آبیٹھا۔انہیں کامیابی پر مبارکیں دی جارہی تھیں۔ میں نے فخر زمان صاحب سے کہا کہ اگر وہ اس کانفرنس کے حوالے سے تمام میٹریل مہیا کر دیں تو ہم سپوتنک کا ایک خصوصی نمبر شائع کرنے کیلئے تیار ہیں۔ یہ تجویز انہیں پسند آئی۔انہوں نے کنول مشتاق اور اعزاز چودھری کو ہدایت کی کہ واپسی پر وہ مجھے میٹریل مہیا کر دیں۔

اس بار میں اپنا کیمرہ ساتھ نہیں لا سکا۔اس کی کمی مجھے بار بار محسوس ہو رہی تھی۔ میرے ساتھ کمرے میں اظہر حسین غوری مقیم تھے۔ بہت عزت و احترام کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ انہیں خوش رکھے۔انہیں سگریٹ پینے کی ''لت'' ہے۔سفر کے دوران ائیر کنڈیشنڈ کے اگلے حصہ (کاک پٹ) میں بیٹھتے اور مسلسل سگریٹ نوشی کرتے رہتے ہیں۔ خیر یہ ان کا مسئلہ ہے لیکن ان کی خوبی یہ ہے کہ بڑوں کی عزت و احترام میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے۔ اب تو خاندان کے علاوہ کہیں کسی بزرگ کا احترام نا قابل تصور ہو چکا ہے۔اظہر غوری نے بتایا کہ ہوٹل واپسی کے لئے بسیں تیار ہیں۔واپس پہنچے تو رات کے دو بج رہے تھے۔اپنے اپنے کمرے کی طرف دوڑے۔صبح وقت پر نماز پڑھنے کے لئے اب سو جانا ہی بہتر تھا۔

آج پہلی نشست دس بجے شروع ہوئی۔ پروگرام کے مطابق پیپر پڑھے گئے۔ پروفیسر جسبیر سنگھ کے مقالے کا عنوان تھا۔ پنجابی کلچر کے مشترکہ سرچشمے۔اس سیشن کی صدارت ہمارے نامور صحافی حمید اختر نے کی۔ پروفیسر جسبیر سنگھ نے کہا کہ پنجابی کلچر کا تبادلہ ضروری ہے۔دونوں ملکوں کے درمیان آمد و رفت سے کلچر کو استحکام اور باہمی اعتماد کو فروغ ملے گا۔اکادمی ادبیات لاہور کے ریذیڈنٹ ڈائریکٹر قاضی جاوید نے WTO کے حوالے سے اپنا مضمون پڑھا۔انہوں نے کہا کہ انگریزی ہماری ضرورت اور پنجابی ہماری شناخت ہے۔ ڈی سی او لاہور کیپٹن خالد سلطان نے مشرقی پنجاب میں تعلیمی زبان پر سنسکرت کے بھاری بھرکم لفظوں کے بوجھ کو موضوع بنایا اور اپنی برجستہ اور شگفتہ گفتگو سے موضوع کو ہلکا پھلکا بنا دیا۔حمید اختر صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ بھارت سے ہماری تجارت ہو تو اس کا سارا فائدہ پنجاب کو ہوگا لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اس بات کی مخالفت میں پنجابی ہی سب سے آگے ہیں۔

سٹیج پہ تقاریر ہو رہی تھیں اور ہال کے پچھلے حصہ میں انٹرایکشن جاری تھا۔اخبارات کے نمائندے مندوبین سے انٹرویو میں مصروف تھے۔ ہندوستان ٹائمز کے ایک نوجوان نے مجھ سے درخواست کی کہ اس کو انٹرویو کیلئے تھوڑا سا وقت دوں۔ ہم لوگ پچھلی نشستوں پہ آ کر بیٹھ گئے۔اس نے ''آتنک واد'' (دہشت گردی) کی بات کی اور کہا کہ آخر یہ کب ختم ہوگا؟ اس نے کشمیر کو کور ایشو بنانے کے پاکستانی موقف کی بات کی۔ پھر اس نے بتایا کہ اس کی پیدائش سری نگر میں ہوئی تھی۔اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ کشمیری پنڈتوں کو وہاں سے کیسے نکالا گیا۔ میں یہ بات کیسے بھول سکتا ہوں۔اس نے خود ہی کہا کہ ہمارے بزرگوں نے کشمیر کا مسئلہ اقوام متحدہ میں لے جا کر غلطی کی۔اس کے سوال انہی باتوں پر مشتمل تھے جو وہاں کی حکومتیں مسلسل کہتی آ رہی ہیں۔ میرا جواب یہی تھا کہ بھارت کا دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہونے کا دعویٰ ہے۔آخر وہ کشمیر میں وہاں کے لوگوں کو ان کا جمہوری حق...... حق خودارادی دینے سے کیوں گریزاں ہے۔ کشمیری کیا چاہتے ہیں؟ وہ اپنا مستقبل بھارت کے ساتھ دیکھتے ہیں یا پاکستان کے ساتھ...... انہیں اس بات کے اظہار کا موقع تو دیا جائے۔ جب آپ کسی کو سیدھے سبھاؤ اس کا حق نہیں دو گے تو وہ آتنک واد کے لئے مجبور ہو جائے گا۔ ہر عمل کا ایک ردعمل ہوتا ہے۔اگر بھارت کی حکومت من مانی کرنے کی بجائے دنیا کے سامنے کئے ہوئے اپنے وعدے پر عمل درآمد کرتی اور کشمیر میں رائے شماری کرا دیتی تو برصغیر امن و آشتی کا گہوارہ بن جاتا۔ پاکستان اور بھارت دونوں ہی خوشحال ملک ہوتے۔ بھارت سرکار کے ''بدھی مانوں'' کو سوچنا پڑے گا کہ جنگیں لڑ کر ہم نے برصغیر کے عوام کو کیا دیا ہے؟ کیا اس خطہ کے لوگوں نے آزادی کی جنگ اس لئے لڑی تھی کہ ان کے مقدر میں غربت' افلاس' بے روزگاری اور بیماری رہے؟

میں نے کشمیر میں موجود آٹھ لاکھ بھارتی فوج کے حوالے سے کہا کہ بھارت کی یہ فوج پاکستان کی کل فوج کا ڈبل ہے۔ وہاں وہ اپنے تمام تر وسائل کے باوجود ''آتنک واد'' روکنے میں کیوں ناکام ہے؟ اس لئے کہ مقامی آبادی کی خواہشات کچھ اور ہیں۔ میں نے بتایا کہ بھارت کا مقدمہ نہایت کمزور اور بے بنیاد ہے۔اسے دنیا بھر میں خفت اٹھانے کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سوا کچھ حاصل نہیں ہوا۔ جس اصول کے تحت وہ جونا گڑھ پر فوج کشی کرتا ہے۔ اسے کشمیر میں کیوں تسلیم نہیں کرتا۔ جونا گڑھ میں ہندو آبادی کی اکثریت کی بنیاد پر اگر اسے بھارت میں ضم کرنا ضروری تھا تو یہ دلیل کشمیر کے معاملے میں کیوں تبدیل ہو جاتی ہے۔ بنیادی بات یہی ہے کہ بھارت پچھلے 56 برسوں سے ایک غلطی کا ازالہ کرنے کے لئے غلطی پہ غلطی کئے جا رہا ہے۔ اس نے 1970ء میں مشرقی پاکستان میں جو کچھ کیا وہ اس کی ریاستوں میں بھی ہو سکتا ہے۔

ادھر آج کا پہلا سیشن اپنے اختتام پر تھا۔ سیمینار ہال کے ایک طرف بوفے کی تیاریاں جاری تھیں۔ اچانک ایک سردار جی آئے اور مجھے حکم دیا کہ اپنی سیٹ سے کھڑا ہو جاؤں۔ ان کی بزرگی دیکھ کر میں خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے زوردار ''جپھی'' ڈالتے ہوئے بتایا کہ وہ چنن سنگھ ورک ہیں اور سرسا سے 400 کلومیٹر کا سفر کر کے صرف مجھے ملنے آئے ہیں۔ انہوں نے کہا مجھے یقین تھا کہ آپ ضرور آئے ہوں گے۔ میرے بچوں نے بہت روکا اور کہا کہ گرمی بہت ہے مت جاؤ' بیمار ہو جاؤ گے۔ پر میں نے کہا کہ اگر میں نہ گیا تو پھر ضرور بیمار ہو جاؤں گا۔

سردار چنن سنگھ سپوتنک کے پرانے قاری ہیں۔ اردو کی کتابوں کی اچھی خاصی لائبریری ان کے گھر میں موجود ہے۔ تقسیم کے وقت یہ ضلع شیخوپورہ کے رہائشی تھے۔ ان کے کچھ عزیز آج بھی شیخوپورہ میں مقیم ہیں۔ ان سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ اس کے بعد کانفرنس کے اختتام تک یہ ہمارے ساتھ رہے۔ رات کو رہائش بھی ہمارے ساتھ رکھی۔

پہلے سیشن کے بعد کھانا شروع ہوا۔ کھانے کے دوران بھی باتیں ملاقاتیں جاری رہیں۔ چنڈی گڑھ کی کریم یہاں موجود تھی۔ ایک مسلمان پروفیسر نے بتایا کہ وہ قریب ہی کسی کالج میں پڑھاتے ہیں۔ ان سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ پہلے تو کوئی مسلمان مشرقی پنجاب میں نہیں رہتا تھا۔ اب کچھ کشمیر اور دوسری ریاستوں سے آ کر آباد ہو گئے ہیں۔ کچھ سرکاری ملازم بھی تبدیل ہو کر یہاں آتے رہتے ہیں لیکن مجموعی طور پر مسلمانوں کی تعداد یہاں نہ ہونے کے برابر ہے۔

کھانا کھانے کے بعد ہم چنڈی گڑھ کی سیر کو نکل گئے۔ گرمی شدید تھی۔ غوری صاحب کا اصرار تھا کہ پیدل چلنا چاہئے۔ مجھے بھی پیدل چلنا اچھا لگتا ہے لیکن میرے پاؤں میں تکلیف شروع ہو چکی تھی۔ سوزش کے آثار نمایاں تھے۔ چند ایک مارکیٹوں میں گھومے۔ ایک بک شاپ پر بھی گئے۔ یہاں مارکسسٹ لٹریچر فروخت ہوتا تھا لیکن اب خاک اڑ رہی تھی۔ احمد سلیم اپنے دو سکھ دوستوں کے ساتھ وہیں آ گئے۔ سردار صاحبان بضد تھے کہ چائے ضرور پئیں۔ دکاندار نے ان سے پیسے لیکر نہایت گھٹیا چائے بنا دی جو ہم نے قہر درویش کے مصداق جیسے تیسے نگل لی۔ وہاں سے نکلے، آرام کا وقت آوارہ گردی میں گزار چکے تھے۔ سائیکل رکشہ پر واپس ہوٹل پہنچے۔ کمرے میں پہنچا تو سردی کے ساتھ بخار غالب آ گیا۔ اے سی بند کروا کر کمبل اوڑھ کر سو گیا۔ شام ساڑھے پانچ بجے آنکھ کھلی۔ طبیعت سنبھل چکی تھی۔ نیچے آ کر دیکھا تو ''مشاعرہ'' جاری تھا۔ آج دوسری نشست میں مشاعرہ رکھ لیا گیا تھا۔ اے جی جوش صاحب صدارت کر رہے تھے۔ پاکستانی شاعر اور شاعرات سے ان کا کلام سنا گیا۔ وہاں کے ایک آرٹسٹ نے کچھ تصاویر منتخب افراد میں تقسیم کیں اور پھر محفل برخاست ہو گئی۔

شام کو ٹیگور تھیٹر میں اجوکا تھیٹر گروپ کی طرف سے مدیحہ گوہر نے شاہد محمود ندیم کا لکھا پنجابی ڈرامہ ''بلھا'' پیش کیا۔ رات کو مشرقی پنجاب کے صوبائی وزیر جنگلات نے وزیر اعلیٰ پنجاب کی طرف سے پنجاب ہاؤس میں کانفرنس کے شرکاء کے اعزاز میں عشائیہ دیا۔ مقامی شرکاء میں زیادہ تر سرکاری افسران اور ان کی بیگمات تھیں۔ یہاں ہمارے وقت کی چند فلمی اور غیر فلمی آرٹسٹوں نے ماہیئے گانے اور لوک رقص پیش کئے۔ خوب سماں بندھا رہا۔ شراب میں وہسکی بیئر وغیرہ عام تھی۔ بار بار سامنے لائی گئی لیکن ہم نے کوک پہ گذارا کیا۔ کھانا بھی دال روٹی پر مشتمل تھا۔ البتہ آئس کریم اور گلاب جامن کچھ زیادہ ہی لذیذ تھے۔ یہاں سے واپس ہوٹل پہنچے تو نیند نے دبوچ لیا۔ صبح نماز کے وقت آنکھ کھل گئی۔ مغرب کی سمت کا اندازہ لگا کر نماز ادا کی۔ سفر میں سمت کا مسئلہ تو ہوتا ہے لیکن بات تو نیت کی ہے کیونکہ مشرق و مغرب تو اللہ ہی کیلئے ہیں۔ نماز پڑھ کر پھر سو گیا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

30 مئی 2004ء

کانفرنس کے تیسرے اور آخری دن پہلا سیشن گیارہ بجے شروع ہوا۔ اس سیشن کا موضوع ''پنجابی زبان اور سیاست'' تھا۔ اس سیشن کی صدارت پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ کے پنجابی شعبہ کے صدر سرجیت سنگھ نے کی۔ سیشن کا موضوع ''پنجابی زبان اور سیاست'' تھا۔ پہلے سیشن میں بشریٰ اعجاز کے مضمون نے دھوم مچا دی۔ یہ مضمون پنجابی عورت کی صحیح عکاسی کرتا تھا۔ خاص طور پر ہمارے پنجاب کی بھرپور عکاسی تھی۔ لیکن جس طرح وہاں موجود مقامی ناریوں نے بشریٰ کو داد دی۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ دونوں جانب ''حالات'' ایک جیسے ہیں۔ میرے دائیں بائیں بیٹھی بھارتی خواتین نے بشریٰ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ اتفاق سے اس وقت وہ قریب سے گزر رہی تھیں۔ میں نے بلا کر ساتھ بٹھا لیا۔ خواتین نے آٹوگراف کے لئے انہیں گھیر لیا۔ ظاہر ہے اگر بات سچی ہو اور کہنے کا ڈھنگ آتا ہو تو اثر لازمی ہوتا ہے۔ مضامین کے بعد سوال و جواب کی محفل میں ہمارے قاضی جاوید صاحب کے خوب لتے لئے گئے۔ قاضی صاحب نے حسب عادت اردو کو اپنی تمام ناکامیوں کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے ''انگریزی'' کی وکالت فرمائی تھی۔ جو کچھ انہوں نے کہا تھا وہ کسی کو انگریزوں کے دور حکومت میں بھی کہنے کی جرأت نہیں تھی۔ قاضی صاحب اپنی اردو کی تقریباً 28 کتابوں سے لاتعلقی کا اعلان کر چکے ہیں لیکن اکیڈمی ادبیات کی نوکری پر قائم دائم ہیں۔ وہ لاہور میں اس قومی ادارے کے ڈائریکٹر ہیں۔ اس ادارے کا بنیادی کام اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت ہے۔ تضادات کی شکار اس شخصیت نے اپنے مضمون کی وضاحت کرتے ہوئے اپنی بیان کی گئی تمام باتوں کے بارے میں یہ بھی کہہ دیا کہ میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میرا مطلب وہ نہیں تھا۔

پنجابی زبان کے رسم الخط پر بھی مسلسل گفتگو رہی۔ چڑھدے پنجاب (پاکستانی) کی زبان کو عام فہم اور آسان اور لہندے پنجاب (بھارتی) کی زبان کو مشکل قرار دیا گیا لیکن رسم الخط کا مسئلہ تو تقسیم سے پہلے کا ہے۔ وہ کیسے حل ہوگا؟ اس کا کسی کے پاس جواب نہیں تھا۔

اکیڈمک سیشن کے ساتھ ہی کانفرنس کا اختتامی اجلاس کرنے کا فیصلہ ہوا۔ اس اجلاس

کی صدارت چیئرمین ورلڈ پنجابی کانگریس فخر زمان نے کی۔ پانچ کتابیں ریلیز کی گئیں۔ یہ پانچ کتابیں کشمیری لال ذاکر کی کہانیوں پر مشتمل، سمندری ہواؤں کا موسم، شائستہ حبیب کی پنجابی شاعری' میں کپاہ تے چاننی' راجندر کور کی طویل نظم ''کب اسے ملو گے'' یونی سٹار پر کاش کی سونیا گاندھی اور ڈاکٹر جاوید خان کا مجموعہ کلام۔ میں باغی ہوں۔ کتابوں کی رونمائی کے بعد ڈاکٹر دیپک من موہن نے اس تین روزہ عالمی پنجابی کانفرنس کا اعلامیہ پیش کیا۔

اعلامیہ میں متعلقہ قراردادوں کے ذریعے مطالبہ کیا گیا کہ

○ پاکستان اور بھارت دونوں پائیدار امن قائم کریں۔

○ ثقافتی تعاون پیدا کرنے کے لئے پنجابیوں کو عام اور آزادانہ طور پر ملنے کی سہولت پیدا کرنے کیلئے سارک ملکوں کے درمیان ویزہ ختم کیا جائے یا پھر ملٹی پل ویزہ جاری کیا جائے۔

○ دونوں ملکوں میں تعلیم و تحقیق کے مشترکہ پراجیکٹ بنائے جائیں۔ طالب علموں اور محققوں کو ایک دوسرے کی یونیورسٹیوں میں داخلہ کی اجازت دی جائے۔

○ فنون لطیفہ کے فروغ کے لئے آرٹسٹوں کو ایک دوسرے سے آزادانہ ملنے اور مشترکہ پروگرام بنانے کی اجازت دی جائے۔

○ دونوں ملکوں کے درمیان ڈاک کی سہولتوں میں اضافہ کیا جائے تاکہ اخبارات، رسالے اور کتابیں جلد از جلد دونوں ملکوں میں ترسیل ہو سکیں۔

آج کی اس محفل میں شامل پڑھے لکھے بھارتی اور پاکستانیوں کے درمیان تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ جیسے یہ ساری جدوجہد صرف یہ سمجھانے کے لئے کی جا رہی ہے کہ ماضی کو بھول جاؤ، کسی بڑی تبدیلی کی امید نہ رکھنا جو کچھ تمہارے پاس ہے اسے بھی ہم اپنا ہی سمجھتے ہیں۔ ایک دن ہمیں پھر ایک ہو جانا ہے دھرتی پر نئی لکیریں زیادہ دیر تک نہیں رہیں گی۔ لیکن جب ان سے پوچھیں کہ اپنے پنجاب کے آپ نے تین حصے کیوں کئے۔ یہ نئی لکیریں آپ نے کیوں کھینچیں تو موضوع بدلتے یا ادھر ادھر کھسکنے کی کوشش کرتے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیں۔خود پاکستانی وفد میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی جو محض دو تین دن کی ''محبتوں'' سے متاثر ہو کر نمستے، ست سری اکال اور جے رام جی کی پر اتر آئے تھے اور ان کی ہاں میں ہاں ملاتے نظر آتے تھے۔

ایک بڑے اردو اخبار کے نیوز رپورٹر تو ہندو ''دیویوں'' کو دیکھ دیکھ کر ریشہ خطمی ہو رہے تھے۔کئی نازیبا حرکات کے مرتکب بھی ہوئے جب ساتھیوں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تو وہ ''الف'' ہو گئے۔ایک دو حضرات کے علاوہ مجموعی طور پر پورے وفد نے وقار اور متانت کا بھرپور مظاہرہ کیا۔فلمی صنعت سے وابستہ خواتین و حضرات بھی پورے وقار کے ساتھ رہے۔بہار بیگم اور غلام محی الدین کی گفتگو تو ہر جگہ نہایت سلجھی ہوئی تھی۔اس فد میں شامل زیادہ تر خواتین و حضرات کا تعلق اخبارات سے تھا۔پنجابی کے شعراء اور ادیب بھی تھے۔مذکورہ صحافی شرمندگی کا باعث ہوئے۔کہتے ہیں سفر میں انسان کو پرکھنے کا موقع ملتا ہے اور اس بات کی صداقت کھل کر سامنے آئی۔

شام چھ بجے ٹیگور تھیٹر پہنچے۔کلچرل پروگرام میں پاکستانی اور بھارتی پنجاب کے لوک فنکاروں نے گیت سنگیت کی محفل سجائی۔اس موقع پر پاکستان کی روزینہ کوثر' نازریں سلمان ' مشرقی پنجاب کی ماضی کی معروف گلوکارہ سریندر کور کی بیٹی ڈولی گلہریہ کے علاوہ متعدد مقامی فنکاروں نے حصہ لیا،موسیقی کا پروگرام جاری تھا کہ اعلان ہوا۔بسوں میں بیٹھ جائیں۔مغل گارڈن پنجور میں وزیراعلیٰ ہریانہ اوم پرکاش چوٹالہ کی طرف سے عشائیہ دیا جا رہا ہے۔موسیقی کا پروگرام وہیں جاری رہے گا۔

نو بجے پنجور پہنچے۔یہ قلعہ نما عمارت مغل بادشاہوں کے کسی وزیر نے بنوائی تھی۔اسے اب عوام کے لئے کھول دیا گیا ہے۔ہمارے شالا مار باغ کا چھوٹا ماڈل لگتا ہے۔اندر ایک فور سٹار ہوٹل اور مارکیٹ بھی موجود ہے۔اندر پہنچے تو بھرپور اور شاندار اہتمام نظر آیا۔ایک طرف سٹیج اور سامنے رنگا رنگ نشستیں مرتب تھیں لیکن مہمانوں کے آنے سے پہلے ہی میزبانوں نے فرنٹ کی نشستوں پر قبضہ جما لیا تھا مہمانوں کو عقبی نشستیں ہی مل سکیں۔ابھی چیف منسٹر اوم پرکاش چوٹالہ نہیں آئے تھے۔ان کے بارے میں رات کو ایک نیوز چینل پر فلم

دکھائی جا رہی تھی۔اس میں ایک صحافی زخمی حالت میں بستر پہ پڑا تھا۔ہاتھوں پیروں پہ پٹیاں بندھی تھیں۔وہ کہہ رہا تھا کہ مجھے چوٹالہ کے آدمیوں نے لوہے کی لاٹھوں سے مارا ہے۔میں اپنی صحافیانہ ذمہ داری نبھانا چاہتا تھا۔مجھے بہت ڈرایا دھمکایا گیا۔لیکن میں خوف زدہ نہ ہوا تو پھر میرا یہ حال کر دیا گیا۔اس کے بعد اوم پرکاش چوٹالہ کا انٹرویو دکھایا گیا۔انہوں نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا کہ آخر میں ایسا کیوں کروں گا۔یہ سب کچھ محض کردار کشی اور اپوزیشن کا ڈرامہ ہے۔

عشائیہ میں ہریانہ کی پوری کابینہ موجود تھی۔تھوڑی دیر بعد چوٹالہ بھی آ گئے۔میرے ساتھ چنن سنگھ ورک بھی بیٹھے تھے۔انہوں نے بتایا کہ ان کا تعلق بھی سرسا سے ہے چوٹالہ صاحب کے والد بھی وزیراعلیٰ رہ چکے ہیں اور ان کے بارے میں آپ نے جو کچھ سنا ہے۔سب درست ہے۔یہ حضرت پیدائشی معذور ہیں۔پاؤں میں تکلیف رہتی ہے۔پھر بھی کھڑے ہو کر بھاشن دیا۔ان کی تقریر زبردست تھی۔زبان بیان پر اس قدر گرفت عوامی مقررین میں بہت کم ہوتی ہے۔ان کی تقریر کے بعد ہمارے فخر زمان صاحب کی تقریر بھی قابل داد تھی۔یہاں پنجاب' ہریانہ اور راجستھان کے لوک رقص پیش کئے گئے۔پاکستانی فلمی صنعت کی فنکارہ نازریں نے خوبصورت رقص پیش کیا اور حاضرین کو بتا دیا کہ کلاسیکی رقص کیا ہوتا ہے۔

اس تقریب میں تحائف کا تبادلہ بھی ہوا۔کھانے کے لئے پشت پر موجود گارڈن میں چلے گئے۔تاریکی میں موجود خواتین و حضرات کے چہرے صاف نظر نہیں آ رہے تھے لیکن ماحول خوب رومانٹک تھا۔انگور کی بیٹی سے دل بہلانے کا اہتمام بھی تھا۔ہمارے لوگوں کی اکثریت نے بھی کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔تقریب کے دوران ایک سردار جی مجھے ایک طرف لے گئے۔اور تصویر بنانے کی اجازت چاہی بولے کہ جس رسالے میں یہ تصویر چھپے گی اس کی ایک کاپی آپ کو بھجوا دوں گا۔تھوڑی دیر گفتگو کر کے میں واپس آ گیا تو وہ صاحب امتیاز راشد پر ڈورے ڈالنے لگے لیکن کامیابی نہ ہوئی۔امتیاز راشد کہنے لگے کہ یہ لوگ ایجنسی کے آدمی ہیں۔شکار کی تلاش میں رہتے ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہاں بھی اکثریت ہندوؤں کی تھی، لیکن کچھ گریزاں تھے۔ سکھوں اور ہندوؤں کا پاکستانی وفد کے ساتھ رویہ بہت مختلف تھا۔ لوگ آپس میں گھل مل کر باتیں کر رہے تھے۔ چیف منسٹر صاحب کی سیکورٹی کا سخت انتظام تھا۔ چوتالہ صاحب سیکورٹی اور معذوری کے پیش نظر وہ کھانے کی محفل میں نہ آئے۔ الگ کمرہ میں فخر زمان کے ساتھ چند لمحے گزارے اور واپس چلے گئے۔ ہم لوگ کچھ دیر ادھر ادھر گھومتے رہے۔ احباب نے تصویریں بنائیں۔ مقامی لوگوں سے بھارتی اور بین الاقوامی سیاست پر نوک جھونک ہوتی رہی۔ ہوٹل کو واپسی پر ہماری بس میں ایک سردار جی سوار ہو گئے۔ سب کو مخاطب کر کے اعلان کیا کہ مجھے پہچان لو۔ 2007ء میں بھارت کا راشٹر پتی میں ہونگا۔ میں نے ان سے کہا سردار جی۔ دن کو بارہ بجے تو اس طرح کی گفتگو کا پس منظر سمجھ میں آتا ہے۔ اب رات کو بارہ بجے بھی آپ موج میں آجاتے ہیں؟ سردار جی جھینپ گئے۔ سبھی ساتھی میری بات پہ محظوظ ہوئے۔ کانفرنس ختم ہو گئی اور اب اگلے مرحلہ کا اعلان کل ہوگا۔

دہلی کے درشن

31 مئی 2004ء

صبح نو بجے خبر آئی کہ جو لوگ امرتسر کے راستہ واپس جانا چاہتے ہیں۔ ان کا نیچے انتظار ہو رہا ہے۔ واہگہ جانے کے لئے تین بسیں تیار کھڑی ہیں۔ جو لوگ دہلی جانا چاہتے ہیں۔ وہ اندراج کیلئے نیچے آجائیں۔ ہم لوگوں نے دہلی جانے کا فیصلہ پہلے سے کر رکھا تھا۔ متعلقہ لوگوں کو مطلع کرنے کے لئے نیچے آئے۔ اندراجات میں دس بج گئے۔ دہلی جانے والوں کو بتایا گیا کہ پنجاب سرکار نے دہلی کے پنجاب بھون میں 25 ائیر کنڈیشنڈ کمرے محفوظ کرا دیئے ہیں۔ کچھ دن کے بعد ہم سوئے دہلی رواں دواں تھے۔

دائیں بائیں کے مناظر میں کھیت کھلیان، چھوٹی بڑی بستیاں اور کہیں کہیں فیکٹریاں نظر آ رہی تھیں۔ جالندھر، لدھیانہ، پانی پت سے گزرے۔ جی چاہا کہ بوعلی قلندر کے مزار پر حاضری دی جائے لیکن بسوں پہ سرکار کا کنٹرول تھا۔ ہر بس میں ایک سپاہی سوار تھا اور ڈرائیور کو شیڈول کے بغیر کہیں رکنے کی اجازت نہیں تھی۔ سونی پت سے پہلے "شان پنجاب

ڈھابا" آیا جہاں مندوبین کو اپنی جیب سے کھانے پینے کی اجازت تھی۔ یہ کسی بھی طرح غیر اخلاقی بات نہیں تھی لیکن اتنے دنوں سے مہمانوں کی طرح رہتے ہوئے اب یہ کچھ عجیب لگ رہا تھا۔ یہ جدید ڈھابا سلیقے سے بنایا گیا تھا اور ضرورت کی تمام باتوں کا خیال رکھا گیا تھا۔ یہاں سے فریش ہو کر دہلی کی طرف آگے بڑھے۔ ٹریفک زیادہ اور سڑک سنگل ہونے کی وجہ سے بسیں آہستہ آہستہ دہلی کی طرف رواں تھیں۔ جب یہ ہم لوگ ڈھابے سے اٹھ رہے تھے تو ایک صاحب نے روک لیا اور کچھ لوگوں سے تعارف کروایا۔ بتایا کہ یہ لوگ میو ہیں اور مسلمان ہیں۔ 1970ء تک پاکستان میں رہے تھے۔ ان میں سے ایک صاحب پارٹی پارلیمنٹ میں MLA تھے۔ ان سے بات ہوئی۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ کیا وفد میں کوئی میو برادری کا فرد ہے۔ میں نے اپنا تعارف کرایا اور بتایا کہ میرا آبائی گاؤں رسول پور ہے اور میں اس علاقہ میں آباد سادات خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے کہ آپ کا گاؤں رسول پور آج بھی اپنی حویلیوں اور پکے مکانات کی بدولت محفوظ ہے۔ آپ دہلی جا رہے ہیں۔ اپنے آبائی علاقے میں ضرور جایئے۔

دہلی یا دیگر علاقوں میں ہمیں جو مسلمان ملے وہ اب بہت پر اعتماد اور قدرے مطمئن نظر آتے ہیں۔ پندرہ سال پہلے جب میں نے بھارت کا سفر کیا تو صورت حال ایسی نہیں تھی۔

پنجابی کانفرنس کے مندوبین کو لیکر دہلی جانے والی بسیں بالآخر مضافات میں پہنچ گئیں۔ دہلی پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔ جمنا کا حال بھی راوی جیسا نظر آیا۔ پانی سے محروم یہاں اب بنگالی مسلمانوں کی جھونپڑیاں تبتی بدھوں کی جھونپڑیاں، دوسرے صوبوں سے روزگار کی تلاش میں آنے والوں کے رہن بسیرے۔ یوں دہلی شہر میں داخلہ غربت افلاس اور بھوک ننگ کے راستے سے ہو رہا تھا۔ شہر میں آ کر ڈرائیور راستہ بھول گئے۔ ایک گھنٹہ تک بسیں گھومتی رہیں پھر خدا خدا کر کے پنجاب بھون ملا۔ یہاں اترتے ہی ایک نیا مسئلہ درپیش تھا۔ بتایا گیا کہ کل شام کو یہ بسیں واپس جائیں گی۔ گویا دہلی کو ہاتھ لگانے کی بات تھی۔ ہاتھ لگانے کے لئے تو ایک رات اور ایک دن کافی ہوتے ہیں لیکن دیکھنے سمجھنے کے لئے تو کچھ بھی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نہیں۔ میں نے اور غوری صاحب نے فیصلہ کیا کہ ہم مزید دو دن ٹھہریں گے۔ اور اب جو کمرہ لینا چاہا تو معلوم ہوا کہ آٹھ سو روپے نقد ادا کرنے پر الاٹ ہو گا کیونکہ پنجاب سے افسران نے انہیں کوئی پیغام نہیں بھیجا تھا۔ پنجاب بھون کی انتظامیہ کو علم نہیں کہ وہاں سرکاری مہمان بھجوائے جا رہے ہیں چنانچہ نقد ادائیگی کی اور کمرہ بک کرایا۔ میرے چنڈی گڑھ کے روم میٹ اظہر غوری کمرے میں چلے گئے اور میں سلیم پاشا کو لیکر پنجاب بھون کی ڈسپنسری کی طرف چل دیا۔ سلیم پاشا ہمارے معروف جرنلسٹ ہیں۔ ان کی طبیعت خاصی نڈھال ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر نے سلیم پاشا کو چیک کرنے کے بعد مکمل آرام کا مشورہ دیا۔ رات گئے میں کمرے میں آیا تو کمرے کے باسی چار عدد ہو چکے تھے۔

یکم جون 2004ء

جیسے تیسے رات بسر کر کے میں صبح کی نماز کے بعد سلیم پاشا کو بھی اپنے کمرے میں لے آیا تا کہ وہ اطمینان سے آرام کر سکے۔ لیکن وہ دہلی دیکھنے کے شوق میں ہم سے بھی پہلے تیار ہو کر نیچے آگئے۔ بڑی مشکل سے انہیں ڈاکٹر سے مشورہ کے لئے بھجوایا روک پبلشرز ایسوسی ایشن انڈیا کے صدر ظفر علی کے ساتھ ان کے دفتر دہلی دروازہ کو روانہ ہو گئے۔ یہاں ان کے ساتھ بھارت میں اردو' لائبریریوں کی صورتحال اور ناشرین کے حالات پہ تفصیلی گفتگو ہوئی۔ ضروری جانکاری کے بعد ہم لوگ بازار کی طرف نکلے۔ کچھ کرنسی تبدیلی کرائی۔ دہلی میں ایک بھارتی روپے کے عوض 1.35 پاکستانی روپے کا ریٹ تھا۔ یہی اٹاری اور لاہور میں بھی ہے۔ چتلی قبر سے ہوتے ہوئے ہم ''جامع مسجد'' پہنچے۔ ایک مشہور ہوٹل سے کھانا کھایا۔ میرے ساتھ اظہر غوری اور جنگ کے امتیاز راشد تھے۔ ہم نے بازار سے بچوں کے لئے کچھ چیزیں خریدیں اور واپسی پر لے جانے کے لئے وہیں رکھوا دیں۔ بازار کا جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھے۔ اندازہ ہوا کہ اب مسلمان پندرہ برس پہلے جیسا مایوس اور پریشان نہیں ہے۔ اب اسے ایک خاص اعتماد اور اپنی قوت پر بھروسہ محسوس ہوتا تھا۔ ماحول میں بھی پہلے جیسی گھٹن نہیں تھی۔ یہ سارا علاقہ مسلمانوں کا ہے لیکن ان علاقوں میں بھی جہاں مسلمان اکثریت میں نہیں وہاں بھی حالات بدلے ہوئے ہیں۔ نئی نسل تعلیم سے آراستہ اور کاروبار

میں بہتر پوزیشن رکھتی ہے۔ حالیہ الیکشن نے انہیں نئی زندگی دی ہے کہ بھارت میں مسلمانوں کی تعداد 30 کروڑ سے زیادہ ہے۔ اپنے آخری دور میں بی جے پی حکومت نے مسلمانوں کے دل جیتنے کے بہت جتن کئے لیکن بابری مسجد کے انہدام سے لیکر گجرات میں مسلمانوں کے قتل عام تک اندوہناک واقعات کا ایک تسلسل مسلمانوں کے سامنے ہے ہر جگہ ان واقعات کا اظہار دکھ کے ساتھ ہوتا ہے۔

جامع مسجد میں ظہرین کی نماز پڑھنے کے لئے چلا گیا۔ سخت گرمی اور دھوپ سے گرم فرش پہ پاؤں جھلس گئے۔ ایک بوسیدہ پھٹی پرانی دری کی لکیر سی پڑی ہے۔ اس پر پانی ڈال کر ٹھنڈا کرنے کا انتظام بھی نہیں۔ مسجد کی حالت دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ اس مسجد سے لاکھوں روپے کی ماہانہ آمدنی ہوتی ہے۔ لیکن مسجد کے نگران اور پیش امام' امام بخاری بے نیاز دکھائی دیتے ہیں۔ امام بخاری مسلمانوں کے لیڈر بھی ہیں۔ حکومت انہیں خاص مقام دیتی ہے ان کے زیر استعمال دفتر دیکھا۔ یہ شاندار دفتر ائیر کنڈیشنڈ ہے اور وسیع و عریض مسجد کے نیچے عقب میں واقع ہے۔ امام صاحب کے زیر استعمال گاڑیوں کا ایک فلیٹ موجود ہے جو نئے ماڈل کی سترہ گاڑیوں پر مشتمل ہے۔ مسجد کی حالت دیکھ کر رونا آیا اور پیش امام کا دفتر دیکھ کر بے اختیار ہنسی آئی۔ مسجد رکھے گئے پیڈسٹل فین اور دیگر پنکھے 1857ء کے زمانے کے معلوم ہوتے ہیں۔ مسجد میں نہ صفیں ہیں اور نہ دریاں۔ جگہ جگہ لوگ آرام کرتے نظر آ رہے تھے۔ ایک بدزبان آدمی انہیں ڈانٹ ڈپٹ کرتا دکھائی دیا۔ دروازوں کے ساتھ اور مسجد میں جگہ جگہ عطیات کے لئے صندوق رکھے تھے۔ ایک صندوق جو پیش امام کی مسند کے ساتھ رکھا تھا میں نے اس میں 100 روپے اس خیال سے ڈال دیئے کہ شاید یہ پیسہ مسجد کی بہتری کے کام آجائے۔ معلوم ہوا کہ بھارت سرکار نے بھی ایک مسلم اوقاف کے نام سے محکمہ قائم کر رکھا ہے لیکن امام بخاری نے کبھی مسجد کی دیکھ بھال کے لئے آواز نہیں اٹھائی۔ دہلی کے مسلمان بھی امام بخاری سے ناراض ہیں کیونکہ انہوں نے الیکشن میں بی جے پی کی حمایت کا اعلان کیا تھا۔ امام بخاری آجکل دہلی سے باہر ہیں۔ اگر موجود ہوتے تو ان سے ملاقات ضرور کرتا۔ پچھلے دنوں وہ ایک پراسرار دورہ پر اسلام آباد آئے تھے۔ یقیناً واجپائی کے پیغام

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بر کے طور پر لیکن انہیں کوئی خاص اہمیت نہ مل سکی۔ اگر بھارت چاہے تو امن دوستی اور بھائی چارہ قائم ہوسکتا ہے۔ عدل و انصاف کو بنیاد بنالیا جائے تو سارے مسئلے حل ہو سکتے ہیں۔ 56 سال کی کشمکش اور لڑائیوں کے باوجود اگر بھارت سرکار پرانا راگ الاپنا چاہتی ہے تو پھر جو نتیجہ 56 سال میں نہیں نکلا وہ اگلے سو برس تک نہیں نکل سکتا۔ آنے والے وقت میں شاید زیادہ تباہ کن صورت حال پیدا ہو جائے۔ امریکہ کی مثال سامنے ہے۔ افغانستان اور عراق میں تباہی پھیلانے کا انجام یا انعام اسے مل رہا ہے۔ ساری دنیا کی نفرت اور جانی و مالی نقصان مسلمانوں سے مستقل دشمنی اسی پالیسی کا ماحصل ہے جو بش اور اس کے ساتھیوں نے اختیار کر رکھی ہے۔ اسرائیل کی عیار قیادت نے امریکہ کو اس جنگ میں دھکیلا ہے۔ انجام کار اس کو بھی قیمت چکانا ہوگی۔

جامع مسجد کی حالت پر کف افسوس ملتے ہم لوگ باہر نکلے تو دروازہ پر دو پاکستانی فلم ساز/فلم سٹار مل گئے۔ وہ بھارت کے ساتھ مشترکہ فلم سازی میں ''اک کڑی پنجاب دی'' بنا رہے ہیں۔ یہ حضرات پرانے شناسا، کلاسیک اور بھٹو صاحب کے شیدائی ہیں۔ مل کر خوش ہوئے بھرپور محبت کا مظاہرہ کرتے رہے۔ واپسی پر خریدی ہوئی چیزیں لیں۔ غوری صاحب نے بڑی مدد کی سارا سامان خود اٹھالیا۔ ان کی سعادت مندی ناقابل بیان ہے۔ ان کے لئے بے اختیار دل سے دعا نکلتی ہے۔ مختلف گلیوں سے ہوتے ہوئے واپس ظفر علی خان صاحب کے دفتر میں پہنچے۔ وہاں چائے سے فارغ ہوئے تو ایک کیریکٹر سے ملاقات ہوئی۔ یہ صاحب ریٹائرڈ سکول ماسٹر تھے۔ شملہ سے تعلق تھا۔ اردو زبان کے شاعر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ بیک وقت تین مجموعہ ہائے کلام چھپوا کر نوبل انعام حاصل کرنے کا یقین رکھتے ہیں۔ ان کی پریشانی یہ تھی کہ اگر بیوی زندہ ہوتی تو انعام کی رقم سنبھال لیتی۔ اب چونکہ وہ حیات نہیں ہے اس لیے کتابوں کی اشاعت کے ساتھ ہی دوسری شادی بھی ضروری ہے۔ ہندو دھرم میں دوسری بیوی کی گنجائش نہیں۔ اس لئے ہم نے مشورہ دیا کہ بھائی شادی کرنا ضروری ہے تو مسلمان ہو جاؤ پھر بھلے چار شادیاں رچاؤ لیکن میر صاحب مانتے ہی

نہیں۔

کچھ گپ شپ کے بعد واپس پنجاب بھون پہنچے تو دیکھا بسیں واہگہ جانے کے لئے تیار ہیں۔ 175 افراد دہلی آئے تھے۔ ان میں سے بیشتر اپنا سامان لوڈ کروا رہے تھے یقیناً وہ دہلی کو ہاتھ لگانے آئے تھے۔ ہم پہلے ہی فیصلہ کر چکے تھے کہ مزید دو روز رہیں گے۔ اعزاز آذر صاحب نے بتایا کہ سلیم پاشا کو دل کا دورہ پڑا تھا چنانچہ ہسپتال میں داخل کرادیا گیا ہے ان کے ساتھ ایک آدمی رہے گا اور پھر انہیں بذریعہ ہوائی جہاز لاہور بھجوا دیا جائے گا۔ احمد بشیر صاحب کی بیٹی محترمہ پروین عاطف ابھی ابھی شملہ سے دہلی آئی تھیں۔ حیرت ہے کہ اب پھر واہگہ والی بس میں بیٹھنے کو تیار تھیں۔ شملہ کے سفر کی جو داستان انہوں نے سنائی وہ بذات خود اعصاب شکن تھی۔ بہر حال شوق کا کوئی مول نہیں ہوتا۔

ہم مزید دو روز کی بکنگ کے لئے کاؤنٹر خالی ہونے کا انتظار کر رہے تھے کہ اظہر غوری نے بتایا کہ ستیہ پال جی کی خواہش ہے کہ ہم ان کے مہمان بنیں اور ان کے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہریں۔ ان کے اصرار پر سامان اٹھایا اور ان کی گاڑی میں گیسٹ ہاؤس آگئے۔ وہ ایک سرونٹ دی پیپلز سوسائٹی کمپلیکس چلا رہے ہیں۔ جس میں ایک ہائی سکول، ایک ہومیو ایک فزیو اور ایک ایلوپیتھی کی ڈسپنسری ہے۔ کئی رفاہی پراجیکٹ بھی چل رہے ہیں۔ ستیہ پال جی ہمیں اپنے ساتھ گھر میں کھانے کے لئے لے گئے۔ کچھ دیر گپ شپ کی پھر اپنے کمرے میں آگئے۔ صبح صبح ان کے باورچی نے چائے پیش کی اور ناشتہ کے لئے بتایا کہ آپ کچن میں آجائیں۔ دس بجے تک یہاں کھانا اور رہائش مفت ہے۔ یہ کمپلیکس لالہ لاجپت رائے کی یاد میں تعمیر ہونے والے لاجپت بھون اور لاجپت نگر نئی دہلی میں واقع ہے۔ لاجپت نگر فیز I تا IV میں بے شمار فلیٹس ہیں یہ علاقہ دہلی کا پرانا بہرام کوٹلہ کہلاتا ہے۔

ناشتے سے فارغ ہو کر ہم ستیہ پال جی کے پاس پہنچے۔ چند کتابوں کا تحفہ انہیں پیش کیا۔ انہوں نے اپنی ذاتی لائبریری دکھائی۔ بیشتر کتابیں اردو میں اور پاکستان کی چھپی ہوئی تھیں۔ پھر انہوں نے سرونٹ آف دی پیپلز پراجیکٹ کا معائنہ کرایا۔

2 جون 2004ء

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آج بھی موسم لاہور کی طرح سخت گرم تھا۔ دہلی شہر بھی دوسرے بڑے شہروں کی طرح پھیل چکا ہے۔ جمنا کسی زمانے میں ایک زندہ دریا تھا۔ اب گندہ نالہ بن چکا ہے۔ دونوں کناروں پر جھونپڑیاں ہیں۔ اب ایسے ہے جیسے کسی زمانے میں لاہور کا بڈھا دریا تھا۔ پچھلے پندرہ برسوں میں بھارت بہت زیادہ ''روشن'' ہو چکا ہے۔ جگہ جگہ ترقی کی روشنی پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔ ایک طرف پرانا دہلی ہے۔ چاندنی چوک سے باڑہ ہندواڑ تک......اور سبزی منڈی سے فتح گڑھ تک تمام علاقہ تل دھرنے کو جگہ نہیں کی صورت گنجان ہے۔ سڑکیں ٹوٹی ہوئی، جگہ جگہ گندگی کے ڈھیر، دکانیں خریداروں سے خالی۔ ان کے ایجنٹ خریداروں کی تلاش میں لوگوں کے پیچھے دوڑتے پھرتے ہیں۔

بچپن کی یادیں مجھے اپنے آبائی مکان کی طرف لے گئیں۔ اس علاقہ میں پہنچا تو اپنے تصورات کا حشر نشر ہو گیا۔ محلہ عزیز گنج سے نکل کر باہر ایک بک شاپ پر اپنا تعارف کرایا۔ یہاں کی بڑی نہر' کھلے میدان' دہلی ٹیکسٹائل ملز' گورنمنٹ ہائی سکول' ریلوے پل' سبزی منڈی اور بچپن کے دیکھے تمام علاقے کی دست برد سے تنگ وتاریک ہو چکے تھے۔ یہاں ایک موٹا سکھ بیٹھا ہوا تھا حال ہی میں پاکستان سے ہو کر آیا تھا۔ پاکستان کی بہت تعریف کر رہا تھا۔ بہت دیر کھل کر باتیں کرتا رہا۔ اس نے اپنے بال دہلی میں سکھوں کے قتل عام کے موقعہ پر کٹوا کر جان بچائی تھی۔ جس بک شاپ پہ بیٹھے تھے وہ ایک مسلمان کی تھی۔ اس نے سامنے مسلمان دکاندار کو آواز دی۔ زبردستی چائے سے تواضع کی۔ سڑک پر اخبارات رکھے تھے۔ چند ایک اردو اخبارات خریدے۔ اخبارات کی قیمتیں بہت کم ہیں۔ ہمارے اخبارات تو اپنے قارئین سے اشتہارات کی قیمت بھی وصول کر لیتے ہیں۔ یہاں اردو' ہندی اور انگریزی اخبارات میں اشتہارات کی بھرمار ہے لیکن قیمت صرف دو تین روپے۔

آٹو رکشا لیکر ظفر علی صاحب کی طرف دہلی گیٹ آئے۔ ان سے کاروباری گفتگو کی۔ کچھ باتیں طے کیں۔ کتابوں کی فہرست جمع کیں۔ یہاں سے جامع مسجد کے علاقہ کا ارادہ کیا ظفر صاحب نے اپنے بیٹے کو ساتھ بھیج دیا۔ طے کیا کہ کناٹ پلیس کا علاقہ دیکھا جائے پھر آٹو میں بیٹھے اور کناٹ پلیس پہنچ گئے۔ رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ یہ علاقہ آزادی کے

بعد سے اب تک بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ تمام اچھے بک شاپ' بنک اور کاروباری ادارے یہیں پر ہیں۔ شراب کے خوبصورت بار اور شباب کا پورا اہتمام یہاں موجود ہے۔ ہم اسے لاہور کی لبرٹی مارکیٹ کہہ سکتے ہیں۔ یہاں بھی دہلی میٹرو کا کام جاری ہے۔ کھدائی ہو رہی ہے۔ 2007ء تک زیر زمین ٹرین چلنا شروع ہو جائے گی۔ آج کا دن بہت مصروف گزرا۔ چاندنی چوک سے ''گلاب سنگھ جوہری مل سے عطر گلاب خریدا۔ چند ساڑھیاں اور بچوں کے لئے تحفے تحائف خریدے۔ کل دہلی میں آخری دن ہو گا۔ خواجہ نظام الدین اولیاء کے مزار پر فاتحہ خوانی کے ساتھ ابتداء کریں گے۔ ستیہ پال جی نے اپنا آدمی بھیج کر ''صدی'' ایکسپریس کے ذریعے امرتسر کیلئے سیٹیں بک کروا دی ہیں۔

آج کی دوپہر ہم نے ہمایوں کے مقبرے پہ گزار دی تھی۔ پچھلی دفعہ جب میں یہاں آیا تو یہ ایک کھنڈر تھا۔ اب شکل بدلی ہوئی ہے۔ 30 ایکڑ پر پھیلا ہوا یہ عظیم الشان مقبرہ بحال کر دیا گیا ہے۔ یونیسف نے زرکثیر صرف کیا ہے۔ تقریباً اسی فیصد کام ہو چکا ہے۔ اسی طرح دہلی کے دیگر تاریخی مقامات کو بھی محفوظ کیا جا رہا ہے۔ جگہ جگہ مسلم تہذیب کے نشانات موجود ہیں۔ تعصب کی ایک جھلک ہم نے ہمایوں کے مقبرہ میں دیکھی۔ یہاں تزئین و آرائش سرخ پتھر سے کی جا رہی ہے۔ دروازوں پر نظر پڑی تو دیکھا اسرائیل کا قومی نشان چھ کونوں والا ستارہ دونوں سروں پر ایستادہ ہے۔ گویا اسرائیل سے خصوصی دوستی جس کی بنیاد پاکستان اور مسلم دشمنی پر ہے۔ اپنا رنگ تاریخی اثاثوں میں دکھا رہی ہے۔ آج کل مقبرے پر 10 روپے فی کس داخلہ ٹکٹ ہے۔ یہاں فضول وقت ضائع کرنے والے نہیں آتے۔ شام کو ایک مقام پر چند کانگریسی سرکردہ افراد سے ملاقات ہوئی۔ تو میں نے ان سے کہا کہ ''سونیا جی کو میری ایک تجویز پہنچا دیں۔ وہ ہمہ تن گوش ہو گئے۔ میں نے ان سے کہا کہ ہمایوں کے مقبرے پر تعمیر نو کے نام پر واجپائی سرکار نے یہ کام دکھایا ہے۔ ابھی 20 فی صد کام باقی ہے۔ سونیا جی مسیحی ہونے کے ناطے اس مقبرہ پر جگہ جگہ صلیبیں آویزاں کرا دیں۔ مستقبل میں آنے والا سیاح کنفیوز ہو جائے گا۔ اسے الجھن رہے گی کہ ہمایوں مسلمان تھا، عیسائی تھا یا یہودی۔ یہ کنفیوژن بھارت میں مسلم تاریخ کے اثرات ختم کرنے میں بہت مددگار ثابت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہوگی۔ یہ لوگ کچھ دیر سکتے میں رہے اور پھر بولے کیا واقعی ایسا ہے۔ میں نے کہا آپ کا شہر ہے جا کر دیکھ لیں۔ میں تو چند روز کے لئے آیا ہوں جو میں نے دیکھا یا محسوس کیا وہ بیان کر دیا ہے مجھے کیمرے کی کمی ایک بار پھر شدت سے محسوس ہوئی۔

ہمارے دوست ستیہ پال جی نے نہ صرف ہماری سیٹیں بک کروادی تھیں بلکہ امرتسر میں ایک رات ٹھہرنے کا بندوبست بھی کر دیا تھا۔ امرتسر میں من جیت سنگھ جی کو فون کر کے بتا دیا کہ کل رات دس بجے دو مہمانوں کو اسٹیشن سے وصول کرنا ہے۔

ایک تبدیلی جو ہم نے امرتسر' جالندھر اور چندی گڑھ سے گزرتے ہوئے محسوس کی تھی اور جو ہمیں سونی پت' پانی پت' لدھیانہ اور پھر دہلی میں بھی واضح طور پر محسوس ہوئی وہ ہندو سماج کے مٹتے ہوئے قدیم نشانات ہیں۔ کسی جگہ بھی گئو ماتا نظر نہیں آئی۔ بندر یعنی ہنومان جی بھی دہلی میں ایک آدھ ہی نظر آئے۔ دھوتی بھی غائب ہو چکی ہے۔ چاندنی چوک میں چند پرانے بنیوں کے سوا ہر جگہ پینٹ شرٹ نظر آ رہی تھی۔ چند ایک زہریلے ہندوؤں سے بھی بات ہوئی وہ سب ہی الیکشن کے نتائج پر پریشان نظر آ رہے تھے۔ جمہوریت کے بارے میں ان کی رائے اب متزلزل محسوس ہوئی۔ آنے والے برسوں میں بھارت میں کیمونسٹ راج قائم ہونے کے امکانات زیادہ ہیں۔ سونیا جی کانگریس کی پردھان ہیں۔ چار سال بعد آنے والے انتخابات میں راہول اور پریانکا خود میدان میں اتر سکیں گے۔ دیکھا جائے تو ہندوستان کی تمام مصیبتوں کی جڑ کانگریس ہے۔ پاکستان کے ساتھ زیادتیوں اور جنگوں کی تمام تر ذمہ داری کانگریس پر ہی عائد ہوتی ہے۔ نٹور سنگھ ایک زہریلا ہندو ہے۔ اس کے بیانات امن کے عمل کو ٹھکانے لگانے کی مہم کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ روشن چمکدار بھارت کی منزل ابھی بہت دور ہے۔ آج ہم نے آٹو رکشہ میں بیٹھے بیٹھے ہی لال قلعہ اور دوسرے تاریخی مقامات کی سیر کر لی۔ پاؤں میں تکلیف کی وجہ سے زیادہ پیدل چلنا ممکن نہیں تھا۔ رات خوب گہری نیند آئی۔

3 جون 2004ء

صبح صبح ستیہ پال جی نے ٹرین کی ٹکٹیں ہمارے حوالے کر دیں۔ وہاں ڈسپنسری میں

ڈاکٹر کو اپنا پاؤں دکھایا۔ اس نے ڈسپنسر کو بلا کر پٹی کرنے اور دوا دینے کی ہدایت کر دی۔ کچھ دیر بعد اس نے معذرت کی کہ جو دوا ڈاکٹر صاحب نے تجویز کی ہے وہ ڈسپنسری میں موجود نہیں ہے۔ آپ بازار سے خرید لیں۔

آٹو لیا اور سیدھے خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے دربار پہنچے۔ گلی کے سرے پر غالب کا مزار اور غالب اکیڈمی ہے۔ یہاں جمیل صاحب ملے۔ سخت پریشان تھے۔ کراچی کے حالات کی وجہ سے ان کا خیال تھا کہ کراچی میں شیعہ سنی فساد ہو رہا ہے۔ یہ تاثر انہیں بھارت کے نیوز چینل دے رہے تھے۔ ان کی خواہش ہے کہ کاش ایسا ہو جائے۔ جمیل صاحب کو بڑی مشکل سے صحیح صورت حال سے آگاہ کیا۔ شروع میں چند تلخ جملوں کا تبادلہ بھی ہوا۔ یہ تین منزلہ عمارت حکیم سعید کے بڑے بھائی نے بنوائی تھی۔ یوسف دہلوی اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ لیکن ہمدرد کا نام سر بلند کر گئے ہیں۔ ہمدرد نگر کی بہت تعریف سنی ہے۔ اس میں ایک یونیورسٹی بھی ہے جو سنا ہے اب حکومت کے حوالے کی جا رہی ہے۔ غالب کا مزار بھی اس عمارت سے ملحقہ پلاٹ میں ہے۔ اسے کافی بہتر حالت میں رکھا گیا ہے۔ غالب اکیڈمی میں دیوان غالب کا جرمن ایڈیشن نہیں تھا۔ وہ جمیل صاحب کو پیش کیا۔ یہ جمیل صاحب جون ایلیا' رئیس امروہوی کے خاندان سے ہیں۔ کراچی کے حالات پر ان کی تڑپ پاکستان سے دلی تعلق اور محبت کی علامت تھی۔

خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کا مزار مبارک اب بہت بہتر حالت میں ہے۔ یہاں فاتحہ خوانی کے بعد منسلک تاریخی مسجد میں ظہر عصر کی نماز پڑھ کر باہر آنے لگا تو موذن (غالباً) یا کسی اور نے مجھے کہا کہ آپ ان سے مل لیں (ایک طرف اشارہ کیا۔ جہاں چند لوگ بیٹھے تھے) مجھے اس کا یہ انداز اچھا نہ لگا۔ میں نے اسے جھاڑ دیا اور باہر آ گیا۔ یہاں سے نکل کر ایک صاف ستھرے ہوٹل میں کھانا کھایا۔ دو بج چکے تھے۔ واپس گیسٹ ہاؤس آئے۔ سامان پیک کیا۔ ستیہ پال جی سے الوداعی ملاقات کی۔ آٹو میں بیٹھے اور بصد مشکل 4.30 بجے نئی دہلی ریلوے سٹیشن پہنچے۔ سیٹیں ریزرو تھیں اس لئے اطمینان سے بیٹھ گئے۔ اب نیا سفر شروع ہوا۔ لیکن ذہن میں اردو بازار' داریبہ کلاں' چاوڑی بازار وغیرہ گھوم رہے تھے۔ ٹرین امرتسر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے لئے بروقت روانہ ہوئی۔ چند لمحوں بعد منرل واٹر کی ٹھنڈی بوتلیں اور گلاس تقسیم کئے گئے۔ پھر وقفے وقفے سے تابڑ توڑ کھانے وغیرہ پیش کرنے کا عمل شروع ہوا۔ حتیٰ کہ دس بج گئے۔ آخری آئیٹم آئس کریم تھی۔ دس بج کر دس منٹ پر گاڑی امرتسر پہنچ گئی۔ یعنی بیس منٹ پہلے۔

اسٹیشن سے باہر آئے تو من جیت سنگھ جی منتظر تھے۔ انہوں نے ہمارا سامان اپنی گاڑی میں رکھا اور اپنے گھر لے گئے۔ ان کا گھر رنجیت سوسائٹی میں ہے۔ ہمارے ڈیفنس جیسا علاقہ ہے۔ گھر کے دروازے پر اسلام علیکم کی آواز سنائی دی۔ یہ ہمارے دوست پروفیسر شاہد تھے جو پچھلے چند روز سے یہیں مقیم ہیں۔ اب ہمارے ساتھ پاکستان واپس جائیں گے۔ بیگم من جیت، ان کا بیٹا اور خود من جیت بضد تھے کہ کچھ تو کھاؤ۔ بڑی مشکل سے ایک آدھ کیلا کھایا چائے کا کپ پیا اور سو گئے۔

علی الصبح حسب معمول نماز کے وقت آنکھ کھل گئی۔ قبلہ کا تعین اندازے سے لیا اور نماز ادا کی۔ من جیت سنگھ اور ان کی بیگم نے صبح بیڈ ٹی پہنچائی اور ناشتہ کے بارے میں بات کی۔ 10 بجے تک تمام معمولات طے پا گئے۔ تب امرتسر شہر اور دربار صاحب دیکھنے نکلنے۔ سورج پوری تمازت کے ساتھ سر پر تھا۔ پیاس کے مارے برا حال تھا۔ من جیت سنگھ پوری مستعدی سے دربار صاحب کے بارے میں بتا رہے تھے۔ کار میں جوتے اتار کر دربار صاحب کے مین گیٹ کی جانب بڑھے۔ گرمی کی شدت نے سڑک کو انگارہ بنا رکھا تھا۔ جامع مسجد میں پاؤں جلنے کی یاد تازہ ہوگئی۔ دوڑ کر مین گیٹ میں داخل ہوئے۔ اندازہ ہوا کہ آگ پر ماتم کیسے ہوتا ہے۔ بابا گورونانک کی کتاب گرنتھ صاحب اور عقیدت کے مناظر نظر آئے۔ دربار صاحب کے وسط میں ایک بہت بڑی جھیل بنائی گئی ہے۔ درمیان میں اس کے پانی کو صاف اور فلٹر کرنے کا پلانٹ بھی لگا ہے۔ اس جھیل کے ایک کنارے پر ایک بیری کا درخت لگا ہوا ہے۔ روایت ہے کہ یہاں غوطہ لگانے والا ہر بیماری سے مکت ہو جاتا ہے یعنی نجات پا لیتا ہے۔ من جیت جی نے کہا کہ عقیدہ اپنی جگہ آپ بھی اپنا پاؤں یہاں ڈال کر نکال لیں۔ شاید واہگورو ٹھیک کر دیں۔ میں نے پانی میں پاؤں کو تین بار ڈبکی دی۔

جہاں میں نے پاؤں کو ڈبکی دی تھی وہاں سے من جیت سنگھ جی نے چلو بھر پانی لیکر پی لیا۔

یہاں سے ہم نے ایک راؤنڈ مکمل کیا اور لنگر والے حصہ میں پہنچے۔ یہ تین منزلہ عمارت ہے۔ پہلی منزل بھر جائے تو دوسری اور تیسری منزل کھول دی جاتی ہے۔ سکھ طریقے کے مطابق کھانا پروس کر دیا جاتا ہے۔ ایک تھالی میں دو کٹوریاں ہوتی ہیں۔ تھالی اور کٹوریاں باہر سے لے کر اندر ہال میں آجاتے ہیں پھر بھاجی یا دال اور روٹی ان برتنوں میں ڈال دی جاتی ہے۔ عورتیں اور مرد اکٹھے بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ کھانے کے بعد تھالی اور کٹوریاں دوسرے دروازہ سے ''واشر'' کو دی جاتی ہیں۔ جہاں بیسویں لوگ انہیں دھو کر ٹرالیوں میں رکھتے ہیں۔ ایک ٹرالی میں سینکڑوں تھالیاں ہوتی ہیں۔ دوسری میں سینکڑوں کٹوریاں۔ کھانا کھلانے والے، تھالیاں دھونے والے، سبزی کاٹنے والے اور دوسرے کام کرنے والے بھی سیوہ دار (خدمت گار) ہیں اور سبھی رضا کار ہیں۔ انہیں کوئی معاوضہ نہیں ملتا۔ وہ معاوضہ لینے کے خواہش مند بھی نہیں ہوتے۔ یہ سینکڑوں لوگ روزانہ اپنی مرضی سے آتے اور سیوہ کرتے ہیں۔ دربار صاحب ایک چوکور عمارت ہے چار دشاؤں کے فلسفہ کے مطابق تعمیر کی گئی ہے۔ اس میں ہر مذہب اور عقیدے کا آدمی داخل ہو سکتا ہے۔ لنگر بھی سب کے لئے ہے۔ ہر وقت جاری رہتا ہے۔ کینیڈا سے کسی نے روٹی پکانے کی مشین بھجوا دی ہے جو ایک گھنٹہ میں 4 ہزار روٹیاں پکا دیتی ہے۔ مشہد میں امام رضا کے روضہ پر مہمانداری کا ایسا ہی انتظام ہے لیکن صرف زائرین کے لئے وہاں بھی خدمت کے لئے بڑے بڑے لوگ رضا کارانہ خدمت سرانجام دیتے ہیں۔ جن کی خدمت کرتے ہیں ان سے التماس دعا کرتے ہیں۔

بابا گورونانک کی کتاب گرنتھ صاحب کی پرستش ہوتی ہے۔ اس میں لکھی باتوں کو گا کر سنایا جاتا ہے۔ روزانہ اس کے کسی ایک ورق سے فال نکالی جاتی ہے۔ انٹرنیٹ پہ اور دربار صاحب میں مناسب مقامات پر یہ فال مشتہر کی جاتی ہے۔ روزانہ صبح کیرتن ہوتا ہے۔ شام کو گرنتھ صاحب باقاعدہ پالکی میں رکھ کر پانی کے اس پار بنے مخصوص حصے میں منتقل کر دی جاتی ہے۔ وہاں رات بھر کی حفاظت کی جاتی ہے۔ صبح کو پھر حوض کے بیچوں بیچ بنے مخصوص کمرے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں لائی جاتی ہے۔اور کیرتن شروع ہوتا ہے۔ریڈیو اور ٹی وی پر کیرتن براہ راست نشر ہوتا ہے۔سکھ برادری اسے نہایت عقیدت سے دیکھتی اور سنتی ہے۔

دربار صاحب کے چاروں طرف مہمان خانے بنے ہیں۔ یہاں ہر طبقے کی رہائش کا انتظام موجود ہے۔ائیر کنڈیشنڈ کمروں کا معمولی کرایہ وصول کیا جاتا ہے۔دربار صاحب کی عمارتوں میں ایک ایسی عمارت ہے جس پہ آگ اور گولیوں کے نشانات موجود ہیں۔یہ عمارت اندرا گاندھی کے دور میں آپریشن بلیو سٹارم کے دوران نشانہ بنی تھی۔اب اسے یادگار کے طور پر محفوظ کردیا گیا ہے۔باقی عمارتوں کی مرمت اور ردوبدل ہوتا رہتا ہے۔لیکن متاثرہ عمارت بھارت سرکار کا سکھوں کے ساتھ سلوک یاد رکھنے کے لئے محفوظ کی گئی ہے۔

تقریباً دو گھنٹے ہو چکے تھے دربار صاحب کے تمام اہم حصے دیکھ لئے گئے تھے۔بہت سی نئی باتیں بھی معلوم ہوئیں۔دربار صاحب کے انفارمیشن سینٹر میں آئے۔مختصر بریفنگ ہوئی۔دربار صاحب کے بارے میں کتابوں کا تحفہ بھی دیا گیا۔ان میں سکھ مذہب اور بابا گورونانک کے بارے میں بھی معلومات موجود ہیں۔

دربار صاحب سے نکل کر تپتی ہوئی سڑک دوڑ کر پار کی۔ پرانے شہر کی سیر کرتے ہوئے جلیانوالہ باغ اور وہ دروازہ دیکھا جسے جنرل ڈائر نے خاص طور پر بند کروا کے فائرنگ کا حکم دیا تھا۔یہ راستہ بند نہ ہوتا تو بہت سارے لوگ جان بچانے میں کامیاب ہوجاتے۔اب یہ واقعہ تاریخ کا حصہ ہے۔کچھ اسی طرح کی تاریخ عراق میں رقم کی جارہی ہے۔

وقت کم رہ گیا تھا۔جلدی جلدی کا جوکی برفی اور امرتسر کے پاپڑ خریدے۔رنجیت سوسائٹی پہنچے۔سامان تیار تھا۔ٹیکسی آگئی۔سامان رکھوا کر رخصت لی۔من جیت سنگھ اور ان کی بیوی بچوں نے بہت محبت سے رخصت کیا۔ایسا محسوس ہورہا تھا کہ جیسے ان کا کوئی بہت قریبی عزیز کسی طویل سفر پر جارہا ہو۔

من جیت سنگھ امرتسر میں سونے اور ایک نئے طریقہ علاج پر کام کر رہے ہیں۔یہ علاج ملائیشیا کی کسی کمپنی نے تخلیق کیا ہے۔اس میں ادویات استعمال نہیں ہوتیں بلکہ لباس

سے علاج کیا جاتا ہے۔یہ ٹیکنالوجی خلانوردوں کیلئے خصوصی طور پر ایجاد ہوئی تھی۔مجھے ہر نئی چیز میں دلچسپی ہوتی ہے۔چنانچہ میں نے اہلیہ کے لئے تقریباً 2500 روپے میں چند چیزیں خریدیں۔حیرت ہے کہ یہ چیزیں ابھی پاکستان میں کیوں متعارف نہیں ہوئیں۔ممکن ہے کسی کے پاس ایجنسی ہو اور وہ ابھی اس پر کام نہ شروع کرسکا ہو۔

واپسی کا سفر ہم تین افراد کر رہے تھے۔میرے ساتھ پروفیسر اقبال شاہد اور اظہر غوری تھے۔چالیس منٹ میں ہم اٹاری پہنچ گئے۔امیگریشن کسٹم وغیرہ کے مراحل طے کر رہے تھے کہ دہلی سے بس آگئی۔اس لئے ہم نے کاؤنٹر پر اپنے اپنے پاسپورٹ اور فارم پیش کر دیئے۔پیدل آنے والوں میں ہم 6 افراد پنجاب کانفرنس کی باقیات میں سے تھے۔واہگہ میں قدم رکھا۔سخت گرمی میں بچوں کو اطلاع دینا مناسب نہ سمجھا۔تین سو روپے میں ایک ٹیکسی لی اور ٹھیک چار بجے کلاسیک پہ پہنچ گیا۔پنجابی کانفرنس کا یہ مندوب بھارت یاترا کے بعد شام کو گھر میں تھا۔

اگست 2004ء

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نہ تم بدلے نہ دل بدلا نہ دل کی آرزو بدلی

گذشتہ دنوں بھارت کا دورہ کرنے والے صحافیوں نے وطن واپس آ کر اپنے جن تاثرات کا اظہار کیا ہے ان میں پاک بھارت تعلقات میں بہتری کیلئے تشکیک اور بھارت میں مسلمانوں کی حالت زار پہ مایوسی پائی جاتی ہے۔ ان صحافیوں کی اکثریت کا کہنا ہے کہ بھارت ایک خطرناک پڑوسی ہے۔ تعلقات معمول پہ لانے کیلئے اس کے دعوے اور اقدامات فریب اور اپنے عالمی مقاصد کے حصول کیلئے دُنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ روزنامہ "خبریں" اور ماہنامہ "سپوتنک" کے صفحات گواہ ہیں کہ ہم ابتدا ہی سے انہیں بھارتی حکمرانوں کی عیاری اور خفیہ مقاصد قرار دے رہے ہیں۔

پاکستان سے تعلقات معمول پہ لانے اور تنازعات حل کرنے کیلئے گذشتہ کچھ عرصہ سے بھارت کی طرف سے جو اقدامات کئے جا رہے ہیں ان کا مقصد واقعتاً ایسا نہیں ہے۔ یہ سب کچھ کرنا اس کی کچھ داخلی اور خارجی ضرورتیں ہیں۔ داخلی ضروریات میں بھارتی مسلمانوں کی سیاسی ہمدردیاں حاصل کرنا، کشمیر اور سیاچن کے ناقابل برداشت بوجھ سے آزادی اور خارجی ضروریات میں ایشیا کا چودھری بننا اور سلامتی کونسل میں مستقل نشست حاصل کرنا ہے۔ ان مقاصد کے حصول کیلئے پاکستان کو دام میں لانے کا نیا ہتھکنڈہ یہ سوچا گیا کہ حکومتی سطح پر پاکستان اس کے فریب میں کبھی نہیں آئے گا۔ چنانچہ پاکستان کی رائے عامہ کو بھارت کے حق میں ہموار کیا جائے۔ تقسیم کو ستاون برس گذر چکے ہیں۔ زندگی کے تمام شعبوں میں اب اکثریت ایسے افراد کی ہے جو آزادی کے بعد پیدا ہوئے۔ ان کے ذہنوں میں تقسیم کے اسباب دھندلا چکے ہوں گے، فسادات کی تلخی نہیں پائی جاتی ہوگی۔ باہمی روابط کی خواہش موجود ہوگی چنانچہ مختلف ذرائع استعمال کر کے پاکستانیوں کو باور کرایا جائے کہ دونوں ملکوں کے عوام دوریاں اور دشمنی ختم کر کے اچھے پڑوسیوں کی طرح رہنا چاہتے ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آپ بھی متحرک ہوں اور اپنی حکومت کو مجبور کردیں کہ اگر کشمیر جیسے تنازعات حل نہیں ہو سکتے تو انہیں ایک طرف رکھ کر تعلقات کو معمول پہ لایا جائے۔ باہمی تجارت، آمدورفت اور عوامی رابطوں کو فروغ دیا جائے تاکہ برصغیر امن و آشتی کا گہوارہ بن جائے۔

اپنے الیکٹرانک میڈیا کو اس کام پہ لگانے کے ساتھ ساتھ بھارت نے پاکستان میں ایسے افراد کی سرپرستی شروع کردی جو بنیادی مسائل حل کئے بغیر بھارت کے ساتھ تعلقات معمول پہ لانے کے حامی ہیں۔ چنانچہ اخبارات اور تقریبات میں پوری شدومد سے کہا جانے لگا کہ پڑوس کو تبدیل کرنا ممکن نہیں تو پھر کیوں نہ اپنا رویہ تبدیل کیا جائے۔ بھارت دشمنی نے ہمیں جنگوں اور قرضوں کے علاوہ کیا دیا ہے۔ بھارت سے تجارت کی وکالت کرنے والوں کا استدلال تھا کہ جو چیزیں ہمیں پڑوسی بھارت سے سستے داموں مل سکتی ہیں ان کے لئے آسٹریلیا اور امریکہ جیسے ممالک سے رجوع خوامخواہ کے اضافی اخراجات کے بوجھ تلے آنا اور قیمتی زرمبادلہ ضائع کرنے کی حماقت ہے۔ کچھ ''روشن خیال عناصر'' کا کہنا تھا کہ پاکستان اور بھارت کی تاریخ، ثقافت اور وراثت ایک ہے۔ 1947ء کی تقسیم غیر فطری اور انگریزوں کی سازش تھی۔ اگر ہم دشمنی اور مخاصمت کی پالیسی ترک کرکے دوستی اور مفاہمت کی پالیسی اپنالیں تو اربوں روپے کے سالانہ غیر ضروری عسکری اخراجات سے نجات پاکر اپنے وسائل کو عوام کی خوشحالی اور ترقی کیلئے زیر استعمال لاسکتے ہیں۔ بھارت نواز پاکستانی دانشور بھارت کی جمہوریت اور سیکولرازم کے گن گاتے رہتے ہیں۔ وہ بھارتی رہنماؤں کی تال سے تال ملا کر یہ کہتے نہیں تھکتے بھارت دُنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے۔ اگر 47ء کی تقسیم وجود میں نہ آتی تو مسلمان بھارت میں ایک موثر اقلیت ہوتے اور جمہوریت کے فیوض و برکات سے متمتع ہوتے۔ ہم ان نام نہاد دانشوروں کو سیکولر بھارت کا اصلی چہرہ دکھانا چاہتے ہیں جو بالخصوص مسلمانوں کیلئے بے نقاب ہے۔

مسلمانوں کو ملیچھ، بھارت ماتا کے ٹکڑے کرنے والے اور دہشت گرد کہا جاتا ہے۔ ان پہ تعلیم، تجارت اور سرکاری ملازمتوں کے راستے بند ہیں۔ انہیں پاکستان اور بنگلہ دیش کا ایجنٹ کہا جاتا ہے۔ تیس فی صد مسلمانوں کو سرکاری طور پر پندرہ فی صد تسلیم کیا جاتا ہے تاکہ

اس تناسب سے انہیں ملازمتیں نہ دینا پڑیں۔

مسلمانوں سے امتیازی سلوک کسی ایک شعبہ تک محدود نہیں۔ 1984ء میں سکھ مخالف فسادات میں مارے جانے والے اکثر افراد کے ورثا کو دس دس لاکھ روپے معاوضہ ادا کیا گیا اور معاوضہ کی یہ رقم بھارتی سپریم کورٹ کے حکم سے ادا کی گئی۔ اس حکم سے ایک نظیر قائم ہوگئی لیکن مسلمانوں کے معاملے میں اس نظیر کو نظرانداز کردیا گیا اور کوئی معاوضہ دینے کے بارے میں کانگریس کی نئی حکومت نے بھی ابھی تک کوئی اعلان نہیں کیا۔ یہ نکتہ اس لئے اہم ہے کہ انسان تو بہرحال انسان ہے۔ اس کی قدروقیمت مذہب اور برادری کی بنیاد پر طے نہیں کی جاتی لیکن سیکولر بھارت میں اسی امتیاز پر عمل درآمد کیا جارہا ہے۔ اور انصاف کرتے وقت متاثرہ طبقہ کی شرح آبادی کو سامنے نہیں رکھا گیا ہے۔ اگر محض دو فی صد سکھوں کیلئے انصاف کا ایک بھاری عمل اختیار کیا جاسکتا ہے تو 30 فی صد مسلمانوں کیلئے کیوں نہیں؟ سکھوں کے مقابلے میں مسلمان تو بہت زیادہ پسماندہ ہیں۔ آزادی کے بعد سے آج تک سب سے زیادہ فرقہ واریت کا نشانہ بھی مسلمان ہی بنے ہیں۔ سب سے زیادہ جانی اور مالی نقصان بھی انہی کا ہوتا آیا ہے۔ لیکن بی جے پی ہو یا کانگریس مسلمانوں کے ساتھ سوتیلا پن جاری وساری ہے۔

بھارت کے سیاہ قانون ٹاڈا کو ختم ہوئے عرصہ ہو چکا ہے لیکن اس کے ہولناک اثرات ابھی برقرار ہیں۔ ہزاروں بے گناہ مسلمان بھارت کی جیلوں میں آج بھی اسی قانون کے تحت ایڑیاں رگڑ رہے ہیں۔ کوئی بھی حکومت مسلمانوں کے بنیادی مسائل اور ان کے دکھ درد کا مداوا کرنے میں سنجیدہ نہیں ہے۔

گجرات کے واقعات نے دُنیا کو دکھا دیا ہے کہ یہاں مسلمان ہونے کی ایسی بھیانک سزا ملتی ہے۔ جنوبی بھارت میں مسلمانوں کو بنگلہ دیشی اور شمالی بھارت میں انہیں پاکستانی ہونے کا الزام دیا جاتا ہے۔

گذشتہ انتخابات میں اٹل بہاری واجپائی نے مسلمانوں کا ووٹ حاصل کرنے کیلئے پاکستان سے راہ و رسم بہتر بنانے، آمدورفت آسان بنانے اور باہمی تنازعات حل کرنے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے عزم کا اظہار کیا لیکن مسلمانوں نے دیکھ لیا تھا کہ گجرات میں اڑھائی ہزار بے گناہوں کا قتل عام کرنے والے مودی کا بال بھی بیکا نہیں ہوا۔ چنانچہ مسلمانوں نے اپنا ووٹ منتشر نہ ہونے دیا اور واجپائی حکومت کا دھڑن تختہ ہو گیا لیکن واجپائی کے مقابلے میں کانگریس کو ووٹ دینے والے مسلمانوں کو کیا ملا۔ ابھی تک ان کی اشک شوئی کا خیال کسی کو نہیں آیا۔

کانگریس میں بھی ایک معتد بہ طبقہ ایسا ہے جو فرقہ پرستوں اور جارحانہ ہندوتا کا حامی ہے۔ اقتدار ملنے کے بعد اس طبقے کا اثر ورسوخ اور بھی بڑھ گیا ہے۔ انتخابی مہم کے دروان ہی کانگریس قیادت نے مسلمانوں کو کم اہمیت دینا شروع کر دی تھی۔ بھارتی مسلمانوں کو اب شدت سے احساس ہو رہا ہے کہ وہ صرف سیکولر سیاسی شطرنج کے مہرے ہیں یا پھر محض ووٹ بنک ہیں جنہیں الیکشن کے دوران استعمال کرنے کے بعد بھلا دیا جاتا ہے۔

تقسیم کے بعد سے مسلسل ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات نے مسلمانوں کو مجبور کر رکھا ہے کہ وہ اپنی بستیوں میں ہی قید رہیں۔ بڑے شہروں اور قصبات میں زمینوں کی بڑھتی ہوئی قیمتوں اور اپنے عدم تحفظ نے مسلمانوں کو اچھوتوں کی طرح رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ان گھنی بستیوں اور جھونپڑیوں میں رہنے والے مسلمان تعلیمی اور سماجی اعتبار سے ترقی نہیں کر سکے۔

دہلی کی شاہی مسجد فتح پوری کے امام ڈاکٹر مفتی محمد مکرم نے حال ہی میں مطالبہ کیا ہے کہ مسلمانوں کے تحفظ کو یقینی بنایا جائے۔ بھارتی آئین کی دفعہ 341 کے تحت جو حقوق دلتوں کیلئے ہیں وہی حقوق مسلمانوں کو بھی دیئے جائیں۔ اسی طرح آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے جنرل سیکرٹری مولانا احمد علی قاسمی نے کہا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کا کھیل فوری طور پر بند کیا جائے اور کسی بھی مسلمان کو چھان بین کے بغیر دہشت گرد نہ کہا جائے۔

بھارت کے محکمہ آثار قدیمہ کے قبضہ میں کئی سو تاریخی مساجد ہیں۔ وہاں لوگوں کو پکنک منانے کی تو اجازت ہے لیکن نماز پڑھنے کی اجازت نہیں۔ فوج، پولیس نیم عسکری دستوں اور سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ مسلمان

رہنماؤں کا مطالبہ ہے کہ مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے ریزرویشن دی جائے۔ ورنہ مسلمانوں کو تحفظ نہیں ملے گا۔ کیونکہ فسادات تو بھارتی مسلمانوں کا مقدر بن چکا ہے۔ ان کا مطالبہ ہے کہ مسلمانوں کو صرف 25 برسوں کیلئے ریزرویشن دی جائے۔ اگر ایسا ہو جائے تو ان 25 برسوں کے بعد مسلمان حکومت سے کسی مدد کے محتاج نہیں رہیں گے۔

بھارتی مسلمانوں کا مطالبہ ہے کہ مرکزی وقف کونسل، اردو کونسل، حج کمیٹی، اقلیتی فنانس کارپوریشن اور مولانا آزاد فاؤنڈیشن کے بجٹ بڑھائے جائیں۔ انتخابی مہم کے دوران کانگریس قیادت نے اس اقدام کا وعدہ بھی کیا تھا لیکن اقتدار میں آنے اور نیا بجٹ بنانے کے باوجود یہ وعدہ پورا نہیں کیا ہم پاکستانیوں کو خدا کا شکر گزار اور قائداعظم کا ممنون احسان ہونا چاہیے کہ پاکستان بن گیا۔ ورنہ اکھنڈ بھارت میں آج جو کچھ مسلمان سے ہو رہا ہے۔ وہی ہمارے ساتھ ہوتا اور خدانخواستہ اگر بھارت ہم پہ کسی طرح غلبہ پالے، چاہے یہ علاقائی ہو یا اقتصادی تو ہمارا مستقبل کیا ہوگا، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

ہماری سوچی سمجھی رائے ہے کہ بھارت محاورۃً بغل میں چھری، منہ میں رام رام" نہیں رکھتا، واقعتاً اس پر عمل پیرا ہے۔ ہم یقیناً امن و آشتی کے طلبگار ہیں لیکن بھارت پاکستان کے ساتھ دوستی کے اقدامات اپنی سیاسی ضروریات اور عالمی سطح پر فیس سیونگ کیلئے کر رہا ہے۔ ہمیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔

نومبر 2004ء

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بالادستی کا بھارتی جنون

سپوتنک کے شذرات اور "حکمرانوں کے کرتوت" گواہ ہیں کہ ہم نے جنوبی ایشیاء میں بھارتی بالادستی کے جنون کو بار بار موضوع بحث بنا کر ان حلقوں کی آواز میں آواز ملائی ہے جو پاکستان کو بھارتی جنون کی زد سے محفوظ رکھنے کیلئے بلند ہوتی رہتی ہے۔ مبصرین آجکل دوٹوک انداز میں کہہ رہے ہیں کہ جنوبی ایشیاء کا علاقہ عالمی سازشوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے اور ان سازشوں کا مقصد بھارت کو علاقائی بالادستی دلانا ہے۔ پاکستان بھارت کا ایسا پڑوسی ہے جو اس کے مکروہ عزائم کا ہمیشہ سے نشانہ بنتا آرہا ہے۔ چنانچہ وطن عزیز کے سنجیدہ حلقوں کے سامنے یہ سوال ہے کہ بین الاقوامی شاطر اگر بھارت کو علاقائی بالادستی دلا دیتے ہیں تو پھر نئے منظر میں پاکستان کہاں کھڑا ہوگا؟

آزادی کے بعد سے بھارت اپنی جغرافیائی حیثیت' وسیع علاقے' کثیر آبادی اور قدرتی وسائل کے پیش نظر ایشیاء میں اپنی قیادت کے حصول کے خواب دیکھ رہا ہے۔ بھارت کے پہلے وزیراعظم آنجہانی جواہر لال نہرو نے آزادی سے بہت پہلے کہا تھا کہ بحرالکاہل کی جگہ بحراٹلانٹک مستقبل میں عالمی مرکز بنے گا اور آزاد بھارت کو اپنے اثرات وہاں مرتب کرنا ہوں گے۔ حالانکہ بھارت بحرالکاہل کے علاقے کا ملک نہیں لیکن عالمی سطح پر اسے اپنا کردار ادا کرنے کیلئے ایسا کرنا ہوگا۔ انہوں نے اپنی شدید خواہش کا اظہار کرتے ہوئے مزید کہا تھا کہ بھارت دنیا میں دوسرے درجہ کا کردار ادا نہیں کرسکتا۔ اسے ایک بڑی طاقت بننا ہوگا یا پھر خاموش رہنا ہوگا۔ نہرو کے "عظیم بھارت" کا تصور ان کے جانشینوں کیلئے ایک میراث ہے اور اس کیلئے کانگرس ہو یا غیر کانگرسی پارٹی کی حکومت' بھارتی حکمران پورے جوش و خروش سے عمل درآمد پر تیار رہتے ہیں۔

کشمیر' جونا گڑھ اور حیدر آباد دکن کو نگلنے کے بعد جواہر لال نہرو کی بیٹی اندرا گاندھی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے دور میں بھارت کو موقعہ ملا تو وہ کسی کوتاہی کا مظاہرہ کیے بغیر پاکستان کو توڑنے اور بنگلہ دیش کا قیام ممکن بنانے کیلئے میدان میں کود پڑا۔ حالات نے ساتھ دیا اور بھارت علاقے میں اپنی چودھراہٹ قائم کرنے کے راستے میں ایک قدم آگے بڑھ گیا۔ بھارتی قیادت کی حکمت عملی ابتداء ہی سے یہ رہی ہے کہ پہلے برصغیر میں قدم جمائے جائیں۔ پھر بحر ہند کے علاقے میں کنٹرول حاصل کیا جائے اور پھر ایشیاء میں صف اوّل کی بڑی عالمی طاقت بنا جائے۔ لیکن بین الاقوامی شاطروں نے عالمی بساط پر جس طرح مہرے مرتب کرر کھے تھے ان کے پیش نظر بھارت کیلئے ابھی کوئی نیا قدم اٹھانا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ وہ بظاہر خاموش اور غیر فعال ہو گیا۔

اِس خاموشی کو کچھ لوگوں نے پارسائی اور کچھ لوگوں نے معذوری کا نام دیا۔ ان دانشمندوں کا کہنا تھا کہ بھارت ایک کثیر نسلی ملک ہے۔ اس کے مختلف نسلی گروہوں کی اپنی اپنی زبان اور رسم و رواج ہیں اور پھر ان مختلف نسلی گروہوں میں بہت سی پیچیدگیاں پائی جاتی ہیں۔ ان کے باہمی تضادات کی وجہ سے ان میں وقفے وقفے سے تصادم اور فسادات بھڑک اٹھتے ہیں۔ علاوہ ازیں بھارت ایک کثیر مذہبی ملک بھی ہے۔ مختلف مذہبی گروہوں کے اختلافات سیاسی صورت حال میں انتشار پیدا کر دیتے ہیں چنانچہ سماجی تعمیر و ترقی میں رکاوٹ کھڑی ہو جاتی ہے۔ اقتصادی حوالے سے وسائل کی کمی، صنعتی اور زرعی شعبوں میں سرمایہ کاری کی کمی اور پسماندہ انفراسٹرکچر اقتصادی ترقی کو روکے ہوئے ہیں۔ ان جزوی حقائق کو بنیاد بنا کر بھارت کیلئے نرم گوشہ رکھنے والے دانشوروں کا استدلال تھا کہ بھارت نہ تو بڑی طاقت بن سکتا ہے اور نہ ہی وہ ایسا چاہتا ہے کیونکہ عسکری قوت اور موافق بین الاقوامی حالات ہی کسی ملک کو بالاتر حیثیت دلانے کیلئے کافی نہیں ہوتے۔ کسی بڑی طاقت کا عروج اس کی ہمہ گیر داخلی قوت واستحکام پر منحصر ہوتا ہے۔

لیکن ان دانشوروں کی خوش فہمی بہت جلد دور ہو گئی۔ سرد جنگ کے خاتمہ کے بعد بین الاقوامی سلامتی کی صورت حال زبردست تبدیلیوں سے گزری۔ روس اور امریکہ نے

جنوبی ایشیاء میں اپنی عسکری موجودگی کو محدود کر دیا۔ چنانچہ ایک "پاور ویکیوم" پیدا ہو گیا۔ امریکہ کی عدم موجودگی میں بحر ہند کے پانیوں پر بھارت کی بالادستی کا خواب جو ماضی میں بوجوہ شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا تھا اب اسے پورا ہوتا ہوا دکھائی دیا۔ بھارت نے ستر کے عشرے میں ہی بحر ہند پر کنٹرول حاصل کرنے کی حکمت عملی مرتب کر لی تھی۔ اس وقت کہا گیا کہ بھارتی بحریہ کو نہ صرف اپنے ساحلوں کا دفاع کرنا ہے بلکہ ملحقہ علاقوں کے تحفظ کے ساتھ ساتھ بحر ہند میں اس خلا کو پورا کرنا ہے جو نہر سویز سے برطانوی فوجوں کے انخلا سے پیدا ہوا ہے۔ 1980ء کے عشرے میں بھارت نے اپنی بحریہ کی قوت اور مدافعانہ اور جارحانہ دونوں قسم کی صلاحیتوں میں اضافے کی کوشش مزید تیز کر دیں۔ اب اس نے ایک قدم اور بڑھایا اور 1990ء کے عشرہ میں بحر ہند میں اپنی گرفت کو مزید مستحکم کر لیا۔ اس کی بحریہ نے روس کے تعاون سے ایک پچیس سالہ منصوبہ (2015-1990ء) انتہائی جدید خطوط پر مرتب کیا تاکہ بھارت کی بحری طاقت کو برقرار رکھا جاسکے اور کسی دوسری بحری طاقت کو بحر ہند میں داخل ہونے سے روکا جاسکے۔ حال ہی میں اس نے 24 سب میرین تیار کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ یہ تمام سب میرین لانگ رینج میزائلوں سے لیس ہوں گی۔

علاقائی بالادستی کے جنون میں مبتلا بھارت اپنے کروڑوں عوام کو غربت کے جہنم میں دھکیل کر عسکری دیو بن رہا ہے۔ ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیے کہ گجرات میں زلزلہ کی تباہی پر دنیا بھر میں شور مچ گیا کہ بھارت کی معیشت پر زبردست منفی اثرات پڑے ہیں۔ یہ المناک خبر پھیلتے ہی دنیا بھر کی حکومتوں اور اداروں نے بھارت کو اقتصادی اور تکنیکی امداد فراہم کرنا شروع کر دی۔ یہاں تک کہ پاکستان نے بھی بھارت کے تمام تر معاندانہ رویہ کو نظر انداز کرتے ہوئے انسانی ہمدردی کے تحت مدد کی۔ لیکن ٹھیک انہی دنوں جب کہ دنیا بھارت کی مدد کر رہی تھی خود بھارت ناقابل یقین حد تک اسراف کے ساتھ اسلحہ خرید رہا تھا۔ انہی دنوں روس کے ساتھ 310-T-90 ٹینکوں کی خریداری کا ایک معاہدہ کیا گیا۔ ایک اور معاہدہ پہ دستخط ہوئے جس کے تحت بھارت کو روس کے اشتراک سے 140-30MKT فائٹرز تیار کرنے کی اجازت مل گئی۔ اس معاہدے کی بدولت بھارت ایسا پہلا ملک بن گیا ہے جو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

روس کے انتہائی ترقی یافتہ ملٹی فنکشنل فائٹرز حاصل کر سکے گا۔ اسی طرح بھارت اور روس کے درمیان نیوکلیئر فیول ایگریمنٹ بھی ہوا جس نے بین الاقوامی برادری کو چونکا دیا۔

گجرات میں زلزلہ کی تباہ کاریوں کے صرف تین ہفتوں بعد دی انڈین ٹائمز نے ایک رپورٹ شائع کی جس میں 24 سب میرین تیار کرنے کے منصوبہ کے خدوخال مشتہر ہوئے اور پھر بھارت نے اگنی II درمیانی رینج بلاسٹک میزائیلوں کی تیاری کے منصوبے کی توثیق بھی کر دی۔ ان میزائیلوں کی رینج دو ہزار کلومیٹر ہے اور یہ ایک ٹن طاقت کا نیوکلیئر وار ہیڈ بھی لے جا سکتا ہے۔ ان میزائیلوں کے ذریعے بھارت اپنے "بڑے دشمن" پاکستان کے کسی بھی علاقے میں آتش و آہن کی بارش کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے ان کی موجودگی میں بھارت کو موثر قسم کی نیوکلیئر سٹریٹجک ڈیٹرنس میسر ہو گی...... اہنسا کا پجاری ان کے بغیر بالادستی کیسے قائم کر سکتا ہے؟

حالیہ برسوں میں بھارت کے دفاعی اخراجات میں مسلسل اضافہ ہوا ہے۔ 2000-2001ء کے مالی سال میں اس کا فوجی بجٹ 13.6 بلین امریکی ڈالر کی تک پہنچ گیا ہے جو پچھلے سال کے بجٹ کی نسبت 28.2 فیصد زیادہ ہے۔ بھارت کی مسلح افواج کی تعداد آجکل تمام جنوبی ایشیائی ممالک کی مجموعی افواج سے دوگنا ہے۔ یہ سب کچھ مبصرین کو بھارت کے پانچ ایٹمی دھماکوں کی یاد دلاتا ہے جو اس نے مئی 1998ء میں کئے اور پاکستان کو بھی اس کا فوری جواب دینے پر مجبور ہونا پڑا۔

آبادی' رقبہ اور دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کو بنیاد بنا کر بھارت سفارتی سطح پر اپنی اس حیثیت کو بڑی مہارت سے استعمال کر رہا ہے۔ وہ سلامتی کونسل میں مستقل رکنیت چاہتا ہے اور اس کیلئے پورے شد و مد کے ساتھ سفارتی مہم جوئی میں مصروف ہے۔ وہ اپنے میرٹ میں ایک ارب کی آبادی اور جمہوریت کو سرفہرست رکھتا ہے۔ اب تو وہ ایٹمی طاقت بھی ہے۔ چنانچہ ویٹو پاور بننے کیلئے وہ اپنے استحقاق کو جائز سمجھتا ہے اور دنیا کو باور کرانا چاہتا ہے کہ سلامتی کونسل میں اسے مستقل نشست نہ دیکر کروڑوں افراد اور جمہوریت کا حق سلب

کیا جا رہا ہے۔ وہ مسلسل امریکہ اور یورپ کو یقین دلا رہا ہے کہ ایشیاء میں افغانستان سے لیکر مشرق بعید تک کوئی بھی مسئلہ اس کی شمولیت کے بغیر حل نہیں ہوگا۔ بیرونی دنیا میں اب وہ اس تصور کو فروغ دینے میں مصروف ہے کہ "جنوبی ایشیاء کے معاملات کا تعلق جنوبی ایشیاء سے ہے۔ علاقے سے باہر کسی ملک یا طاقت کو یہ حق حاصل نہیں کہ اس علاقے کے قریب اپنے ملٹری بیس قائم کرے اور جنوبی ایشیاء میں اگر کوئی کلیدی کردار ادا کرنے کا حق رکھتا ہے تو وہ صرف بھارت ہے۔

علاقائی بالادستی کیلئے ایک طرف بھارت کی اپنی خواہش جنون کی حدوں کو چھو رہی ہے تو دوسری طرف بین الاقوامی حالات اس کے حق میں جا رہے ہیں بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ ان حالات کو اپنے حق میں استعمال کر رہا ہے۔ ہم پہلے بھی ان صفحات میں امریکی ایجنڈے کا ذکر کر چکے ہیں۔ علاقائی اور بین الاقوامی حالات پر نظر رکھنے والے اس ایجنڈے کو بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ امریکہ اس وقت دنیا کی اکلوتی سپر پاور ہے۔ روس ٹوٹ کر اس قدر کمزور ہو چکا ہے کہ وہ امریکہ خلاف محاذ آرائی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ دنیا کے تمام ممالک میں امریکہ کو سوائے چین کے کسی اور ملک سے مستقبل قریب تو کیا بعید میں بھی کوئی خطرہ محسوس نہیں ہو رہا۔ کیمونزم سوائے چین کے تمام دنیا سے تقریباً نابود ہو چکا ہے۔ امریکہ کیلئے اب کوئی مسئلہ ہے جو اسے پریشان کر سکے تو وہ چین ہے۔ گذشتہ ماہ امریکہ کا جاسوس طیارہ چین نے اتارنے کے بعد جس طرح اسے زچ کیا اور باقاعدہ معافی مانگنے پر مجبور کیا وہ سب کے سامنے ہے۔ امریکی ایجنسیوں اور اداروں نے جو نقشہ کھینچا ہے اس کے مطابق چین نے امریکی ٹیکنالوجی چوری کر کے ایسے انٹرکانٹی نینٹل بلاسٹک میزائیل بنا لئے ہیں جن کی پہنچ میں امریکہ کا چپہ چپہ آتا ہے' علاوہ ازیں چین نے ایسے میزائیل بھی تیار کر لئے ہیں جو ملٹی پل ٹارگٹس کو بیک وقت نشانہ بنا سکتے ہیں۔ چین نے منی ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم بھی بنا لئے ہیں۔ تباہ کن ہتھیاروں کے حوالے سے چین امریکہ کیلئے ایک حقیقی خطرہ بن چکا ہے۔ لیکن مسئلہ محض عسکری نہیں' چین اقتصادی لحاظ سے بھی تیزی سے ترقی کرتا جا رہا ہے۔ امریکی ذرائع کے مطابق اگر چین کو مزید 7......5 سال کھلی چھٹی ملی رہی تو وہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

صنعتی اعتبار سے امریکہ کو پیچھے چھوڑ جائے گا۔ جنگ کو تو ٹالا جا سکتا ہے لیکن معاشی ہزیمت کا تصور بھی امریکیوں کیلئے روح فرسا ہے۔ وہ ایشیاء کے کروڑوں صارفین کو چین کی منڈی بنتے نہیں دیکھ سکتا۔ چنانچہ وہ ہر ایسا قدم اٹھانے پر تیار ہے جو چین کو روک سکے۔ وہ چین کے قریب واقع ہر اس ملک کی ناز برداری کرنے کو تیار ہے جو چین کو غیر مستحکم کرنے میں اس کی مدد کرے۔

بھارت کی برسر اقتدار جماعت بھارتیہ جنتا پارٹی...... عظیم بھارت کے خواب کی عملی تعبیر اور علاقائی بالادستی کا تاج بھارت کے سر پر سجائے جانے کی شرط پر امریکی کھیل کھیلنے پر تیار ہو چکی ہے۔ بھارت کی اپوزیشن پارٹیاں بھی اپنی آشیرواد دے چکی ہیں کیونکہ اس کے نتیجے میں ان سب کی من چاہی مراد پوری ہو گی۔ بھارتی وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی کہہ چکے ہیں کہ امریکہ اور بھارت قدرتی حلیف ہیں۔ خود امریکہ بھی بھارت کو ایشیاء کی دوسری مضبوط ترین عسکری قوت سمجھتا ہے اور اسے اپنے لئے آئیڈیل سٹریٹجک پارٹنر قرار دے رہا ہے۔ پچھلے سال مارچ میں امریکی سابق صدر بل کلنٹن نے بھارت کا دورہ کیا اور امریکہ کی سفارتی حمایت پاکستان کی بجائے بھارت کو منتقل کرنے کا علامتی اظہار کرتے ہوئے چند لمحوں کیلئے پاکستان میں رکنے کا پروگرام مرتب کیا۔ بھارت کو پچکارنے کی ایک وجہ امریکہ کیلئے اس کے 90 کروڑ صارفین کی منڈی بھی ہے۔ بھارت کے ذریعے چین کے گرد حصار تنگ کرنے کے ساتھ ساتھ وہ اس منڈی کو چین سے دور رکھنے میں بھی کامیاب رہے گا۔ ویسے بھی اب امریکہ بھارت کو چین کے خلاف ایک مضبوط مورچہ سمجھتا ہے اور بحر ہند میں اپنے مفادات کیلئے اسے ایک کارآمد ساتھی قرار دے رہا ہے۔

امریکہ سے دھڑے بندی میں ہمیں کچھ ملا نہیں۔ چین دھڑے بندیوں کا قائل نہیں۔ چنانچہ ہمیں اپنے لئے اس خطے میں نیا کردار اور واضح حکمت عملی طے کرنا ہو گی۔ وطن عزیز کے سبھی دانشور اس بات پر متفق ہیں کہ ماضی میں ہماری قیادتوں نے غلط فیصلے کئے۔ مواقع ضائع کئے گئے۔ ہمارے سفارت کاروں اور دفتر خارجہ کے کارپردازوں نے

اس بصیرت، دور اندیشی، معاملہ فہمی اور مہارت کا مظاہرہ نہیں کیا جو ہمارے قومی تقاضوں پہ پورا اترتا۔ بے نیازی اور بے حسی ہمارا مستقبل چاٹ جائے گی اور ہم بھارت کے تابع مہمل بن کر رہ جائیں گے۔

تمام محب وطن عناصر کی طرح ہم بھی اِس صورت حال پر تشویش میں مبتلا ہیں اور ارباب اختیار سے چاہتے ہیں کہ ماضی کی کوتاہیوں کو سامنے رکھ کر قومی اور بین الاقوامی سطح پر اپنا کردار اس طرح مرتب کریں کہ داخلی استحکام قومی سلامتی اور عالمی سفارتی میدان میں کسی کوتاہی اور غفلت کی گنجائش نہ رہے۔ جنوبی ایشیاء میں بدلتے ہوئے منظر میں پاکستان کہاں کھڑا ہو گا سب کو اس کا اندازہ ہو رہا ہے۔ زبوں حال معیشت، مرکز گریز قوتوں کو غیر ملکی پشت پناہی، خارجہ پالیسی میں کوتاہ نظری اور بھارت کے مکروعزائم خدانخواستہ ہمیں کسی حادثہ سے دوچار نہ کر دیں۔

مئی 2001ء

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حملہ ہونے والا ہے؟

آجکل وطن عزیز کی کشتی ایک نئے گرداب میں ہے۔ حالات واقعات جو رخ اختیار کرتے جا رہے ہیں وہ ہر محب وطن کے لئے تشویش کا باعث ہیں۔ ایٹمی پھیلاؤ کے حوالے سے صورت حال انتہائی مبہم لیکن تشویشناک ہے۔ صدر مشرف کھلے لفظوں میں کہہ چکے ہیں کہ وطن عزیز چاروں طرف سے نہایت سنگین مسائل اور خطرات میں گھرا ہوا ہے۔ آنے والا ہر دن صورت حال کی سنگینی میں اضافہ کر رہا ہے۔ ابھی کل اسلام آباد میں علماء اور مشائخ کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے صدر مشرف نے رواداری' بردباری اور دنیا کے الزامات سے نجات حاصل نہ کرنے کی صورت میں صاف لفظوں میں کہا پاکستان پر فضائی حملے ہو سکتے ہیں۔ ایٹمی تنصیبات کو نقصان پہنچانے کی کوشش ہو سکتی ہے۔

داخلی اور خارجی دباؤ کے تحت بھارت، پاکستان کے ساتھ مسائل کے حل کے لئے مذاکرات کی میز پر آچکا ہے لیکن مقبوضہ کشمیر میں پاکستان کو دہشت گردی میں ملوث ہونے کے الزامات سے گریزاں نہیں۔ افغانستان کی حکومت وہاں پائی جانے والی بے چینی کا ذمہ دار پاکستان کو قرار دے رہی ہے۔ امریکہ القاعدہ کے تعاقب کے نام پر پاکستان میں داخل ہونے کیلئے پر تول رہا ہے۔ بین الاقوامی سطح پر پاکستان کو ایٹمی پھیلاؤ کے حوالے سے غیر ذمہ دار ملک کے طور پر بدنام کیا جا رہا ہے۔ اگر صدر بش اور صدر مشرف کے درمیان افہام و تفہیم نہ ہوئی ہوتی تو شائد اب تک ملک بین الاقوامی پابندیوں میں جکڑا جا چکا ہوتا۔ اب بھی یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ حالات کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

داخلی سطح پر صوبوں کے درمیان وسائل، آمدنی اور مفادات کے حوالے سے تناؤ ہے۔ پانی کی تقسیم کا مسئلہ ابھی تک لاینحل ہے۔ اندرونی انتشار میں اضافہ نا قابل تلافی نقصان کا سبب بن سکتا ہے۔ سیاسی سطح پر اضطراب پیدا کیا جا رہا ہے۔ مہنگائی کا عفریت پھنکارتا ہوا بے بس عوام کو نگل رہا ہے۔ گذشتہ برسوں کا استحکام اور زرمبادلہ کے ذخائر بے معنی ہوتے جا رہے ہیں۔

ان خطرات سے نکلنے کا راستہ مل جل کر تلاش کرنا ہوگا۔ پوری قوم کے اتحاد اور یک جہتی کی ضرورت ہے۔ مشرف ہٹاؤ مہم جیسی تحریکیں نہ تو جڑیں رکھتی ہیں اور نہ توانائی۔ ظاہر ہے یہ کامیاب تو نہیں ہوں گی لیکن قوم کو ضعف پہنچائے بغیر نہیں رہیں گی۔ اس طرح کی مہم کا تاثر بیرون ملک انتہائی منفی پڑتا ہے۔

مارچ 2004ء

بھارت کے بدھی مان

برصغیر پر انگریزوں کی حکمرانی کے دوران مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ انگریز سمجھتا تھا کہ اس نے مسلمانوں سے اقتدار چھینا ہے اس لئے انہیں دبا کر رکھنا ہی اسکے اقتدار کو تحفظ دے سکتا ہے۔ ہندو سمجھتے تھے کہ مسلمان حملہ آوروں نے بھارت کی اکھنڈتا اور ہندو دھرم اور ساج کو "نشٹ" کیا ہے اس لئے مسلمانوں کو دوبارہ ابھرنے کا موقع نہیں ملنا چاہیے چنانچہ انگریز اور ہندو دونوں طاقتوں نے شعوری اور لاشعوری کوششوں کے ذریعے مسلمانوں کو پس ماندہ رکھنے پر توجہ مرکوز رکھی۔ انگریز نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت برصغیر کے "سابق حکمرانوں" کو تعلیم کے ساتھ ساتھ اقتصادی شعبوں میں زبردست زک پہنچائی۔ انگریز اور ہندو تو عیار تھے۔ ہمارے نادان دوست "مولوی" نے بھی مسلمان کو زنجیروں میں جکڑ دیا اور وقت کے تقاضوں سے بے بہرہ مذہبی قیادت نے مسلمانوں کو دوسرے درجہ کا شہری بنا کر رکھ دیا سرسید نے ان زنجیروں کو توڑنے کا کام شروع کیا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ پھر بھی سرسید کی تحریک نے اپنے نتائج مرتب کئے۔ قائداعظم اور علامہ اقبالؒ کے آنے پر مسلمان کو احساس ہوا کہ وہ انگریز اور ہندو کی عیاری کے شکار ہو چکے ہیں۔

آزادی کی تحریک چلی تو مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد یہی سمجھتی تھی کہ ان کی بدحالی کا علاج انگریز سے آزادی میں موجود ہے۔ چنانچہ وہ انتہائی خلوص کے ساتھ اس تحریک میں شامل تھے۔ لیکن جیسے جیسے تحریک زور پکڑتی گئی ہندو لیڈرشپ کے چہرے سے نقاب اترتا چلا گیا۔ پھر حالات و واقعات نے قائداعظم کو مجبور کر دیا کہ وہ عام مسلمان کو ہندو کی مکاری اور ان کے مستقبل کے بھیانک عزائم سے نہ صرف آگاہ کریں بلکہ مسلمانوں کے محفوظ مستقبل کا راستہ بھی متعین کریں۔ 1940ء میں قرارداد لاہور (قرارداد پاکستان) کا ناگزیر مرحلہ اسی لئے درپیش آیا۔ قائداعظم نے دوٹوک انداز میں مسلمانوں کیلئے الگ وطن کا مطالبہ کر دیا۔

ہندو قیادت نے مسلمانوں کے اس مطالبہ کو غیر معقول ثابت کرنے اور مسلمانوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں انتشار پیدا کرنے کی ہر کوشش کی۔ کانگریسی مسلمانوں اور کچھ دوسرے مسلمان قائدین ہندوؤں کے ہاتھوں کھیل گئے۔ لیکن عام مسلمان قائداعظم کی قیادت میں مسلم لیگ کے جھنڈے تلے متحد ہو چکے تھے۔ ہندوؤں کی ایک نہ چلی اور ہندوستان کی تقسیم کا اعلان ہو گیا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انگریز نے کھل کر ہندوؤں کا ساتھ دیا اور تقسیم کے منصوبے کو جہاں تک ہندوؤں اور بھارت کے حق میں کر سکتے تھے کھلی اور چھپی سازشوں کے تحت خوب خوب کیا۔ برطانوی ہند کے آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن ان خدمات کے صلے میں ''آزاد بھارت'' کے پہلے گورنر جنرل بن گئے۔ لیڈی ماؤنٹ بیٹن اور پنڈت نہرو کے ''تعلقات'' نے پاکستان کو اپاہج بنانے کے لئے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ باؤنڈری کمیشن نے ضلع گورداس پور اور ملحقہ علاقے بھارت میں شامل کر کے پاکستان کو جو چرکہ لگایا وہ وقت کے ہاتھوں ناسور بن گیا۔ آج یہ ناسور برصغیر کے ایک ارب سے زیادہ انسانوں کو مسائل کے جہنم میں گرفتار کئے ہوئے ہے۔

قائداعظم مہاجرین کے ساتھ ہونے والے مظالم اور نوزائیدہ مملکت کے ساتھ کی جانے والی ناانصافیوں پر دکھی تھے۔ انہیں ہندو کی عیاریوں کا تو علم تھا لیکن یہ توقع ہرگز نہیں تھی کہ انگریز جاتے جاتے مسلمانوں کے ساتھ غیر جانبداری کا رویہ اپنائے گا۔ مسلم کش فسادات رو کے جا سکتے تھے، ہجرت کا مرحلہ امن وسلامتی کے ساتھ طے ہو سکتا تھا لیکن انگریز بے حس ہو گئے، ہندو انتہا پسند ''اکھنڈ بھارت'' کا خواب بکھرتا دیکھ کر اپنے اصل روپ میں سامنے آ گئے تھے۔ برصغیر کی تقسیم کا منصوبہ کانگریسی قیادت نے اس مفروضے کے تحت قبول کر لیا تھا کہ پاکستان دس بارہ برس کے اندر ناکام ہو کر ہماری جھولی میں آن گرے گا اور بظاہر حالات بھی ایسے تھے کہ ان کی سوچ غلط نہ تھی۔ پاکستان میں مسلمانوں کے پاس نہ تو پیسہ تھا اور نہ ہی کاروبار کا تجربہ، معیشت مستحکم ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ نوزائیدہ مملکت کے سامنے مسائل کے پہاڑ تھے۔ سرکاری مشینری جس طرح منتشر تھی اس سے یہ مسائل حل ہوتے نظر نہ آتے تھے لیکن کانگریسی قیادت کے اندازے غلط نکلے۔ پاکستان اپنے پاؤں پہ کھڑا ہو گیا۔ بھارت کی پاکستان دشمنی کا مثبت پہلو یہ نکلا کہ تمام تر نامساعد

حالات کے باوجود پاکستان میں برسراقتدار آنے والی ہر قیادت نے بھارت کے سامنے سر نہ جھکانے کی پالیسی اپنائے رکھی۔

پچھلے 54 برسوں کی تاریخ شاہد ہے کہ جیسے جیسے بھارت نے پاکستان کو سازشوں اور مخاصموں کے ذریعے نقصان پہنچانے کی کوشش کی ویسے ویسے پاکستان کے عوام نے اپنے آپ کو ان تمام خامیوں اور کمزوریوں سے نجات دلانے کی کوششیں تیز کر دیں جن سے بھارت فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ الحمدللہ آج پاکستان اس قابل ہے کہ ہر شعبہ میں خود سے سات گنا بڑے بھارت کو مثبت جواب دے سکتا ہے۔

ادھر بھارت کے بدھی مانوں کے سر پر ایک ہی جنون سوار رہا ہے کہ کسی طرح پاکستان کو (خدانخواستہ) ختم کر کے اکھنڈ بھارت کا خواب شرمندہ تعبیر کیا جائے۔ وسطی ایشیا میں امریکہ کی دلچسپی چین کے خلاف حکمت عملی میں اس کا بھارت کے ساتھ گٹھ جوڑ اور 11 ستمبر کے واقعات کے بہانے طالبان کے خلاف کارروائی کے پس منظر میں بھارت کی موجودہ قیادت بے چین ہے کہ پاکستان کو بے دست وپا کیا جائے۔

بھارت دُنیا کو یہ باور کرانے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے کہ ''پاکستان دہشت گرد'' ہے۔ پاکستان کی ''دراندازی'' کشمیر میں صورت حال کو بگاڑ رہی ہے۔ چنانچہ ضروری ہو گیا ہے کہ اسے ''پاکستان کو سزا'' دینے کی اجازت اور پشت پناہی فراہم کی جائے۔ اور یہ کہ اگر پاکستان کو ''بے دست وپا'' کر دیا جائے تو اس خطہ میں امن وآشتی کے نغمے گونجنے لگیں گے۔

بھارت صرف کشمیر میں ہی سناٹا نہیں چاہتا۔ برما سے لیکر افغانستان تک ایک ایسا ماحول چاہتا ہے جو اگر اکھنڈ بھارت کی صورت میں میسر نہ آئے تو کم از کم کنفیڈریشن کی شکل میں بھارت کی بالادستی کی صورت تو بہرحال موجود ہو۔ لیکن پاکستان کو بے دست وپا کرنے کا سوال خاصا ٹیڑھا ہے۔ اس کے عواقب ونتائج کیا نکلیں گے، عالمی چودھریوں کو اس کا پورا پورا اندازہ ہے چنانچہ امریکی اور برطانوی عمائدین خطے کا دورے پہ دورہ کر رہے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا بھارت اتنا ہی معصوم، امن پسند اور مظلوم ہے جتنا وہ شور مچا رہا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ دُنیا کے سامنے بھارت کا اصل چہرہ اور اس کے اصل

www.iqbalkalmati.blogspot.com

عزائم لائے جائیں۔ دُنیا کو بتایا جائے کہ "بغل میں چھری، منہ میں رام رام" کی ضرب المثل کسی نے ازراہ تفنن اچانک ہی وضع نہیں کر دی تھی۔ یہ تو ہندو ذہنیت کی مکمل طور پر عکاس اور صدیوں کے مطالعہ ومشاہدہ کا نچوڑ ہے۔ اہنسا کا پجاری تو خود بہت بڑا دہشت گرد ہے۔

بھارت کے بدھی مان نیتاؤں کا حال تو یہ ہے کہ اپنے غریب عوام کے منہ سے نوالہ چھین کر ہتھیاروں کے انبار لگا رہے ہیں۔ کشمیر میں ایک عرصہ سے سات لاکھ فوج متعین کئے ہوئے ہیں۔ ریاستی دہشت گردی کا کیا کیا مظاہرہ نہیں کیا گیا۔ کشمیر پہ بزور طاقت قبضہ کرنا، ریاست حیدرآباد کو ہڑپ کرنا، گوا کو نگل لینا، مشرقی پاکستان میں مکتی باہنی کے ذریعے غارت گری اور اپنی باقاعدہ فوج کے ساتھ حملہ آور ہو کر بنگلہ دیش کا قیام ممکن بنانا۔ یہ سب کچھ دہشت گردی ہی تو ہے۔ کشمیر میں آزادی کی تحریک کو پاکستان کی دراندازی قرار دینے والا بھارت اپنے ایجنٹوں کے ذریعے پاکستان میں بم دھماکے کراتا رہتا ہے اور بالخصوص کراچی کو نشانہ بنائے رکھتا ہے۔ اسے کیا نام دیا جائے گا۔ پاکستان کی سرحدوں پر مسلسل اپنی فوجوں کے اجتماع سے وہ کیا حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ کوئی راز نہیں۔

بھارتی قیادت کا فلسفہ "ہندوتا" ہے۔ ہندو، ہندی اور ہندوستان اس کا منشور ہے۔ بھارت کے شاعر، وزیراعظم سے کسی نے سوال کیا تھا کہ آپ کا منشور تو "ہندوتا" ہے۔ پھر یہ کولیشن حکومت میں کیسے چلے گا؟ بھارتی وزیراعظم نے جواب دیا تھا کہ جیسے ہی ہمیں اسمبلی میں دو تہائی اکثریت حاصل ہو گئی ہم اس پر ضرور عمل کریں گے۔ دو تہائی اکثریت تو بی جے پی کو نہ مل سکی لیکن 11 ستمبر کے واقعے نے امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو جب مسلم دشمنی میں بھارت کے مزید قریب کر دیا تو بھارت کی تمام سیاسی جماعتوں نے اپنے مختلف منشور کو پس پشت ڈال کر واجپائی حکومت کے شانہ بشانہ پاکستان کو سبق سکھانے کا علم بلند کر دیا۔ اب بھارت کشمیر کا مسئلہ بزور طاقت طے کرنے اور پاکستان کو اپنا طفیلی بنانے کا عزم لیکر پاکستانی سرحدوں پر اپنی فوج کے ساتھ کھڑا اپنے آقاؤں سے حملے کا گرین سگنل ملنے کا منتظر ہے۔ امریکہ اور اس کا اتحادی برطانیہ پاکستان پر دباؤ بڑھا رہے ہیں کہ بھارت کی بات مان لو اور کشمیر پر سمجھوتہ کرلو۔

امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی بھی مجبوری ہے۔ وہ افغانستان میں ابھی تک اپنی

مرضی کے مطابق نتائج حاصل نہیں کر سکے۔ صورتحال روز بروز "روسی قبضہ" والی ہوتی جا رہی ہے۔ اگرچہ ابھی تک امریکہ پُرامید ہے کہ وہ اپنی مرضی کی صورتحال پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے گا لیکن کابل کے علاوہ پورے افغانستان میں کہیں بھی اس کی کٹھ پتلی حکومت کا حکم نہیں چل رہا۔ ادھر گوریلا کارروائیوں کا آغاز ہو چکا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ امریکہ ویت نام والا تجربہ دھراتا ہے یا اپنے حلیفوں کو افغانستان میں پھنسا کر خود ہوائی حملوں پر اکتفا کرتا ہے۔

تیل کا مسئلہ جوں کا توں ہے۔ گوادر میں چینی شب و روز مصروف ہیں۔ سڑکیں بن رہی ہیں، بندرگاہ پر کام زور شور سے جاری ہے۔ ان حالات میں امریکہ اور اس کے حلیفوں کی مجبوری ہے کہ وہ فی الوقت پاکستان پر ایک حد سے زیادہ دباؤ نہیں ڈال سکتے اور بھارت کو حملہ کرنے کیلئے گرین سگنل نہیں دے سکتے۔ اگر خدانخواستہ بھارت کے ساتھ پاکستان کی جنگ چھڑ گئی تو دونوں طرف جانی و مالی نقصان کے علاوہ جو نتیجہ نکلے گا وہ سوویت یونین کے انجام سے مختلف نہیں ہوگا۔ بھارت کی ریاستوں کو علیحدہ ہونے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔ جس طرح سوویت یونین کے اونٹ کی کمر پر افغانستان کی جنگ آخری تنکا ثابت ہوئی تھی اسی طرح بھارت کو بھی پاکستان کے ساتھ جنگ کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ بھارت کی اقتصادی حالت تو بہر حال سوویت یونین سے بدتر ہے۔ غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزارنے والے بھارتیوں کی تعداد 60 فیصد سے بھی زیادہ ہے۔

بھارتی حکومتوں نے اکھنڈ بھارت کے ایجنڈے پر کام کرتے ہوئے سب سے زیادہ توجہ پاکستان پر اس لئے دی ہے کہ علاقے میں سب سے زیادہ سخت جان حریف یہی ہے۔ پاکستان کو راستے سے ہٹانے کیلئے جس طرح عوام کا خون نچوڑ کر عسکری دیو بننے کی کوشش کی گئی اور بھارتی عوام کو جس بے دردی سے برباد کیا گیا وہ ایک بھیانک ریکارڈ ہے۔ دُنیا کا کوئی ملک اور اس کی حکومت اپنے سیاسی فائدے کیلئے اس طرح اپنے عوام کو تباہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی لیکن بھارت یہ کام کر رہا ہے اور ڈنکے کی چوٹ پر کر رہا ہے۔ کیا یہی بھارتی بدھی مانوں کی جنتا سے محبت ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پاکستان کے قائد نے تو اپنی جیب میں "کھوٹے سکوں" کا ذکر شروع میں ہی کر دیا تھا۔ چنانچہ قائد کے بعد پاکستان کو ایک مثالی فلاحی مملکت بنانے کا خواب پورا نہ ہو سکا۔ لیکن ایک بات جو قائد کی وراثت کے طور پر سنبھال کر رکھی گئی وہ یہ ہے کہ پاکستانی عوام نے اپنی آزادی اور سلامتی کے حوالے سے کوئی دباؤ کبھی قبول نہیں کیا۔ کوئی طاقت اور کوئی خطرہ چاہے وہ ایٹمی جنگ کا ہی کیوں نہ ہو، پاکستان کو جھکا نہیں سکا۔ اس کے برعکس بھارت نے پاکستان دشمنی میں 11 ستمبر کے بعد اپنی غیر جانبداری کو ایک طرف رکھتے ہوئے جس طرح اپنا سب کچھ امریکہ کے سامنے پیش کر دیا اس طرح تو کوئی غلام ملک بھی نہیں کرتا۔

بھارت ہمیشہ پاکستان اور مسلمان فوبیا میں مبتلا رہا ہے، تقسیم سے قبل شدھی تحریک سے لیکر آج احمد آباد (گجرات) کے مسلمانوں کے قتل عام تک انتہا پسند ہندو ایک ہی مقصد کے حصول کیلئے کوشاں ہیں۔ انہیں بھارت میں بسنے والا ہر مسلمان پاکستان کا ایجنٹ محسوس ہوتا ہے۔ اندرا گاندھی کے دور میں بھارت نے چین میں ایک وفد ڈی پی دھر کی سربراہی میں وہ حکمت عملی جاننے کیلئے بھیجا تھا جس کے تحت چین سے مسلمانوں کا صفایا کر دیا گیا۔

بھارت بھی اپنے ہاں یہی کچھ چاہتا ہے۔ پاکستان اور مسلمانوں کے خلاف تعصب کی آگ بھارتی قیادت کو جھلسا رہی ہے۔ سیاچن اور کشمیر میں بھارتی افواج کے بے پناہ اخراجات، ہلاکت خیز بموں کی تیاری، میزائیلوں کے انبار اور اب پاکستانی سرحدوں پر فوجوں کی طویل تعیناتی مسلمان دشمنی اور پاکستان دشمنی کے سوا کچھ نہیں۔ جواب میں پاکستان کو بھی اپنے دفاع میں کچھ کرنا پڑتا ہے۔ وہ اس کے بجٹ کو متاثر کرتا ہے۔ پاکستان کی اقتصادی حالت کا سبب داخلی عوامل کے علاوہ بھارت کے جنون سے تحفظ بھی ہے۔ یوں بھارت کے بدھی مان برصغیر کے کروڑوں افراد کو غربت اور تنگدستی کے عذاب میں دھکیلے ہوئے ہیں۔

بھارت کے دانشوروں کو چاہیے کہ وہ اپنے ملک میں معقولیت پسند رائے عامہ منظم کریں اور بھارتی قیادت کو مجبور کریں کہ وہ جیو اور جینے دو کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے برصغیر کے عوام کو عذاب مسلسل سے تحفظ دلائیں۔ اسی میں پورے خطے کی عافیت ہے۔

اگست 2002ء

زیتون کی ڈالی یا جنگ

مغربی ذرائع ابلاغ عسکری ماہرین کے تخمینے پیش کر رہے ہیں کہ اگر بھارت اور پاکستان میں جنگ چھڑ گئی تو بھارت اپنی عسکری بالادستی کی بدولت پاکستان کو روندتا ہوا آگے بڑھ جائے گا۔ پاکستان سب کچھ ملیامیٹ ہوتا ہوا دیکھ کر ایٹمی ہتھیار استعمال کرے گا۔ جواب میں بھارت بھی یہی کچھ کرے گا اور برصغیر کے کروڑوں افراد موت کے منہ میں چلے جائیں گے۔ مرنے والوں سے زیادہ تعداد ان افراد کی ہو گی جو سسک سسک کر زندگی گزارنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ جن علاقوں میں ایٹمی ہتھیار استعمال ہوں گے وہاں پھیلنے والی تابکاری برسوں تک حیوانی اور نباتاتی زندگی کو ناممکن بنائے رکھے گی اور پھر یہ تابکاری صرف ان علاقوں تک محدود نہیں ہو گی اس کی لپیٹ میں سینکڑوں میل کا خطہ آئے گا۔ چنانچہ مہذب دنیا اس ہولناک صورتحال سے بچنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہے۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ ایٹمی جنگ کو روکنے کیلئے مغربی طاقتیں، برصغیر کی دونوں ایٹمی قوتوں کو کوئی منصفانہ حل نہیں پیش کر رہیں۔ کوئی دانشمندانہ راستہ نہیں دکھا رہیں بلکہ پاکستان کو صرف پاکستان کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ بھارت کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔ بھارت جو کچھ چاہتا ہے اسے من و عن قبول کر لیا جائے۔

بھارت پوری دنیا کی توجہ برصغیر کے اصل مسئلہ سے ہٹا کر "سرحد پار دہشت گردی" پہ مرکوز کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ دنیا بھر کے سفارتی حلقے پاکستان کو اس دہشت گردی کی "پشت پناہی" کرنے سے باز رکھنے کیلئے سرگرم ہیں۔ کہیں سے کوئی کمزور سی آواز بھی نہیں اُٹھ رہی کہ اس مبینہ "دہشت گردی" کے اسباب پہ بھی ایک نظر ڈالی جائے۔ بھارت کو اپنے گریبان میں جھانکنے کی ضرورت سے آگاہ کیا جائے۔

گیارہ ستمبر 2001ء کے واقعات کے نتیجہ میں امریکہ نے جب اسامہ بن لادن کو اپنا مجرم قرار دیتے ہوئے افغانستان کے خلاف اعلان جنگ کیا تھا تو پاکستان کو صرف ایک

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سوال کا جواب دینے کیلئے کہا گیا تھا کہ......بتاؤ......تم ہمارے ساتھ ہو یا ہمارے دشمن کے ساتھ۔اور یہ سوال اس انداز میں اور اس طرح کی صورتحال وضع کر کے پیش کیا گیا تھا کہ پاکستان کے پاس امریکہ اور اس کے حلیفوں کا ساتھ دینے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں تھا ایک راستہ تھا جو ''تورا بورا'' کو جاتا تھا۔ چنانچہ ہمارے حکمرانوں نے داخلی مزاحمت کے باوجود ''سب سے پہلے پاکستان'' کا فیصلہ کر کے بلاشبہ ایک دانشمندانہ اقدام کیا۔

بھارت کو پاکستان کے اس فیصلے سے بہت بڑا دھچکہ پہنچا تھا۔وہ پاکستان کو اپنا تابع مہمل بنانا چاہتا ہے۔طالبان کے معاملے میں پاکستان کے بچ نکلنے پر اس نے اپنی عیاریوں کو نئے سرے سے مرتب کیا اور پھر صورتحال کو اس مقام پر لے آیا ہے جہاں عالمی قوتیں اس کی ہاں میں ہاں ملا رہی ہیں۔پاکستان کو وہ اقدامات کرنے کیلئے کہا جا رہا ہے جو بھارت چاہتا ہے۔اب پاکستان نے ایک بار پھر ایک بڑا فیصلہ کرنا ہے۔یہ فیصلہ کیا ہو؟ اس کے بارے میں ہماری رائے عامہ دو حصوں میں منقسم ہے۔اگرچہ دُنیا میں ہمیشہ سے کسی بھی ایک نکتہ پر کم از کم دو آرا پائی جاتی ہیں اور پاکستان میں اگر ایسا ہے تو یہ کوئی انہونی بات نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں قسم کی آرا یا دونوں نکتہ نظر ٹھوس دلائل رکھتے ہیں اور ہمارے فیصلہ سازوں کو کسی نتیجہ پر پہنچنے سے پہلے یقیناً دونوں آرا کو بار بار سامنے رکھنا ہو گا اور کئی بار سوچنا ہو گا۔

ایک نکتہ نظر یہ ہے کہ کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے اور یہ بات بانیٔ پاکستان نے کہی تھی۔13 سال سے کشمیر کے مظلوم مسلمان پاکستان کی بقا اور تکمیل کی جنگ لڑ رہے ہیں۔اب تک وہ 80 ہزار سے زائد قربانیاں دے چکے ہیں۔ان شہدا سے وعدہ کیا گیا تھا کہ پاکستان کسی حال میں ان کی سرپرستی سے منہ نہیں موڑے گا۔وہ پچاس ہزار خواتین جو پاکستان کی ضمانت پر تحریک حریت کشمیر کا حصہ بنیں اور اپنی متاع عصمت تک قربان کر بیٹھیں ان کی یہ قربانیاں اور یہ خون کس کی گردن پر ہے۔

پاکستان کا ہمیشہ سے یہ موقف رہا ہے کہ وہ کشمیریوں کی حق خود ارادیت کی جدوجہد میں سیاسی، اخلاقی اور سفارتی حمایت جاری رکھے گا۔اب پاکستان کا کشمیر کاز اور کشمیریوں

کی حمایت سے دستبردار ہونے کا ارادہ کشمیریوں کے متعلق اس کی کمٹمنٹ اور بنیادی موقف سے انحراف ہے۔آزاد کشمیر سے اگر کوئی شدت پسندی کی کارروائی ہو رہی ہے تو وہ کشمیر میں بھارت کی سات لاکھ فوج کے مظالم اور تحریک آزادی کو کچلنے کی کارروائیوں کے ردعمل کے طور پر ہو رہی ہے۔اگر کوئی چاہتا ہے کہ یہ کارروائیاں بند ہوں تو اسے کشمیریوں کو حق خود ارادیت دلوانا ہو گا۔

یہ نکتہ نظر رکھنے والے پاکستانیوں کا کہنا ہے کہ ''اگر ہم کشمیر کو بھلا دیں تو کیا ہماری جان چھوٹ جائے گی؟'' کیا اس کے بعد یہ مطالبہ نہیں کیا جائے گا کہ پاکستان اپنے ایٹم بموں کو بھول جائے۔کیا ایسا کرنے پر ہمیں معافی مل جائے گی؟ پھر ہم سے فوج کی تعداد کم کرنے کا مطالبہ کیا جائے گا۔پھر ہمیں اپنی تجارتی منڈی بننے پر مجبور کیا جائے گا۔چنانچہ سوچنے کی بات یہی ہے کہ آخر کہاں تک پسپائی اختیار کی جائے گی؟''

اب آیئے دوسرا نکتہ نظر رکھنے والوں کے دلائل دیکھئے ''پاکستان نے آزاد کشمیر سمیت اپنی سرزمین سے لائن آف کنٹرول کے اس پار کسی کو مقبوضہ کشمیر میں جانے کی اجازت نہ دینے کا جو اعلان کیا ہے وہ موجودہ حالات میں موزوں ترین ہے۔یقیناً یہ فیصلہ ہمارے ماضی کے موقف سے مختلف بلکہ متضاد ہے لیکن یہ قومی سلامتی کا سوال ہے۔ملک تباہ کن ایٹمی جنگ کے حقیقی خطرے سے دوچار ہے۔دشمن نے اپنی فوجوں کو حالت جنگ میں آخری سطح پر تیار کر دیا ہے۔دُنیا کی تمام بڑی طاقتوں نے برصغیر سے اپنے شہریوں کو واپس بلانا شروع کر دیا ہے۔کہا جا رہا ہے کہ بھارتی حکومت نے درپردہ ان ملکوں کو مطلع کر دیا ہے کہ وہ جون کے وسط تک اپنے شہریوں کو خطرے کے مقام سے بلا لیں۔امریکہ اور اس کے حلیف لائن آف کنٹرول کی خلاف ورزی کے بھارتی الزام کی حمایت کر رہے ہیں۔کہیں سے پاکستان کے موقف کی کھل کر حمایت نہیں ہو رہی۔دُنیا بھر میں بھارت کی حمایت میں آوازیں اُٹھ رہی ہیں یا خاموشی ہے۔

اسلامی کانفرنس کی تنظیم O.I.C جو پوری مسلم دنیا کی نمائندگی کا دعویٰ کرتی ہے وہ پاکستان کو درپیش صورتحال پر مہر بلب ہے۔المیہ ہے کہ مسلمان ملکوں کی اکثریت کو بھی فرداً

www.iqbalkalmati.blogspot.com

فرداً اس انتہائی تشویشناک صورت حال پہ کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ امریکہ اور یورپ کے نمائندے برصغیر میں امن وسلامتی کیلئے رات دن آ جا رہے ہیں لیکن مسلمان ملکوں کو اپنے ایک برادر اسلامی ملک کی حمایت میں متحرک ہونے کی توفیق نہیں ہوئی۔ پاکستان نے ہمیشہ دُنیا کے ہر فورم پر اور ہر محاذ پر فلسطین کی حمایت کی ہے۔ لیکن عرب لیگ جس کی دکھتی رگ فلسطین ہے۔ وہ بھی کشمیر اور پاکستان کیلئے بے حسی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔

جب بین الاقوامی سطح پر اور خصوصاً عالم اسلام میں پاکستان کیلئے اس نازک مرحلہ پر سازگار صورتحال نہیں تو پھر ضروری ہے کہ پاکستان اپنی حکمت عملی پھر سے مرتب کرے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا قول ہے کہ "شجاع وہ ہے جو عواقب ونتائج کو نظر میں رکھ کر قدم اٹھائے۔"

موخر الذکر رائے رکھنے والے حلقوں کا استدلال ہے کہ جو عالمی فضا اس وقت پائی جاتی ہے اس میں جنگ سے بچنے کی کوشش نہ کرنا ایک غیر دانشمندانہ حرکت ہوگی۔ ہم بھی یہ سمجھتے ہیں کہ موجودہ صورتحال میں محض جذباتیت کا اظہار دانائی نہیں۔ بعض اوقات بظاہر پسپائی سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔ نئی حکمت عملی ترتیب دینا پڑتی ہے۔ بھارت اپنی عیاریوں سے عالمی رائے عامہ کو جس مقام پہ لے آیا ہے، ہمیں وہاں سے پہلو بچا کر گزرنا ہوگا۔ اس شاخ کو بچایئے جس پہ آشیانہ ہے۔ خدانخواستہ کسی اندھی چھلانگ کے نتیجے میں صورتحال بالکل ہی قابو سے باہر ہوگئی تو پھر کہاں کشمیر اور کہاں کشمیر کاز...... پھر "گجرات" ہوگا۔ عالم اسلام کی خاموشی ہوگی اور خاکم بدھن نظریہ پاکستان کا مذاق اڑانے والوں کی لن ترانیاں ہونگی۔

ہمارا موقف یہی ہے کہ عیاری اور چالبازی کا جواب حکمت عملی سے دیا جائے۔ کشمیر سے ہماری جذباتی وابستگی کا تقاضا یہی ہے کہ کشمیر کاز سے دستبردار نہ ہوا جائے۔ لیکن اب تدبیر بدل لی جائے۔ حالات بدلتے رہتے ہیں آنے والے دنوں میں حالات اپنی گرفت میں لانے کی تدبیر کی جائے۔ 80 ہزار شہید کشمیریوں سے کیئے گئے وعدے پورے کرنے کیلئے جوش کی ہی نہیں ہوش کی بھی ضرورت ہے۔

برس ہا برس سے ہم دُنیا کو باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ کشمیر میں چلنے والی

تحریک آزادی وہاں کی مقامی تحریک ہے۔ پاکستان صرف اور صرف اس کی اخلاقی، سیاسی اور سفارتی حمایت کرتا آ رہا ہے تو پھر اس اعلان میں کیا قباحت ہے کہ ہم آزاد کشمیر کی سرزمین سے شدت پسندی کی کارروائیاں نہیں ہونے دیں گے۔

حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ بھارت کا غیر فوجی سربراہ، وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی جو "ہم جنگ نہ ہونے دیں گے" کے ترانے گایا کرتا تھا۔ اپنے مسائل کے حل کیلئے جنگ کو ناگزیر قرار دے رہا ہے اور پاکستان کا فوجی سربراہ جنگ ٹالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اگر امن کا نام نہاد پجاری جنگ کی دھمکیوں کو اپنی حکمت عملی بنا رہا ہے تو ہم امن کی حکمت عملی اپنا کر حالات اپنے حق میں کیوں سازگار نہ بنائیں۔

حرف آخر یہ کہ کشمیری پالیسی میں وقتی تبدیلی کا مطلب پاکستان کے دفاع میں بزدلی کیوں لیا جا رہا ہے۔ ہماری کشمیر کاز سے وابستگی بھی برقرار رہے گی ان کی حفاظت کیلئے بھی کسی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کیا جائے گا۔ یہاں بھارت کو ایک بات سمجھ لینی چاہیے کہ اگر پاکستان مسلسل امن اور مذاکرات کی بات کر رہا ہے تو اسے کسی کمزوری پہ محمول نہ کیا جائے۔ ہم اپنے صدر مملکت سے بھی کہیں گے کہ بھارت کی دھمکیوں کے جواب میں مسلسل "زیتون کی ڈالی" نہ اٹھائے پھریں گزشتہ چون سال کی تاریخ گواہ ہے کہ بھارت نے نہ کبھی مذاکرات کا راستہ سنجیدگی سے اپنایا ہے اور نہ وہ پرامن ذرائع کو اہمیت دیتا ہے۔ آپ بین الاقوامی برادری کے سامنے پاکستان کا موقف رکھتے ہوئے امن کو کشمیریوں کے حق خود ارادیت سے مشروط رکھیں اور بس!

جون 2002ء

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پاک بھارت مذاکرات......ایک نیا منظرنامہ

بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی کی جانب سے پاکستان کے چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف کو بات چیت کی دعوت یقیناً خوش آئند ہے کہ تناؤ اور کشیدگی کے نتائج کبھی اچھے نہیں نکلا کرتے۔ مذاکرات اور مل بیٹھ کر مسائل حل کرنے کا طریقہ کار مہذب دنیا کا پسندیدہ عمل ہے۔ تاہم اس پسندیدہ عمل کا التوا بھارت کی ہٹ دھرمی کے سبب تھا۔ جنرل پرویز مشرف تو گذشتہ سال دسمبر سے یہ کہتے چلے آ رہے ہیں کہ پاکستان کشمیر کے بنیادی تنازعہ پر کسی بھی جگہ، کسی بھی سطح پر اور کسی بھی وقت مذاکرات کیلئے تیار ہے۔ بھارتی قیادت پاکستان کے فوجی حکمرانوں سے گفتگو کرنے پر تیار نہیں تھی۔ اب اس کی ناپسندیدگی ختم ہوگئی ہے اور اس نے پڑوسی ملک کے "غیر جمہوری اور غیر نمائندہ حکمرانوں" کو اپنے ہاں بلا کر مذاکرات کا سلسلہ بحال کرنے پر آمادگی ظاہر کردی ہے۔

واجپائی اس اقدام کو بھارت کی شکست کی بجائے خوداعتمادی اور طاقت کا نام دے رہے ہیں۔ اب انہوں نے مذاکرات کے آغاز کیلئے "سرحد پار سے دہشت گردی" ختم کئے جانے کی شرط پر بھی اصرار نہیں کیا۔ بلکہ "وہ غربت وافلاس جیسے مشترکہ دشمن سے نمٹنے کیلئے جملہ تنازعات پر مذاکرات کر کے تعاون کی مستحکم بنیادیں قائم کرنا چاہتے ہیں۔" ان دلنشیں جملوں کے پیچھے اگر اخلاص کی نیت بھی ہو تو یقیناً نئے سورج طلوع ہو سکتے ہیں۔ لیکن پاک بھارت سربراہ ملاقات سے مثبت نتائج کی توقع کہاں کی جاسکتی ہے۔ مذاکرات کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا ابھی اس کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔

مجوزہ مذاکرات کے نتیجہ میں پاکستان اور بھارت کے درمیان دو سال کے تعطل کے بعد گفت وشنید کا سلسلہ بحال ہوگا۔ ظاہر ہے اس بات چیت کو نتیجہ خیز بنانے کیلئے اس کا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بامقصد اور تعمیری ہونا اشد ضروری ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ دونوں فریق دیانتدارانہ حقیقت پسندی سے کام لیں۔ بظاہر حقیقت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ چونکہ مسئلہ کشمیر نے برصغیر کے امن وسکون کو تباہ کر رکھا ہے اور اس کی وجہ سے دونوں ملکوں کے وسائل عوام کی فلاح و بہبود کی بجائے عسکری تقویت حاصل کرنے میں صرف ہو رہے ہیں۔ اس لئے اسے ''جیسے تیسے'' ختم کرنا چاہیے تاکہ اس خطے کی توانائیاں عوام کا معیار زندگی بہتر بنانے کے کام آئیں اور عدم اعتماد کی فضا ہمیشہ کیلئے ختم ہو جائے۔

بھارت نے عالمی رائے عامہ اور کشمیری مجاہدین کے شدید دباؤ کے تحت مذاکرات پر آمادگی ظاہر کی ہے۔ مبصرین کے سامنے سوال یہی ہے کہ کیا بھارت مذاکرات کا ڈرامہ رچا کر موجودہ داخلی اور خارجی دباؤ سے نکلنا چاہتا ہے جیسا کہ وہ ماضی میں کرتا آیا ہے یا پھر وہ واقعی اس دفعہ سنجیدہ و مخلص ہے کہ اس تنازعے کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دے جو برصغیر کو گھن کی طرح چاٹ رہا ہے۔ ایک طرف تو واجپائی اس مجوزہ ملاقات میں تنازعہ کشمیر کا حل تلاش کر لینے میں کامیابی کے امکانات کا ذکر کر رہے ہیں لیکن دوسری طرف بھارت ورکنگ باؤنڈری پر باڑ لگانے اور اسے بین الاقوامی سرحد میں بدلنے کی کوششوں میں مصروف ہے۔ مذاکرات کی افادیت کو بھی تسلیم کیا جا رہا ہے اور ورکنگ باؤنڈری پر فائرنگ اور سرحدی کشیدگی کو بھی ہوا دی جا رہی ہے۔ تو کیا پھر یہ مذاکرات کی دعوت دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش نہیں ہے؟ کیا بھارت کسی بڑی کارروائی کا جواز پیدا کرنے کیلئے یہ ناٹک رچا رہا ہے؟

تنازعہ کشمیر کی پیچیدگی صرف یہ ہے کہ گذشتہ ترپن برسوں سے دونوں ملکوں کے عوام کو جس نفسیاتی سانچے میں ڈھال دیا گیا ہے وہاں ''لچک'' کا مظاہرہ کرنے یا ''سابقہ پوزیشن سے ہٹنے'' کی بات کو پسپائی اور ہزیمت پر محمول کیا جاتا ہے۔ بھارتی قیادت روز اوّل سے اپنے عوام کو کشمیر کے تنازعہ کا سبب 1947ء میں وادی کشمیر میں ''پاکستانی حملہ آوروں'' کی مداخلت اور اس مسئلہ کا حل آزاد کشمیر کی بازیابی بتاتی چلی آ رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسٹر واجپائی کی طرف سے مذاکرات کی دعوت کو جرأت کا مظاہرہ اور پاک بھارت تعلقات کو معمول پہ لانے کی کوشش قرار دیتے ہوئے مسٹر جسونت سنگھ اور مسٹر ایل کے ایڈوانی کشمیر

بھارت کا اٹوٹ انگ ہے' کی گردان بھی کیے چلے جا رہے ہیں۔

ظاہر ہے جنرل مشرف کی دو روزہ ملاقات میں مسائل کے حل کیلئے کوئی سمت ہی متعین کی جا سکتی ہے۔ باقاعدہ حل تو نہیں نکل سکتا چلئے کچھ اور ملاقاتوں میں اور ذرا نچلی سطح پر مذاکرات میں حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ ممکنہ حل کیا ہو سکتا ہے۔ کیا بھارت اس بات پر تیار ہو سکتا ہے کہ وہ کشمیر پر بزور طاقت اپنے قبضہ کی غلطی تسلیم کر لے۔ کشمیریوں پر توڑے جانے والے مظالم پہ معذرت طلب ہو اور اقوام متحدہ میں دنیا بھر کے سامنے قبول کیے گئے استصواب رائے کے حل پر عملدرآمد پر تیار ہو جائے۔ کیا بھارتی قیادت بالفرض محال ایسا چاہنے کے باوجود اپنی انتہا پسند جماعتوں کی خواہشات کے علی الرغم ایسا کرنے پر تیار ہو جائے گی۔ اصولاً تو یہی ہونا چاہیے کیونکہ بھارت غاصب ہے اور اخلاقاً اسے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے پاکستان کے درست موقف کو تسلیم کر لینا چاہیے

بھارت کشمیریوں کا حق انہیں دینے پہ کبھی آمادہ نہیں ہوا۔ راجہ ہری سنگھ کی طرف سے بھارت کے ساتھ کشمیر کے الحاق کو قانونی بنیاد کشمیر میں کرائے جانے والے انتخابات کو استصواب رائے کا متبادل اور کشمیریوں کی تحریک آزادی کو پاکستان کی دہشت گردی قرار دے کر وہ عالمی رائے عامہ کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور ایک دنیا کو اس نے شیشے میں اُتار بھی رکھا ہے (اگرچہ اس کی وجوہات کچھ اور ہیں) چنانچہ بین الاقوامی سطح پر کشمیر کی قراردادوں کو فرسودہ اور بے کار کہا جانے لگا ہے۔ کارگل سے پاکستان کی واپسی کو جارح کی واپسی کہا جاتا ہے۔ کشمیری مجاہدین کی اخلاقی مدد پر پاکستان کو دہشت گردوں کی صف میں کھڑا کرنے کی کوششوں میں بھارت کی ہاں میں ہاں ملائی جا رہی ہے۔ کیا ایسی صورت حال میں بھارت اپنے دیرینہ موقف سے انحراف کر کے مذاکرات کو کامیاب بنانے کا ارادہ رکھتا ہے؟

اب آیئے پاکستان کی طرف' ہمارا دعویٰ ہے کہ کشمیری عوام پاکستان سے الحاق چاہتے ہیں اور یہ دعویٰ بے بنیاد نہیں کیونکہ تقسیم کے وقت کشمیری عوام کی مسلمان اکثریت پاکستان سے الحاق چاہتی تھی اور اس کی ترجمانی 19 جولائی 1947ء کو آل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس کے خصوصی کنونشن میں مندرجہ ذیل قرارداد منظور کر کے کی گئی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"آل جموں اینڈ کشمیر مسلم کانفرنس کے کنونشن کا یہ اجلاس قائداعظم کی کامیابی پر اطمینان کا اظہار کرتا ہے اور انہیں مبارکباد پیش کرتا ہے۔"

ہندوستان کی ریاستوں کے عوام کو یہ اُمید تھی کہ وہ بھی برٹش انڈیا کے عوام کے شانہ بشانہ آزادی کی منزل کی طرف رواں دواں ہوں گے۔ ہندوستان کی تقسیم عمل میں آجانے کے بعد برٹش انڈیا کے عوام آزادی حاصل کر چکے ہیں لیکن 3 جون 47ء کے اعلان نے ہندوستانی مہاراجوں کے ہاتھ مضبوط کر دیئے ہیں اور جب تک مہاراجے وقت کی آواز پر لبیک نہیں کہیں گے ہندوستانی ریاستوں کے عوام کا مستقبل تاریک رہے گا۔ اس وقت جموں وکشمیر کے عوام کے سامنے تین راستے کھلے ہیں۔

1- وہ بھارت کے ساتھ الحاق کر لیں۔

2- وہ پاکستان کے ساتھ الحاق کر لیں۔

3- یا آزاد رہیں۔

مسلم کانفرنس کا یہ کنونشن اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ جغرافیائی حالات مجموعی آبادی کی اسی فی صد مسلم اکثریت، پنجاب کے اہم دریاؤں کی ریاست میں سے گزرگاہیں، لسانی، ثقافتی، نسلی اور معاشی تعلقات اور ریاست کی سرحدوں کا پاکستان کی سرحدوں سے اشتراک، یہ سب حقائق اس امر کو ضروری قرار دیتے ہیں کہ ریاست جموں وکشمیر پاکستان کے ساتھ الحاق کرلے۔

مذکورہ بالا قرارداد کشمیری مسلمانوں کی نمائندہ سیاسی تنظیم نے منظور کی تھی۔ پاکستان کا استدلال تب بھی یہی تھا جب پنڈت نہرو کشمیر کے مسئلہ کو سلامتی کونسل میں لے گئے تھے۔ وہاں انہوں نے استصواب رائے کو اس خیال سے قبول کرلیا تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کشمیری عوام بھارت سے الحاق کو قبول کرلیں گے یا انہیں تحریص وترغیب کی بدولت اس فیصلے کیلئے قائل کرلیا جائے گا اور پھر موزوں وقت پر استصواب رائے کے ذریعے ان کی مہر تصدیق ثبت کرالی جائے گی۔ لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ آج بھی کشمیری عوام پاکستان سے الحاق چاہتے ہیں اور وادی میں پاکستان زندہ باد کے نعرے گونجتے ہیں۔

کیا پاکستان کے عوام اپنی کسی حکومت کے ایسے فیصلے کو قبول کرنے پر تیار ہوجائیں

گے جو تریپن سال سے چلے آرہے اس کے موقف سے انحراف کرکے کیا جائے۔ جس طرح بھارت اپنی سیاسی اور خصوصاً انتہا پسند سیاسی ومذہبی جماعتوں کی مخالفت مول نہیں لے سکتا اسی طرح پاکستان بھی ایسا نہیں کرسکتا اور پھر پاکستان کے پاس ایسا نہ کرنے کا ٹھوس جواز موجود ہے۔ تو پھر اس مسئلہ کا کونسا ممکنہ حل ہے جس کے بارے میں بھارت اور پاکستان دونوں ملکوں کی حکومتیں پُرامید ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جنوبی ایشیا میں امریکہ کی دلچسپی کی نئی لہر کوئی گل کھلانے والی ہے۔ چنانچہ تیسرے آپشن کا ذکر کبھی اشارے کنائے میں اور کبھی کھل کر کیا جارہا ہے۔ امریکہ اور بھارت کا ہنی مون چل رہا ہے۔ تنازعہ کشمیر کو ختم کرنے کیلئے امریکہ دو صورتوں میں دلچسپی لے سکتا ہے۔ بھارت کو آسودہ کرنے کیلئے کشمیر کی موجودہ سرحدوں کو مستقل بین الاقوامی سرحدوں میں تبدیل کرنے کیلئے اپنا اثر ورسوخ استعمال کرے اور اس حل کو حتمی صورت دلوادے۔ دوسری صورت جس کے امکانات روز بروز گہرے ہوتے جارہے ہیں وہ خودمختار کشمیر ہے۔ خودمختار کشمیر کو امریکہ اپنے لئے مرکز بنا کر چین کے گرد گھیرا تنگ کرنے اور ایشیا میں اپنے مفادات کو تحفظ دینے کیلئے استعمال کرسکتا ہے۔ یہ صورت امریکہ کیلئے زیادہ موزوں اور مناسب سمجھی جاتی ہے۔

کشمیر میں استصواب رائے بھارتی حکومت اور بھارتی انتہا پسندوں کیلئے بوجوہ قابل قبول نہیں۔ اگر کشمیری عوام استصواب رائے میں اپنی رائے پاکستان کے حق میں دیتے ہیں تو بھارت کیلئے اس سے بڑی ہزیمت ورسوائی کیا ہوسکتی ہے۔ اس کے سبھی دعوے باطل ہوجاتے ہیں اور عوام ایسے حکمرانوں کی تکہ بوٹی کردیں گے جنہوں نے ایک فریب پہ پردہ ڈالے رکھنے کیلئے عوام کو غربت وافلاس کی دلدل میں پھنسائے رکھا۔ بھارت جس صورت حال میں پھنسا ہوا ہے اس سے نکلنے اور عوام کو مطمئن کرنے کیلئے وہ خودمختار کشمیر کے امریکی پلان کا ساتھ دے سکتا ہے۔ بھارتی انتہا پسندوں کیلئے کشمیر کا پاکستان کی گود میں جانا تو کسی صورت قابل قبول نہیں لیکن خودمختار رہنا قابل قبول ہوسکتا ہے کہ اس طرح اس کے حریف پاکستان کو بھی تو کچھ نہیں ملے گا۔ بھارت کے انتہا پسند پاکستان سے کرکٹ کے میدان میں ہارنا بھی ناقابل برداشت توہین سمجھتے ہیں۔ کسی سیاسی یا عسکری مقابلے میں شکست کو وہ تصور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں بھی نہیں لا سکتے۔

شورش زدہ کشمیر بھارت کیلئے ناقابل برداشت بوجھ بن چکا ہے۔ پاکستان کا موقف بھارت کے موقف سے زیادہ مضبوط ہے۔ اس نے کشمیری رائے عامہ کو مطمئن کرنے کیلئے جنگ بندی کا ڈھونگ بھی رچایا۔ اس میں بار بار توسیع بھی کی۔ مجاہدین کو تقسیم کرنے کی کوشش بھی کر کے دیکھ لی۔ لیکن اس کی تمام کوششیں اور حربے ناکام ہو چکے ہیں۔ ایسے میں امریکی پلان کا حصہ بن کر بھارت اس کمبل سے جان بھی چھڑانا چاہتا ہے اور گٹھلیوں کے دام بھی وصول کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ امریکہ کشمیر میں اتر کر بھارت کو بہت کچھ پیش کر سکتا ہے۔ اور رہا پاکستان؟ تو کیا امریکہ اسے بدمعاش ریاست' ڈیفالٹر اور ناقابل اعتبار ایٹمی ملک قرار دینے کی دھمکیوں کے ساتھ سر تسلیم خم کرانے کی کوشش نہیں کرے گا؟ موجودہ صورت حال کا تقاضا ہے کہ ہم بھی اپنے دوسرے آپشن پہ توجہ دیں اور یہ آپشن ہے ایران' افغانستان' چین اور پاکستان کے درمیان روابط اور تعاون کو اس حد تک بڑھایا جائے کہ خطہ میں توازن پیدا کیا جا سکے۔ آنے والے موڑ پہ کیا ہونے والا ہے؟ ہمیں اس سے نمٹنے اور سرخرو رہنے کیلئے جس سفارتی ذہانت اور اعصابی قوت کی ضرورت ہے اس سے بے نیازی بہت مہنگی پڑ سکتی ہے۔

جولائی 2001ء

مذاکرات......ایک ٹریپ

”زیر نظر مضمون مذاکرات سے پہلے لکھا گیا اور قومی اخبارات میں چھپا، مذاکرات آگرہ میں جو کچھ ہوا وہ تفصیل سے اخبارات میں شائع ہو رہا ہے اور اب تو بہت ساری وہ باتیں بھی سامنے آ چکی ہیں جو ایسے معاملات میں خفیہ رکھی جاتی ہیں۔ مذاکرات کے فوراً بعد امریکی جنرل بھارت پہنچے اور آج کل نائب وزیر خارجہ کرسٹینا روکا بھارت اور پاکستان کے دورے پر ہیں ”ٹریک ٹو“ میں طے شدہ امور سے بھارت کے پیچھے ہٹ جانے پر امریکہ سمیت ساری دُنیا حیران ہے جب کہ پاکستان میں اس بات پر کوئی حیرانی نہیں بھارت کا پاکستان کے ساتھ وعدہ خلافیوں کا ایک طویل ریکارڈ ہے۔ اگر حالات کا تفصیل سے جائزہ لیا جائے تو ان مذاکرات کی کامیابی میں بھارت کا فائدہ ہی فائدہ تھا۔ اگر موٹا موٹا حساب لگایا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ بھارت اپنی سات لاکھ فوج پر کم از کم ایک سو روپے روز کا اضافی خرچ اُٹھا رہا ہے (جبکہ اصل میں اس سے بہت زیادہ ہے) سیاچن پر اٹھنے والے کروڑوں روپے روزانہ سمیت پیٹرول اور گولہ بارود وغیرہ کی شکل میں خرچ ہونے والی جملہ رقوم کو ملائیں تو یہ کم از کم ایک ارب روپے روز یعنی تین سو پینسٹھ ارب سالانہ کا یہ خسارا بنیا برداشت کر رہا ہے اسکے علاوہ ”ملٹری بلڈاپ“ پر کھربوں روپے سالانہ کا خرچ اسکے ان مکروہ عزائم کو ظاہر کرتا ہیں جو وہ پاکستان، مشرقِ وسطیٰ اور جنوبی اشیاء کے ممالک کے حوالے سے رکھتا ہے۔ بھارت کا نیا اتحادی امریکہ چین کے بارے میں اپنے عزائم کا کھلا اظہار کر رہا ہے۔ ان حالات میں زیر نظر مضمون میں جن امکانات کا اظہار کیا گیا ہے ان پر سنجیدگی سے غور کرنے اور اپنے آپشن پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہے۔“

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جب سے اٹل بہاری واجپائی وزیراعظم ہندوستان نے صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف کو مذاکرات کی دعوت دی ہے پورے پاکستان میں اخبارات کے اداریئے کالم نگاروں کے کالم پی ٹی وی پر دانشوروں اور اسکالروں کے مذاکرے سیاستدانوں کے افکار عالیہ وغیرہ تمام کے تمام "مذاکرات" پر دُور دُور کی کوڑی لانے اور نت نئے مفاہیم وضع کرنے میں جت گئے ہیں۔ گزشتہ پونے دو سال میں جنرل مشرف نے بیسیوں بار مذاکرات کی پیشکش کی اور اُدھر سے ہر بار انکار ہوتا رہا۔ قابل غور بات یہ ہے کہ پھر اچانک واجپائی کو کیا سوجھی کہ اُس نے فوجی حکمرانوں کو نہ صرف تسلیم کرنے کا برملا اعلان کیا بلکہ اسے مذاکرات کی گول مول ذومعنی لفظوں میں دعوت بھی دے دی؟

اسامہ بن لادن اور اُس کے چند ساتھی امریکہ کے اعصاب پر سوار ہیں۔ کیا کوئی تھوڑی بہت سوجھ بوجھ رکھنے والا انسان یہ بات مان سکتا ہے کہ امریکہ جیسی بڑی اور "واحد سپر پاور" کیلئے اسامہ بن لادن فرد واحد مسئلہ کھڑا کر سکتا ہے۔ اُٹھتے بیٹھتے اسامہ اسامہ کی دہشت ظاہر کی جارہی ہے۔ امریکیوں کو دنیا بھر میں خبردار کیا جارہا ہے کہ وہ اسامہ سے خبردار رہیں۔ کئی ممالک میں اس ڈر اور خوف سے امریکہ نے اپنے سفارت خانے بند کر دیئے ہیں کہ "اسامہ" کے حملہ کا ڈر ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ پورے امریکہ میں مائیں اپنے بچوں کو "اسامہ" کا نام لے کر ڈرانے لگی ہیں پوری امریکی قوم سرشام اسامہ کے خوف سے اپنے گھروں میں دبک جاتی ہے۔ آخر یہ سب کچھ کس مقصد کیلئے کیا جارہا ہے۔ یہ سوچنے کی بات ہے!

جیسے جیسے پاک بھارت مذاکرات پر دنیا کی اور خاص طور پر اس خطے کی توجہ مرکوز ہورہی ہے نہایت خاموشی سے بحر عرب اور بحر ہند میں سریع الحرکت امریکی فوج کے جم غفیر لشکر جمع کر دیئے گئے ہیں۔ پاکستان کو واضح لفظوں میں کہہ دیا گیا ہے کہ وہ طالبان سے دُور رہے۔ اسلام آباد میں امریکی سفیر کی سرگرمیاں معنی خیز ہیں۔ وہ افغان سفیر کی اسامہ کے بارے میں کوئی یقین دہانی سننے اور سمجھنے کو تیار نہیں۔ پاکستانی سیاستدانوں سے اُن کی ملاقاتیں اور امریکی لابی کے ساتھ رابطے تیز کر دیئے گئے ہیں۔ نام نہاد لبرل اور پیشہ ور

مولوی ایک زبان بول رہے ہیں۔ کشمیر جیسے پاکستان کے قومی مسئلے پر ARD جیسی تنظیم جس کے دو بڑے بیرون ملک سزا سے بچ کر چھپے بیٹھے ہیں۔ مشرف سے ملاقات کا بائیکاٹ کر رہے ہیں اور اپنے بائیکاٹ پر شرمندہ ہونے کی بجائے اُسے صحیح قدم قرار دے رہے ہیں۔

سندھ میں متحدہ اور جسقم یعنی آگ اور پانی میں اتحاد کروا دیا گیا ہے۔ ہڑتالیں اور جلاؤ گھیراؤ کی کوششوں کے بعد ضلعی انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا گیا ہے اور الطاف حسین کے لنگڑے اور کن ٹوٹے دہشت پھیلا کر انتخاب لڑنے والوں کو کہہ رہے ہیں کہ یا بیٹھ جاؤ یعنی الیکشن سے دستبردار ہو جاؤ یا لیٹ جاؤ یعنی مرنے کیلئے تیار ہو جاؤ۔ حکومت نے الیکشن کرانے کا عزم کر رکھا ہے۔ جو کچھ ہوگا وہ آئندہ چند روز میں سامنے آجائے گا لیکن اصل بات وہ نہیں جو سامنے ہے۔ اصل بات کچھ اور ہے جس کی پس پردہ تیاری ہے۔

جب سے گوادر میں چینی انجینئروں نے بڑے پیمانے پر تعمیراتی کام شروع کیا ہے۔ گہرے پانی کی بندرگاہ کا ایک وسیع و عریض منصوبہ اُبھرنا شروع ہوا ہے کوسٹل ہائی وے جو بلوچستان میں ساحل مکران کے ساتھ ساتھ 450 کلومیٹر طویل شاہراہ کی شب و روز تعمیر شروع ہوئی ہے جسے بالآخر انڈس ہائی وے سے ملا دیا جائے گا اور اس طرح شاہراہ ریشم اور نادرن ایریا براہ راست کراچی اور گوادر سے مل جائے گا اور پاکستان کے ان تمام علاقوں میں جہاں جہاں سے یہ سڑکیں گزریں گی وہاں خوشحالی آئے گی۔ لیکن جب سے یہ ظاہر ہوا ہے کہ وہاں چینی فوج اور انجینئرز ترقیاتی کاموں میں شب و روز مصروف ہیں امریکہ اور اس کے نئے حواری بھارت کی راتوں کی نیندیں حرام ہو گئی ہیں اور کوئی دن نہیں جاتا جب "امریکہ بھارت اور اسرائیل" گٹھ جوڑ سازشوں میں مصروف نہ رہتے ہوں۔ بلوچستان میں عطاء اللہ مینگل اور خیر بخش مری کی زیر سرپرستی BLF بلوچستان لبریشن فرنٹ اپنا وجود رجسٹر کرانے میں مصروف ہے۔ نواب اکبر بگٹی بھی کہہ رہے ہیں کہ سوئی گیس فیلڈ میں میزائل نشانوں پر بھی لگ سکتے ہیں؟

پچھلے دنوں ہندوستان نے ایٹمی جنگ کی ایک بڑی تربیتی مشق راجستھان میں آپریشن

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"وجے پورنا" کے نام سے کی تھی۔ یہ بھارت کی تاریخ کی سب سے بڑی جنگی مشق تھی' جس میں بظاہر ایٹمی حملے کی تیاری کا جائزہ لینا مقصود تھا لیکن اگر اُس مقام کو جہاں یہ مشقیں ہوئی ذہن میں رکھیں تو یہ بات صاف صاف محسوس ہوتی ہے کہ رحیم یار خاں کے علاقہ پر حملہ کر کے (خدانخواستہ) پاکستان کو دولخت کرنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔ ادھر سمندر سے امریکی فوج ساحل مکران پر حملہ آور ہو کر بظاہر افغانستان میں اسامہ بن لادن اور اس کے ساتھیوں کا قلع قمع کرنے اور اندر اندر BLF کو آگے رکھ کر آزاد بلوچستان بنانے' پاکستان کو اور آگے چل کر ایران کو سبق سکھانے کا واضح پروگرام رکھتی ہے۔

افغانستان ہو، ایران ہو یا پاکستان' خطہ میں امریکہ اور بھارت کی تازہ ترین انتقامی کارروائی کا شکار نیپال کا شاہی خاندان ساری دنیا کے سامنے ہے جسے چینی وزیر اعظم کے دورے اور اس کے نتیجے میں ہونے والے نیپالی عوام کے حق میں چند سمجھوتے سامنے آنے پر پورے کے پورے خاندان کو انتہائی بے دردی سے قتل کروادیا گیا۔ اس قتل کے اکثر و بیشتر عوامل تو اُسی وقت سامنے آ گئے تھے جبکہ باقی اب ایک مہینے کے اندر اندر سامنے آ چکے ہیں۔ ہر ملک میں مہاتیر محمد جیسے ذہین اور قوم پرست لیڈر نہیں ہوتے کہ بھیانک مالی بحران پر اپنی صلاحیتوں سے قابو پالیں ورنہ اُس کا حال بھی آج انڈونیشیا جیسا کر دیا گیا ہوتا۔ پاکستان تو امریکہ اور بھارت کی سازشوں کا پرانا شکار ہے۔ یہاں تو علی اعلان عوام کے منتخب اور مقبول وزیر اعظم کو پھانسی پر چڑھوا دیا۔ مشرقی پاکستان کے المیہ کو کیسے فراموش کیا جا سکتا ہے؟ اسی طرح اور بے شمار چھوٹے بڑے واقعات تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔

وزیر داخلہ معین الدین حیدر ملک کو ناجائز اسلحہ سے پاک کرنا چاہتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک مستحسن فیصلہ ہے۔ کوئی ذی شعور انسان اس کی مخالفت نہیں کر سکتا۔ لیکن سوچنے، سمجھنے اور دیکھنے والی بات یہ ہے کہ ملک کے موجودہ حالات میں عوام سے اسلحہ لینا کس کی ضرورت ہے؟ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے چند حقائق تو واضح طور پر اس کے برعکس عوام کو اپنے وطن کیلئے کٹ مرنے سینہ سپر ہونے اور دشمن کو یہ پیغام دینے کا ہے کہ ہم تمہاری سازشوں سے

عہدہ برآ ہونے کیلئے ہر لمحہ تیار ہیں۔ 65ء اور پھر 70ء کی طرح عوام کو ملک کے دفاع سے دور رکھنے' بے خبر رکھنے' ہاتھ پاؤں باندھ کر دشمن کے آگے ڈالنے کے مترادف ہے۔ جبکہ عددی قوت میں دشمن 1 کے مقابلے میں 10 کی طاقت رکھتا ہے' اسی طرح وسائل اور امریکہ و یورپ کی عملی مدد بھی اُسے حاصل ہے۔

پاکستان کے عوام گزشتہ 53 برسوں میں صوبائی اور قومی حکومتوں میں نااہل' نالائق' خودغرض' منافق' وطن دشمن اور غیر ملکی ایجنٹوں کے ہاتھوں' اُن کی وطن دشمن پالیسیوں کے نتیجہ میں مایوسی کی آخری سطح پر پہنچے ہوئے ہیں۔ انہیں اپنے حکمرانوں پر قطعاً اعتماد نہیں۔ 12 اکتوبر کو پاک فوج کی کارروائی نے اُمید اور حوصلہ کی جو شمع جلائی تھی وہ بھی اب دم توڑتی جا رہی ہے۔ پورے ملک میں سناٹا ہے' ہر چیز تقسیم در تقسیم کے عمل سے گزر رہی ہے۔ برملا فوجی حکومت کے صوبائی عہدے دار ایک دوسرے کو چور کہہ رہے ہیں۔ پانی کی تقسیم پر جو ہاہا کار مچی اُس سے سب ہی واقف ہیں۔ یہ ہاہا کار شروع کرنے والے علیحدگی پسند نہیں تھے انہیں شہ دینے والے تو صوبائی وزیر اور ماہرین ہیں۔ جبکہ ساری دنیا یہ بات جانتی ہے کہ پانی کا بحران قدرتی ہے' خشک سالی ہے' ڈیم خالی ہیں' دریا خشک ہیں' ندیاں نالے جھیلیں خشک ہیں اور ابھی ان کے بھرنے میں وقت لگے گا۔ پھر یہ شور یہ الزامات .... چہ معنے دارد؟

تقریباً 750 ارب روپے کا بجٹ پیش ہوا۔ عوام نے جو ہر سال بجٹ پر احتجاج' ٹیکسوں پر احتجاج' ہڑتالیں اور ہنگامے کرتے چلے آ رہے تھے۔ اس بار خاموش ہیں۔ اس لئے نہیں کہ یہ بجٹ عوام کو ریلیف بہم پہنچا رہا ہے یا پہنچائے گا۔ یہ بھی سابقہ بجٹوں کی طرح اعداد و شمار کا گورکھ دھندا ہے لیکن بہت واضح اور صاف صاف لفظوں میں آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے مفاد میں ہے۔ عوام کے مفاد میں نہیں۔ وزیر خزانہ کے پاس تقریباً 80 ارب ڈالر قرض ادا کرنے کا ایک ہی فارمولا ہے۔ گزارے کیلئے مزید قرض لو' قسطیں ادا کرنے کیلئے نئے ٹیکس لگاؤ' ڈاؤن سائزنگ کر کے محکمے بند کر کے' اثاثے بیچ کر قسطیں بروقت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ادائیگی کرو، وغیرہ مہنگائی روکنے، قیمتوں کو منجمد کرنے، نوجوان کو متحرک کرنے، بے روزگاری پر قابو پانے، قدرتی وسائل کو ترقی دینے یا نئے نئے ریونیو تلاش کرنے کی کوشش کا دور دور حکومت کی ترجیحات میں پتہ نہیں چلتا۔ بظاہر ایپک اور I.T کا غلغلہ ہے بے شمار ادارے تربیت اور تعلیم کے وجود میں آ چکے ہیں۔ لیکن یہ تعلیم یافتہ ہنرمند لوگ ملک میں کہاں کام کریں گے؟ چنانچہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ امریکہ اور یورپ کی اس شعبہ میں ضرورت کو پورا کرنے کیلئے ہم اپنے ذہین اور فطین افراد کو کوڑیوں کے مول بکتے دیکھ رہے ہیں۔ اُن کے پاس اس کے علاوہ چارہ بھی تو کوئی نہیں۔

حکمران طبقات کا اِلّا ماشاءاللہ ملک کے مفاد سے جتنا تعلق ہے وہ وزیر خزانہ شوکت عزیز نے یہ کہہ کر واضح کر دیا کہ آئی ایم ایف کی پالیسیاں پاکستان کے مفاد میں ہیں۔ گویا موجودہ سیٹ اپ سے اس کے برعکس فیصلہ کی اُمید رکھنا احمقوں کی جنت میں رہنے کے مترادف ہے۔ شروع میں جس سنگین صورت حال کا تذکرہ کیا گیا ہے ملک اُس خطرہ کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ "میڈیا" رنگین اشتہارات اور مصنوعی ترقیاتی پروگراموں کے کاغذی اعلانوں میں گم ہے۔ دانشوروں کو مفادات کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا ہے۔ عوام روٹی اور روزی کے مسائل سے دوچار ہیں۔ سیاستدان کی سوچ کرسی کے حصول سے باہر دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکی ہے۔ "کمانڈ" اور رینک اینڈ فائل جو اس وقت ملک کے سیاہ و سفید کے مالک ہیں، ایجنسیوں اور بیوروکریسی کے خوش آئندہ، خوشامدانہ جال میں پھنس کر اپنی بیدار آنکھوں سے حقائق کا ادراک نہیں کر پا رہے۔ یہ بالکل وہی حلوے اور بادشاہ والی کہانی ہے جس کے آخر میں بادشاہ اپنی گدڑی طلب کرتا ہے اور شاہی چوغہ اُتار کر گدڑی پہن کر نکل جاتا ہے۔

بھارت میں رہنے والے 24 کروڑ مسلمانوں، نچلی ذات کے ہندوؤں اور عیسائیوں کی حالتِ زار کو سامنے رکھئے۔ کشمیر میں مسلمانوں پر بھارتی فوج کے مظالم کو سامنے رکھئے اور یہ بھی یاد رکھئے کہ 65ء کی جنگ کے بعد بھارت کی سب سے بڑی سیکولر حکومت نے

اپنے سینئر بیوروکریٹس کو "سپین" میں اس بات کا جائزہ لینے کیلئے بھیجا تھا کہ وہاں سے مسلمانوں کا نام و نشان کیسے مٹایا گیا تھا۔ دشمن اپنے مکروہ عزائم کی تکمیل میں مکمل منصوبہ بندی سے سرگرم عمل ہے اور ہم اس کے "ٹریپ" میں اُس کے جال میں بڑی طرح جکڑے چلے جا رہے ہیں۔ اس سحر سے نکلنے کیلئے جس قوت اور جس عمل کی ضرورت ہے وہ تو اُسی وقت اپنا رنگ دکھائے گا جب ہم اُس جادو سے نکلنے کی کوشش کریں گے۔ اپنی صفوں میں چھپے دشمن کے ایجنٹوں کو کیفرِ کردار تک پہنچائیں گے۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہمیں وقت کے اس چیلنج کو ہمت اور حوصلے سے قبول کرنا چاہیے۔ ہم نے اپنا پیٹ کاٹ کر جو ایٹمی صلاحیت حاصل کی ہے وہ بھی ہمارے کام اُسی وقت آئے گی جب ہم تعمیرِ وطن اور تحفظِ وطن کیلئے دشمن کے حصار سے باہر نکلیں گے۔

ایران، افغانستان، پاکستان اور چین دنیا کے وہ ممالک ہیں جو خطہ میں استعماری سوچ کو دفن کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ پاکستان جس خطرہ سے فوری طور پر دوچار ہے اُس کا تقاضا یہ ہے کہ ہم "مذاکرات کے ٹریپ" سے نکلیں اور دشمن کے پس پردہ عزائم کو ناکام بنانے کیلئے پوری قوت اور ہمت سے مقابلے کی تیاری کریں کیونکہ مذاکرات کی میز پر کوئی چھومنتر نہیں ہوگا۔ ہمیں اُلجھانے کیلئے اور پوری قوم کی توجہ ہٹانے کیلئے مذاکرات کا سلسلہ چھیڑ دیا گیا ہے۔ بھارت سے گفت و شنید اور کشمیر کے مجوزہ حل کیلئے مختلف تجاویز ذرائع ابلاغ کے توسط سے زیرِ بحث لائی جائیں گی۔ ایک ایسی دھول اڑے گی کہ فضا مکدر ہو جائے گی اور جب دھول بیٹھے گی تو معلوم ہوگا کہ (خدانخواستہ) وہ ہو چکا ہے جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس کیلئے ہمارے کون کون سے کمزور مقامات ہیں جہاں ضرب لگنے کا امکان ہے۔ اسکا تذکرہ ہم نے اوپر کر دیا ہے۔ خدا نہ کرے ایسا ہو گیا تو پھر ہمارے مقدر میں صدیوں کی غلامی کے سوا کچھ نہیں۔

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

اگست 2001ء

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پردے کے پیچھے کیا ہے؟

برصغیر کے طبعی موسم کی طرح، اس کا سیاسی موسم بھی غیر یقینی ہے۔ تند و تیز دھوپ اور لو کے تھپیڑوں کے دنوں میں اچانک افق پہ کالی گھٹائیں نمودار ہوتی ہیں اور پھر جل تھل ہو جاتا ہے۔ ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگتی ہیں۔ اسی طرح پاک بھارت اعلیٰ قیادت غیض و غضب سے پھنکارتی ہوئی اچانک آجکل مسکراہٹوں کے تبادلے میں مصروف ہو گئی ہے۔ پیش بندی کی حکمت عملی کے تحت پاکستان پر حملہ آور ہونے کی بڑھکیں لگاتے لگاتے بھارتی قیادت نے اچانک دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا ہے۔ اب دونوں طرف سے محبت پاش پیغامات برصغیر کے عوام کو خوشگوار حیرت میں مبتلا کئے ہوئے ہیں۔ دوستی اچھی بات ہے۔ مذاکرات کے ذریعے مسائل حل کرنا ہی دانشمندی ہوتی ہے اور یقیناً مل بیٹھ کر اپنے تنازعات کو دور کرنے سے بہتر کوئی اور بات ہو ہی نہیں سکتی۔

بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی کی طرف سے اچانک دوستی کا ہاتھ بڑھانے اور وہ بھی سرینگر میں آکر ایسا کرنے پر عالمی مبصرین اور خود برصغیر کے مبصرین مختلف تبصرے کر رہے ہیں۔ کچھ ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ سب امریکی اشارے پر ہو رہا ہے۔ امریکی مفادات کا تقاضا ہے کہ جنوبی ایشیا میں امن و آشتی کی فضا قائم رہے۔ جس ایجنڈے پر کام کرتے ہوئے وہ افغانستان اور عراق میں آیا ہے۔ اس کی تکمیل کیلئے جنوبی ایشیا میں امن ضروری ہے۔

دُنیا بھر کی معیشت پہ اپنی گرفت مضبوط رکھنے کی خواہاں ملٹی نیشنل کمپنیاں اس خطہ میں بہر صورت امن چاہتی ہیں۔ مسئلہ کشمیر کے دونوں بڑے فریق ایٹمی طاقت ہیں۔ کشمیر کیلئے یہ دونوں فریق پہلے بھی نبرد آزما ہو چکے ہیں۔ اب اگر ایٹمی صلاحیت کے ساتھ یہ دونوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

برسرپیکار ہوتے ہیں تو یہ خطہ تباہی و بربادی کا ہولناک منظر بن جائے گا۔ اس کے اثرات محدود اور عارضی نہیں ہوں گے۔ ملٹی نیشنل کمپنیوں کی تشویش یہ ہے کہ ان کی یہ دونوں منڈیاں جنگ سے متاثر نہ ہو جائیں۔ جنگ سے تباہ حال برصغیر ان کی مصنوعات خریدنے کے قابل نہیں رہے گا ان کی اپنی سرمایہ کاری تباہ ہو جائے گی۔ چنانچہ یہ کمپنیاں مستقل امن کو یقینی بنانے کیلئے کشمیر جیسے بنیادی مسئلہ کو مستقل بنیادوں پر حل کرانا چاہتی ہیں۔

امریکہ جنوبی ایشیا کو جنگ سے دور رکھنا چاہتا ہے۔ اس کی خواہش اور کوشش کے پیچھے ایشیا کیلئے اس کے اپنے عزائم اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کا دباؤ موجود ہے۔ چنانچہ اس کی کوشش ہے کہ پاک بھارت تعلقات معمول پر لائے جائیں۔ وہ چاہتا ہے کہ اوّل تو کشمیر کی موجودہ جغرافیائی سرحدوں کو بین الاقوامی سرحدیں تسلیم کرلیا جائے اور بھارت کی خوشنودی کیلئے پاکستان پر دباؤ ڈال کر مجاہدین کو خاموش کرادیا جائے۔ امریکی نائب وزیر خارجہ رچرڈ آرمیٹج کے حالیہ دورہ بھارت میں آزاد کشمیر میں مجاہدین کے کیمپوں کے خاتمہ کی بات اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اور اگر بات اس طرح نہیں بنتی جس کا امکان زیادہ ہے تو پھر کشمیر کی ایک نئی تقسیم عمل میں لائی جائے۔ یہ تقسیم چناب فارمولا کے تحت تجویز کی گئی ہے جس کا ذکر آجکل زور شور سے جاری ہے۔

برصغیر کو تناؤ میں رکھنے والا بنیادی مسئلہ، کشمیر ہی ہے۔ دونوں ملک روزِ اوّل سے اس کیلئے اپنا اپنا موقف سختی سے اپنائے ہوئے ہیں۔ پاکستان کا مطالبہ رہا ہے کہ کشمیر میں سلامتی کونسل کی قراردادوں کے مطابق استصواب رائے کا اہتمام کیا جائے۔ بھارت کی رٹ رہی ہے کہ چونکہ تقسیم کے وقت کشمیر کا راجہ "بھارت سے الحاق" کا اعلان کر چکا ہے چنانچہ کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے۔ وہ کشمیریوں کی جدوجہد آزادی کو پاکستان کی طرف سے مداخلت اور سرحد پار دہشت گردی قرار دیتا ہے۔ آج بھی بھارتی قائدین دہشت گردی کی کارروائیوں کے خاتمہ کو مذاکرات کی شرط اوّلین کہتے ہیں۔

کشمیر پر اپنا تسلط برقرار رکھنے کیلئے بھارت نے اب تک کیا کچھ نہیں کیا۔ 1948ء

میں مجاہدین کی یورش سے بچنے کیلئے وہ سلامتی کونسل میں دوڑا چلا گیا۔ عالمی ادارے میں وعدہ کرلیا کہ کشمیر کی قسمت کا فیصلہ کشمیر کے عوام کریں گے لیکن استصواب رائے کا اہتمام کرنے کیلئے حالات سازگار ہونے کی اجازت دی جائے۔ پھر حالات کو اپنے حق میں سازگار رکھنے کیلئے سات لاکھ فوج کشمیر میں متعین کردی۔ 1990ء کے عشرہ میں کشمیر میں تحریک آزادی نے مسلح جدوجہد کی صورت اختیار کرلی۔ اب تک اسی ہزار سے زائد کشمیری نوجوان مادر وطن کی آزادی کیلئے اپنی جانیں قربان کر چکے ہیں۔ ہزاروں عصمتیں لٹ چکی ہیں۔ لیکن تحریک جاری ہے۔ تیرہ برسوں میں کشمیری مکمل طور پر ثابت کر چکے ہیں کہ انہیں بھارت کی غلامی قبول نہیں۔ بھارت نے تحریک آزادی کو کچلنے کیلئے ہر طرح کا جبر و تشدد آزما لیا ہے لیکن وہ کامیاب نہیں ہوسکا۔

فضاؤں میں تیرنے والے بڑے بڑے سوالیہ نشان یہی ہیں کہ مستقبل کیلئے پس پردہ کیا نقشہ مرتب ہو رہا ہے۔ کیا بھارت اٹوٹ انگ کے دعویٰ سے دستبردار ہو کر استصواب رائے پر تیار ہو گیا ہے؟ اس کا جواب ایک بہت بڑی "نہیں" ہے۔ ادھر پاکستان کا حال بھی یہی ہے۔ اگرچہ وزیراعظم جمالی کہہ رہے ہیں کہ مسئلہ کشمیر "بہرحال" حل ہونا چاہیے لیکن اس بہرحال میں استصواب رائے کے مطالبہ سے دستبرداری پاکستانی عوام کبھی قبول نہیں کریں گے۔

سوال یہی ہے کہ کیا یہ بیل منڈھے چڑھ سکے گی۔ مذاکرات تو یقیناً ہوں گے۔ سفارت، تجارت اور مواصلات کے شعبوں میں فوراً بحالی کے اقدامات ہوں گے۔ لیکن کشمیر کے مسئلہ کا تصفیہ (ہر فریق کے اپنے موقف کی روشنی میں) ممکن نہیں ہے تو کیا یہ سب کچھ ماضی کی طرح ادھورا اور ناپائیدار رہو گا؟ دونوں ممالک کے مدبرین اس دفعہ بہت مطمئن اور پرامید ہیں کہ اب کی بار مذاکرات کا سلسلہ شروع ہوگا تو انجام آگرہ نہیں ہوگا۔ ظاہر ہے بیک ڈور ڈپلومیسی کسی ایسے حل پر پہنچ چکی ہے جو دونوں فریقوں کی "فیس سیونگ" کا اہتمام کرتی ہوگی۔ شیخ رشید احمد جیسے باخبر وزیر تو گذشتہ کئی ماہ سے نوید سنا رہے ہیں کہ مسئلہ کشمیر کا حل اب ڈیڑھ دو برس کی بات ہے۔ ان کی نوید کے پیچھے نہ تو محض خوش فہمی ہے اور نہ ہی کسی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جوتش کا کمال۔ یقیناً پس پردہ کچھ ہو رہا ہے جو وقت آنے پر سامنے لایا جائے گا۔

پاکستان کے ایک حلقہ کا یہ موقف ہے کہ اگر بھارت اور امریکہ کی خواہش پر کشمیر میں مسلح جدوجہد ختم کردی گئی تو پھر بھارت اور امریکہ ہمارے ساتھ ایک بار پھر وہی سلوک کریں گے جو سلامتی کونسل میں تنازعہ کشمیر کے بارے میں منظور ہونے والی قراردادوں کے ساتھ کیا گیا تھا۔ اقوامِ متحدہ کے منشور کو پامال کر کے امریکہ نے جس طرح عراق پر قبضہ کیا ہے اسی طرح وہ آج پاک بھارت مذاکرات کامیاب کرانے کیلئے جو وعدے اور عہد و پیمان کرے گا، مستقبل میں انہیں بھی پامال کردے گا۔ چنانچہ ضروری ہے کہ کشمیر میں جدوجہد جاری رہے اور اس کے ساتھ ساتھ مذاکرات بھی کئے جائیں۔ تب ہی مذاکرات میں پاکستان کی بات کو وزن دیا جائے گا۔

پاکستان ہی کے ایک اور حلقہ کا کہنا ہے کہ ہماری کشمیر پالیسی نے ہمیں مسائل اور غربت کے سوا کچھ نہیں دیا۔ مسلح جدوجہد آزادی کے نتیجہ میں مقبوضہ کشمیر کے عوام اور خود پاکستان کو کیا حاصل ہوا۔ مقبوضہ کشمیر کے عوام کی زندگی میں کوئی بہتری آئی یا بہتری کے آثار پیدا ہوئے؟ پاکستان بھارت پر کوئی دباؤ بڑھانے میں کامیاب نہیں ہوا۔ خود پاکستان کو یہ معاوضہ ملا کہ وہ دو مرتبہ دہشت گرد ریاست نامزد ہونے سے بال بال بچا۔ اس حلقہ کا کہنا ہے کہ بھارت، پاکستان اور کشمیری مجاہدین کو نئی حقیقتیں تسلیم کرلینی چاہئیں۔ بھارت یہ بھول جائے کہ کشمیر اس کا اٹوٹ انگ ہے۔ پاکستان اپنے تاریخی موقف یعنی واحد حل استصواب رائے میں لچک پیدا کرے۔ یوں تنازعہ کشمیر کا حقیقت پسندانہ حل ان کی نظر میں یہ ہے کہ تینوں متعلقہ فریق نئے حقائق کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے اپنے دیرینہ موقف میں تبدیلی لائیں اور ایک ایک قدم پیچھے ہٹ کر اس تنازعہ کو دانشمندی سے حل کریں تاکہ برصغیر کے کروڑوں افراد غربت کے چنگل سے نکل سکیں۔

آزاد کشمیر کا ایک سیاسی گروہ بھی کشمیر کی تقسیم کے حق میں دلائل دے رہا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر کشمیر کے مسلمان بھارت کے ساتھ نہیں رہنا چاہتے اور استصواب رائے میں

وہ پاکستان کے ساتھ الحاق کا انتخاب کرتے ہیں تو کشمیر میں رہنے والے ہندو پاکستان کے ساتھ رہنا پسند نہیں کریں گے ایسی صورت میں ایک نیا قضیہ شروع ہو جائے گا۔ کشمیر میں امن و سکون کا خواب مسلسل تشنہ تعبیر رہے گا۔ چنانچہ اس گروہ کے نزدیک کشمیر کے مسئلہ کا مستقل اور پائیدار حل یہی ہے کہ اسے آبادی کی بنیاد پر تقسیم کردیا جائے اور یہ عمل برصغیر کی تقسیم کی تکمیل ہوگا۔

آثار و قرائن بتاتے ہیں کہ "چناب پلان" ہی کو امریکہ کی آشیرباد حاصل ہے۔ گزشتہ ڈیڑھ دو برسوں میں بیک ڈور ڈپلومیسی کے ذریعے اسی پر کام ہوا ہے۔ آئندہ مذاکرات میں اسی پلان پر عمل درآمد کرنے کیلئے راستے متعین کئے جائیں گے۔ پردے کے پیچھے جو بھی ہے ارباب اختیار سے ہمارا مطالبہ ہے کہ اس کیلئے قوم کو اعتماد میں لیا جائے۔ پارلیمنٹ موجود ہے اس میں کسی بھی مجوزہ پلان کو عوام کے سامنے رکھا جائے۔ عوامی نمائندوں کو اس کے حسن و قبح پر بحث کا موقعہ دیا جائے اور پھر اس اتفاق رائے حاصل کر کے قوم کے مستقبل کا فیصلہ کیا جائے۔

جون 2003ء

کیا یہ ممکن ہے؟

آجکل برصغیر میں امن دوستی اور بھائی چارے کی فضا قائم کرنے کیلئے پاکستان اور بھارت کے درمیان غیر سرکاری یعنی عوامی وفود کا تبادلہ ہو رہا ہے۔ ان وفود میں اپنے اپنے ملک کے ارکان پارلیمنٹ صحافی اور تاجر حضرات شامل ہوتے ہیں۔ بھارت سے آنے والے وفود میں لالو پرشاد یادیو اور رام جیٹھ ملانی جیسے سیاستدان اور پاکستان سے جانے والے وفود میں مولانا فضل الرحمٰن اور چوہدری اعتزاز احسن جیسی شخصیات شامل تھیں۔ بھارت کے لیڈر ماضی کو فراموش کر دینے اور دونوں ملکوں کے درمیان نئے دوستانہ تعلقات کی وکالت کر رہے ہیں۔ دونوں ملکوں میں کھلی آمدورفت براہِ راست تجارت اور دونوں ملکوں کے مابین معمول کے تعلقات کی ضرورت پر زور دیا جا رہا ہے۔ بھارت کشمیر کو نظرانداز کر کے پاکستان کے ساتھ ہر طرح کے تعلقات قائم کرنے کیلئے بے چین ہے۔ وہ دنیا کو بتانا چاہتا ہے کہ بھارت ایک پرامن ملک ہے اور اپنے ہمسایوں کے ساتھ خوشگوار تعلقات کا خواہاں ہے۔ بھارت کے انتہا پسند لیڈروں کا بھی لہجہ بہت نرم ہے۔ ایل کے ایڈوانی بھی محبت بھری باتیں کر رہے ہیں جبکہ بھارت کے یوم آزادی کے موقعہ پر وزیر اعظم واجپائی نے بھی قوم سے خطاب میں پاکستان کے بارے میں مصالحانہ اور دوستانہ باتیں کی ہیں۔ بھارتی اپوزیشن خصوصاً کانگریس پارٹی اور بائیں بازو کے لیڈروں نے بھی پاکستان کے بارے میں شری واجپائی کے مصالحانہ انداز گفتگو کی تائید و حمایت کی ہے۔

ہمارے ہاں بھی کچھ اسی طرح کی باتیں سننے میں آ رہی ہیں۔ ڈاکٹر مبشر حسن کا تو کہنا ہے کہ دونوں ملکوں میں اچھے ہمسایوں کے تعلقات کی تمنا میں عوام اپنے حکمرانوں سے بہت آگے نکل چکے ہیں۔ دونوں ملکوں میں عوامی دباؤ حکمرانوں کو ہوشمندی کا راستہ اختیار کرنے پر مجبور کر دے گا۔ کچھ اور پاکستانی دانشوروں کا کہنا ہے کہ بھارت کے ساتھ تعلقات کو مسئلہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کشمیر کب تک یرغمال بنائے رکھے گا۔ ہمیں اس بند گلی سے نکلنا چاہیے کچھ تاجر حضرات بھی بھارت کے ساتھ تجارت کیلئے بے چین ہیں۔

دونوں ملکوں کے وفود پورے جوش وخروش کے ساتھ دوران قیام اور وطن واپسی پر عوام میں خیر سگالی اور باہمی محبت کے جذبات کا ذکر کر رہے ہیں۔ تاثر دیا جارہا ہے کہ پچپن سال سے قائم "نفرت کی دیواریں" دشمنی، مخاصمت اور محاذ آرائی مصنوعی ہیں۔ یہ معاندانہ فضا حکومتوں کی "مفادیا پھر دیوانگی" کے نتیجہ میں قائم ہوئی تھیں ورنہ برصغیر کے عوام تو آپس میں محبت واخوت کے جذبات سے سرشار ہیں اور وقت آ گیا ہے کہ برصغیر کے کروڑوں عوام کو پسماندگی، غربت اور محرمیوں سے نکالا جائے۔ دونوں ملکوں کو اپنے مسائل حل کرنے (غالباً نظر انداز کرنے) پر مجبور کیا جائے تاکہ دفاعی اخراجات کا جنون ختم ہو اور اس مد میں بلکہ اس سمندر میں غرق کئے جانے والے وسائل کو انسانی فلاح و بہبود اور تعلیم و ترقی کیلئے مختص کیا جائے۔

جنگ سے نفرت اور امن سے محبت بلاشبہ مہذب قوموں کی فلاسفی ہے۔ دونوں ملکوں نے جنگوں میں اُلجھ کر دیکھ لیا ہے چنانچہ اب محبت کے ساتھ امن کے فروغ کی کوششوں کو یقیناً تحسین کی نظر سے دیکھنا چاہیے۔ اس پس منظر میں عوامی وفود کی آمدورفت کو سراہا جارہا ہے اور سرکاری سطح پر دونوں طرف سے حوصلہ افزائی کی جارہی ہے۔ صدر پرویز مشرف نے بھارت سے آئے ہوئے پارلیمانی ارکان، ایڈیٹروں اور دانشوروں سے گفتگو میں کہا ہے کہ پاک بھارت تعلقات کی تاریخ بہت تلخ رہی ہے۔ دونوں ملکوں نے ایک دوسرے کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ اب دونوں ملکوں کو ماضی کی تلخیاں فراموش کر کے پرخلوص تعاون کیلئے آگے بڑھنا چاہیے۔

بھارت سے آنے والے مہمانوں کا کہنا ہے کہ اگر "دیوار برلن" گرائی جاسکتی ہے تو پاکستان اور بھارت کے درمیان نفرت کی دیوار کیوں نہیں گرائی جاسکتی۔ ایک استدلال یہ پیش کیا جارہا ہے کہ افغانستان اور عراق میں امریکہ کی آمد نے جنوبی ایشیا کو نئے خطرات سے دوچار کر دیا ہے۔ بڑی مچھلی ایشیاء کے پانیوں میں پہنچ گئی ہے چنانچہ چھوٹی مچھلیوں کو

اس سے بچنے کی تدبیر کرنی چاہیے۔ چنانچہ اسی پس منظر میں کہا جارہا ہے کہ تاریخ سے سبق سیکھا جائے۔ ماضی میں بیٹھے رہنے سے مستقبل دور ہو جاتا ہے۔ پاکستان اور بھارت کو اپنے داخلی مسائل اور عالمی سطح پر درپیش معاملات سے نمٹنے کیلئے امن وآشتی کی ضرورت ہے۔ دونوں ممالک کے درمیان تین جنگیں ہو چکی ہیں۔ اب حالات کا تقاضا ہے کہ مستقبل میں جنگ کے بارے میں سوچا بھی نہ جائے کیونکہ اب بات روایتی جنگ سے کہیں آگے نکل چکی ہے۔ ترقی کے ثمرات اپنے اپنے عوام تک پہنچائے جائیں اور کسی ایسی آندھی کو اپنے خطے کی طرف نہ بڑھنے دیا جائے جو ایشیا کے دو ممالک کی آزادی کے چراغ گل کر چکی ہے۔

یہ باتیں، یہ استدلال اور یہ تجزیئے بہت خوبصورت، دلکش اور خوش کن ہیں۔ کاش ایسا ہو سکے لیکن سوال یہی ہے کہ کیا یہ سب کچھ ممکن ہے۔ اگر یہ پیش رفت بھارت کی طرف سے غیر مشروط ہے تو کہیں "دیوانے کا خواب" تو نہیں اور اگر مشروط ہے تو اس کی شرائط ہم سے کیا قیمت وصول کرنا چاہتی ہیں۔ کیا یہ خدشات درست تو نہیں کہ "بھارت پاکستان کے ساتھ تعلقات کو بہتر بنا کر پاکستانیوں کو بھارت کی ثقافت اور تجارت میں اس قدر محو کر دینا چاہتا ہے کہ وہ بنیادی مسائل میں نرمی پہ اُتر آئیں۔" اب آیئے بھارتی استدلال کی طرف...... مثلاً دیوار برلن کی مثال کا اطلاق ہم پر کسی بھی طرح نہیں ہوتا۔ دیوار برلن دوسری جنگ عظیم کے بعد بڑی طاقتوں کی بندر بانٹ نے جرمنی کو ضعف پہنچانے کیلئے کی تھی۔ شہر تقسیم ہوا اور شہریوں کی مرضی ومنشا کے خلاف تقسیم ہوا۔ یہ دیوار ایک جبر کا نتیجہ تھی اور ایک ہی شہر کے باشندوں کو زبردستی ایک دوسرے سے الگ کر رہی تھی۔ چنانچہ شہری اس دیوار کے خاتمہ کیلئے دل کی گہرائیوں سے تمنائی تھی۔ یہ دیوار لوگوں کی سوچوں نے تعمیر نہیں کی تھی بلکہ جبر کی اس بے بنیاد دیوار کو دونوں طرف کے باشندے شدید نفرت کے ساتھ دیکھتے تھے۔ چنانچہ جوں ہی حالات سازگار ہوئے۔ اس دیوار کو گرا دیا گیا اور شہر کے دونوں حصوں میں حائل یہ مصنوعی رکاوٹ دور ہوگئی۔

لیکن پاکستان اور بھارت کے درمیان پائی جانے والی دیوار برلن بیرونی طاقتوں نے نہیں اس خطہ کے باشندوں کے دل ودماغ میں پائی جانے والی نفرت وکراہت نے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کٹڑی کی ہے کیونکہ مسلمان چاہے نام ہی کا ہو، ایک مخصوص انداز زندگی، ایک منفرد کلچر اور سوچ کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ حقیقت سب کو معلوم ہے کہ سرسید احمد خان سے لیکر قائداعظم تک تقریباً سبھی مسلمان لیڈروں نے اپنے سیاسی کیریئر کا آغاز ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں سے کیا لیکن انہوں نے ذہن، رویئے اور تنگ نظری کو قریب سے دیکھ کر اپنی راہیں الگ کر لیں۔

بھارت اور پاکستان کے درمیان بننے والی دیوار برلن (تقسیم ہند) جس پس منظر میں بلند ہوئی تھی کیا وہ سوچ ختم ہو گئی ہے؟ کیا دونوں ملکوں کے لوگ اس دیوار کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں؟ اور کیا اسے مسمار کرنے کی شدید خواہش مند ہیں؟ یقیناً ایسا نہیں ہے کیونکہ وہ اسباب اور عوامل تحلیل نہیں ہوئے۔ تو کیا پھر لالو جی کی خوشنما باتیں اور مولانا فضل الرحمٰن کی مجوزہ گول میز کانفرنس کا تصور اسے گرانے کیلئے کافی ہے؟

دوسری دلیل یہ دی جا رہی ہے کہ بڑی مچھلی ایشیا کے پانیوں میں پہنچ گئی ہے۔ چنانچہ ایشیا کی چھوٹی مچھلیوں کو اپنی بقا کیلئے کوئی لائحہ عمل مرتب کر لینا چاہیے۔ یہ درست ہے کہ وہ دو ایشیائی ملکوں کو نگل چکی ہے لیکن یہ بھی ادھورا سچ ہے۔ بڑی مچھلیوں نے جن دو چھوٹی مچھلیوں کو نگل لیا ہے کیا وہ اسے ہضم ہو رہی ہیں؟ اور کیا وہ اسے ہضم ہو بھی سکیں گی اور اسی پس منظر میں کیا پاکستان ایسی مچھلی ہے جسے کوئی مقامی یا بیرونی بڑی مچھلی نگل سکتی ہے اور کیا یہاں بھی صورتحال وہی ہے جو نگلی جانے والی دونوں چھوٹی مچھلیوں کے ساتھ پائی جاتی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ مقامی بڑی مچھلی ہمیں اپنا تابع مہمل بنانے کیلئے یہ ہوا کھڑا کر رہی ہے۔ بڑی مچھلی اور چھوٹی مچھلی، جس کی لاٹھی اس کی بھینس اور مائٹ از رائٹ جیسے محاورے اگرچہ آفاقی اصول ہیں لیکن تاریخ گواہ ہے کہ ایسا ہر جگہ اور ہر موقعہ پر نہیں ہوتا۔ یہ مستثنیات کی بات نہیں ایک اور آفاقی اصول کی بات ہے۔ پاکستان نہ تو تر نوالہ ہے، نہ بھینس ہے اور نہ غریب کی جورو۔ پاکستان نے اپنی تمام تر "سعادت مندی" کے باوجود امریکہ کی ہر خواہش اور حکم کو پورا نہیں کیا اور نہ ہی چودہ کروڑ عوام اپنی حکومت کو ایسا کرنے کی اجازت دیں گے۔ چنانچہ لالو جی، رام جیٹھ ملانی اور ان جیسے دوسرے بھارتی زعما خطرے کے ڈھول پیٹنے کی بجائے اس آگ کو بجھائیں جس کے شعلے دونوں ملکوں کے وسائل اور امن وسکون کو چاٹ

رہے ہیں اور یہ آگ مسئلہ کشمیر ہے۔

بھارت کشمیر کو اٹوٹ انگ قرار دیتا ہے جبکہ پاکستان کیلئے یہ شہ رگ کی حیثیت رکھتا ہے۔ دونوں ملک گذشتہ نصف صدی سے اس مسئلہ کو اپنے حق میں حل کرنے کیلئے عسکری اور سفارتی محاذوں پر اربوں ڈالر خرچ کر چکے ہیں اور مسلسل کر رہے ہیں۔ دونوں ملک کشمیر کو اپنے وجود کا ضروری حصہ قرار دیکر اپنے اپنے عوام کی توقعات اور جذباتی وابستگیاں جس مقام پر لے آئے ہیں وہاں سے واپسی کے راستے اگر بند نہیں تو اتنے کٹھن ضرور ہیں کہ دونوں حکومتیں اس کے بارے میں شائد سوچ بھی نہیں سکتیں مثلاً بھارت کے ایک سینئر پارلیمنٹرین کا کہنا ہے کہ جو بھارتی وزیراعظم کشمیر پہ سمجھوتہ کرے گا وہ 24 گھنٹے کے اندر اندر ہلاک کر دیا جائے گا۔ یہ بات بھارتی قوم کے مزاج اور سوچ کی عکاس ہے۔ ادھر صدر پرویز مشرف بھی کہہ چکے ہیں کہ جو پاکستانی لیڈر کشمیر اور ایٹم پر سمجھوتہ کرے گا وہ غدار ہوگا۔

تو پھر یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ کھولتے ہوئے پانی کے نیچے اگر آگ جلتی رہے گی تو اس پانی کا جوش ختم کرنے کیلئے چاہے اس میں کتنی بھی برف ڈالتے چلے جائیں یہ اُبال عارضی طور پر ہی ختم ہوگا؟ جب ڈھاک کے تین پات ہی رہیں گے۔ جب پنچوں کا کہا سرآنکھوں پر کہنے کے باوجود پرنالہ وہیں رہے گا۔ اور بقول لالو جی پنچائت میں جانے کے باوجود کھوٹا وہیں رہے گا تو پھر یہ سب کیا ہے؟

ستمبر 2003ء

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہی ڈھاک کے تین پات

آجکل پاک بھارت تعلقات میں دوستی اور بھائی چارہ لانے کی کوششیں سرکاری اور "عوامی" سطح پر زور وشور سے جاری ہیں۔ دوستی اور بھائی چارہ امن لاتا ہے۔ امن کسی بھی خطے کی ترقی وخوشحالی کیلئے ناگزیر ہے۔ امن اور دوستی کی ضرورت جس طرح بقیہ دُنیا کو ہے اسی طرح پاکستان اور بھارت کو بھی ہے۔ عوام کو مختلف ذرائع سے سمجھایا جارہا ہے کہ نصف صدی کی آویزش اور کشمکش نے برصغیر کی غربت اور پسماندگی میں اضافہ کیا ہے۔ ترقی کے راستے مسدود ہورہے ہیں۔ دانشمندی کا تقاضا یہی ہے کہ اپنے اختلافات اور تنازعات کو ختم کرنے یا پھر انہیں پس پشت ڈالنے کی راہ اپنائی جائے تاکہ برصغیر کے کروڑوں عوام ترقی و خوشحالی کے ثمرات سے بہرہ ور ہوسکیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ بات اتنی ہی سادہ اور آسان ہے۔ کیا تنازعات کی پیچیدگیاں اور دونوں ملکوں کے عوام کی نفسیاتی گرہیں اتنی آسانی سے کھل سکیں گی؟ کہا جاسکتا ہے کہ حالات ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے۔ موجودہ صورتحال نصف صدی کے بعد پہلی دفعہ ایسی ہے کہ فریقین دوطرفہ تعلقات کو بہتر بنانے کی پرجوش خواہش اور شدید ضرورت کا احساس رکھتے ہیں اور پھر مایوسی اور قنوطیت کی بجائے رجائیت اور خوش گمانی سے کام لینا چاہیے لیکن رجائیت اور خوش گمانی کی فضا اسی وقت قائم ہوگی جب موجودہ فضاؤں میں سے متعدد سوالیہ نشانوں کی گرد بیٹھ جائے گی مثلاً

کیا بھارت واقعی دوستی اور بھائی چارے کا متمنی ہے؟

کیا امن ودوستی کی یہ طلب غیر مشروط ہے؟

کیا بھارت کی سرکار اور عوام پاکستان کو برابری کی سطح پر عزت واحترام دینا چاہتے ہیں؟

اگر ان تمام سوالوں میں سے کسی ایک سوال کا جواب نفی میں ہے تو پھر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایں خیال است ومحال است وجنوں

اس لئے کہ بھارت نہ تو دُنیا کے کسی اور خطے سے اُٹھ کر ہمارے پڑوس میں اچانک آیا ہے اور نہ ہی اس کا ماضی صاف وشفاف ہے کہ ہم خوش گمانی کا دامن تھام لیں۔ کیا ہم بھول چکے ہیں کہ تقسیم ہند کے ایجنڈے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بھارت نے کشمیر پر زبردستی قبضہ کرلیا تھا۔ کیا ہم بھول گئے ہیں کہ 1966ء میں معاہدہ تاشقند پر دستخط کرنے کے باوجود 1971ء میں مشرقی پاکستان میں تخریب کاری اور منظم ریاستی مداخلت کے ذریعے ہمارے ملک کو دولخت کیا گیا تھا۔ 1972ء میں شملہ معاہدہ کے باوجود سیاچن پر قبضہ کرکے کشمیر میں صورت حال یک طرفہ طور پر تبدیل کردی تھی۔ حال ہی میں پاکستان نے دونوں ملکوں کے درمیان مذاکرات میں پیش رفت کیلئے کشمیر کنٹرول لائن اور سیاچن کے محاذوں پر یک طرفہ جنگ بندی کا اعلان کیا۔ بس، ریل اور فضائی سروس بحال کی گئی۔ لیکن بھارت نے یہ کیا کہ فائر بندی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے کنٹرول لائن کے ساتھ باڑ مکمل کرلی۔ لیاقت نہرو معاہدے اور انسانی حقوق کے عالمی منشور کے تحت بھارت اپنی مسلمان اقلیت کو تحفظ دینے کا پابند ہے لیکن وہاں جو کچھ مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا ہے اس کا منظر گجرات اور بابری مسجد کے واقعات بہت اچھی طرح پیش کررہے ہیں تو پھر اب بھارت کیوں ہمارے لئے کسی کایا کلپ کا مظاہرہ کرے گا۔

کیا بھارت کے انتہاء پسند...... اکھنڈ بھارت کی خواہش سے دستبردار ہو چکے ہیں؟

کیا بھارت مسئلہ کشمیر کو کوراِیشو تسلیم کرنے پر آمادہ ہو چکا ہے؟ کیا بھارت ہمیں برابری کی سطح پر عزت واحترام دینے پر تیار ہو گیا ہے؟ یقیناً نہیں۔ اس نے تو سارک کانفرنس میں برصغیر کی مشترکہ کرنسی اور یورپی یونین کی طرز پر جنوبی ایشیا کے ممالک کی یونین بنانے کی تجویز پیش کی ہے۔ اس سے پہلے پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش کی کنفیڈریشن بنانے کی تجویز بھی سامنے آچکی ہے۔ یہ سب کچھ اکھنڈ بھارت کے تصور کو نئے انداز میں آگے بڑھانے کی کوششیں ہیں۔ ایل کے ایڈوانی کہہ چکے ہیں کہ ہم اکھنڈ بھارت کا قیام چاہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ بھارت اور پاکستان دونوں کی جنتا کے فائدے کی بات ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ

دُنیا بھر میں اگر کوئی ملک دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے تو اسے متحد کرنے کی بات کو غلط نہیں سمجھا جاتا۔ ایڈوانی جیسے بھارتی قائدین کا کہنا ہے کہ جغرافیائی طور پر ہم ایک اکائی ہیں۔ ہم اسے کنفیڈریشن سے شروع کرنا چاہتے ہیں۔ اس طرح ایک ساتھ رہنے کا تجربہ ہو جائے گا۔ قدرتی وسائل کو یکجا کرکے استعمال کیا جائے تو پاکستان بھارت اور بنگلہ دیش سب کا فائدہ ہے۔ پہلے مرحلہ پر فیڈریشن قائم کی جائے اور بالآخر اکھنڈ بھارت بن جائے گا۔

بھارت کشمیر کا مسئلہ حل تو کرنا چاہتا ہے لیکن اس طرح نہیں جس کا مطالبہ سلامتی کونسل کی قراردادیں کرتی ہیں۔ وہ اسے اپنے انداز اور اپنے مفاد کے مطابق حل کرنا چاہتا ہے تاکہ ایک بھاری بوجھ سے نجات حاصل کرسکے۔ ابھی کل کی بات ہے آگرہ میں صدر مشرف اور وزیراعظم واجپائی کے درمیان مذاکرات ہوئے۔ صدر مشرف نے کشمیر کو کوراِیشو قرار دیا بات چیت ناکام ہو گئی اور واجپائی نے مشترکہ اعلامیہ جاری کرنے سے انکار کردیا۔ جولائی 2004ء میں سارک وزراء خارجہ کی میٹنگ میں شرکت کیلئے نٹور سنگھ اسلام آباد آئے تو اخباری اطلاعات کے مطابق صدر مشرف نے مسئلہ کشمیر کو ایک مناسب ٹائم فریم کے اندر حل کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ لیکن بھارتی وزارت خارجہ کے ترجمان نے کشمیر پر صدر مشرف کے ''مناسب ٹائم فریم'' پر مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ مسئلہ 56 سال پرانا ہے۔ اس کو آپ کس طرح ٹائم فریم میں حل کرسکتے ہیں۔ کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ یہ مسئلہ تین دن، تین ماہ یا تین سال میں حل ہو جائے گا۔ ابھی گزشتہ ماہ صدر مشرف نے مسئلہ کشمیر کے حل کیلئے ایک نئی تجویز عام بحث کیلئے پیش کی ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر متبادل تجاویز مسئلہ کشمیر کے حل کی بنیاد بن سکتی ہیں تو پھر مسئلہ کشمیر پر پاکستان کا دیرینہ موقف کس حد تک متاثر ہوگا۔ دیرینہ موقف جن قومی مفادات کو پیش نظر رکھ کر اپنایا گیا تھا ان کا کیا بنے گا۔ کیا ہم تقسیم کے نامکمل ایجنڈے کی تکمیل سے دستبردار ہو رہے ہیں۔ کیا اب کشمیر پاکستان کی شہ رگ نہیں قرار پائے گا۔ بھارت ایک منتقم مزاج، ضدی اور بدگمان ریاست ہے۔ ہمیں اس کے پچھلے ریکارڈ کو سامنے رکھ کر صورتحال کا سنجیدگی سے مطالعہ کرنا اور کسی ایسی غلطی سے بچنا ہے جو کشمیر پہ ہمارے مضبوط موقف کو کمزور نہ کردے۔ بھارتی حکومت کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حکمت عملی تو یہی نظر آتی ہے کہ پاکستان کو مذاکرات میں الجھا کر مسئلہ کشمیر کو منجمد کر دیا جائے یا اس پر بین الاقوامی دباؤ ڈال کر اپنی پسند کا حل مسلط کر دیا جائے۔ مسئلہ کشمیر بھارت کو یک طرفہ سہولتیں دینے سے حل نہیں ہوگا۔ اگر کسی طور پر بھی سلامتی کونسل کی قراردادوں کو پس پشت ڈالا گیا تو پاکستان دُنیا کے کسی فورم میں مسئلہ کشمیر پر بات کرنے کے قابل نہیں رہے گا۔

یہ سوال کہ کیا واقعی بھارت دوستی اور بھائی چارہ چاہتا ہے، اس لئے تشکیک اور غیر یقینی کی شدت رکھتا ہے کہ وہ اپنے لئے نیا بین الاقوامی کردار چاہتا ہے۔ دُنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہونے کا دعویدار "مہان بھارت" اب ایشیا کا چودھری اور سلامتی کونسل میں مستقل نشست کا طالب ہے۔ امریکہ اس سے ایشیا میں کام لینا چاہتا ہے اس کے بدلے ایشیا کی چودھراہٹ اور سلامتی کونسل کی رکنیت دلوانے کا خواہاں ہے۔ بھارت کی اس خواہش کے راستے میں پاکستان ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ وہ پاکستان کو بزور شمشیر اپنا زیرنگیں اور ہم نوا نہیں بنا سکتا چنانچہ وہ پاکستان کیلئے داخلی اور خارجی دباؤ تشکیل دینے میں معروف ہے۔ داخلی دباؤ کیلئے پاکستان کے صوبہ پنجاب میں اپنے لئے نرم گوشے پیدا کرنے کیلئے مختلف تنظیموں اور فورموں کو استعمال کیا جا رہا ہے۔ بھارتی اور پاکستانی پنجاب کے عوام کو ایک دوسرے کے قریب لانے کیلئے وفود کے تبادلے ہو رہے ہیں۔ تقریبات کا انعقاد ہو رہا ہے۔ عوام کو باور کرایا جا رہا ہے کہ ہماری زبان ایک ہے، ثقافت ایک ہے، مفاد ایک ہے، تہذیبی ورثہ ایک ہے چنانچہ ہمیں دشمنی ختم کر کے، دوریاں ختم کر کے، بدگمانیاں دور کر کے ایک نئے دور کا آغاز کرنا چاہیے جس میں امن و آشتی ہو۔

یقیناً یہ بہت اچھی بات ہے لیکن سوال پھر یہی اُٹھتا ہے کہ دشمنی کس طرح ختم ہوگی۔ کن بنیادوں پر صلح و آشتی کی عمارت استوار ہوگی اور پنجاب میں پیدا کیا جانے والا عوامی دباؤ بھارت میں کتنا موثر ثابت ہوگا۔ پنجاب اور ہریانہ کی آواز یوپی، سی پی اور گجرات کی آوازوں پہ غالب آ سکے گی۔ ادھر پاکستان میں پنجاب ہی نہیں دوسرے صوبے بھی پائے جاتے ہیں اور خود پنجاب اس معاملے میں ہم آواز نہیں ہے۔ مسئلہ کشمیر کے آبرومندانہ حل کے بغیر پاکستانی پنجاب کبھی بھی بھارت کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھانے پر تیار نہیں ہوگا۔

بھارت اور پاکستان کے عوام کے ذہنوں میں نصف صدی تک جس طرح نفرت اور دشمنی کا زہر انڈیلا گیا ہے وہ اب ان کی رگ و پے میں سما چکا ہے۔ کولکتہ میں بی سی سی آئی کی پلاٹینم جوبلی پہ بھارت اور پاکستان کے درمیان کھیلے گئے کرکٹ میچ میں بھارت کی شکست پر وہاں کا عوامی ردعمل سب کی آنکھیں کھولنے کیلئے کافی ہونا چاہیے۔ جس ملک کے عوام ساری دُنیا سے کھیل کے میدان میں ہارنا اس لئے برداشت کر لیتے ہیں کہ کھیل تو کھیل ہوتا ہے۔ وہی عوام پاکستان سے کرکٹ یا ہاکی میچ ہارنے کو قومی المیہ قرار دیتے ہوں۔ وہ کس طرح آپ کیلئے دیدہ و دل فرش راہ کر سکتے ہیں۔ پاکستانی وفود کی آؤ بھگت اور پیار دلار...... سب بھارتی حکمت عملی کا حصہ ہے۔ بھارت پاکستانی پنجاب کے "دانشوروں" کے ذریعے اپنا راستہ ہموار کرنا چاہتا ہے لیکن وہ بھول رہا ہے کہ یہ "دانشور" نہ کبھی رائے عامہ تشکیل دے سکے ہیں اور نہ دے سکیں گے۔ حقائق تقریروں سے نہیں بدلا کرتے۔

اگر بھارت برصغیر میں دشمنی اور نفرت کے الاؤ سرد کرنا چاہتا ہے۔ خطے کے ڈیڑھ ارب عوام کو ترقی و خوشحالی کے ثمرات سے بہرہ مند ہونے کی اجازت دینا چاہتا ہے۔ عالمی سطح پر اپنا قد کاٹھ بڑھانا اور اپنے کردار کو وسعت دینا چاہتا ہے تو اسے پاکستان کے ساتھ تنازعات کو برابری کی سطح پر آ کر عدل و انصاف سے حل کرنا ہوگا۔ اکھنڈ بھارت کے جنون سے نکلنا ہوگا۔ پاکستان کو نیپال یا بھوٹان بنانے کے خبط سے نجات پانا ہوگی۔ کشمیر کو اٹوٹ انگ کہنے کی تکرار چھوڑ کر اس کے مستقبل کا فیصلہ کشمیری عوام کی صوابدید پر چھوڑنا ہوگا۔ دو طرفہ مفادات کی بنیاد پر باہمی تجارت اور دوستی کے فروغ اور خطے کی خوشحالی کیلئے منصفانہ اقتصادی پالیسیاں اپنانا ہوں گی۔

مقبوضہ کشمیر کے دورہ کے دوران بھارتی وزیراعظم من موہن سنگھ نے کشمیر کے بارے میں اپنے پرانے موقف کا اعادہ کر کے ثابت کر دیا ہے کہ وہ لائن آف کنٹرول کو بین الاقوامی سرحد بنانے کے علاوہ کسی آپشن کو درخور اعتنا نہیں سمجھتا۔ چنانچہ پاکستانی قیادت کو بھی اپنے حالیہ لچکدار رویہ پر نظر ثانی کرنا ہوگی۔ اگر بھارت کی طرف سے ڈھاک کے وہی تین پات ہیں تو پھر ہمیں اپنے جائز اور منصفانہ موقف سے انحراف کی ضرورت نہیں۔

دسمبر 2004ء

سوالیہ نشان؟

پاک بھارت تعلقات آجکل ایک بار پھر محبت پاش دور سے گزر رہے ہیں۔ ایک دوسرے کیلئے وسعت قلبی اور کشادہ ظرفی کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ وہی باتیں جو معمول کے حالات میں ناقابل برداشت ہوتی تھیں انہیں بے نیازی کے ساتھ نظرانداز کیا جا رہا ہے۔ دونوں ملک جو ایک دوسرے کے نام پہ ہوا میں تلواریں چلایا کرتے تھے ایک دوسرے کو گلے لگانے کیلئے بیتاب نظر آتے ہیں۔ بھارت مسئلہ کشمیر کا ذکر چھڑنے پر شعلہ بداماں ہو جایا کرتا تھا۔ اب شبنم افشانی کے ساتھ اسے حل طلب تسلیم کر رہا ہے۔ پاکستان جو اس ضمن میں اقوام متحدہ کی قراردادوں سے کم کسی بات پر گفتگو کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتا تھا۔ انہیں ایک طرف رکھ کر بانہوں میں بانہیں ڈالنے کے پیغامات دے رہا ہے۔

جنگ و جدل، ہر وقت کا تناؤ، ایک دوسرے کو برداشت نہ کرنا، بلاشبہ جنگل کا قانون ہے۔ متمدن دُنیا پرامن بقائے باہمی پہ یقین رکھتی ہے۔ قرون وسطیٰ کی وحشت و بربریت کو مہذب دُنیا نفرت کے ساتھ دیکھتی ہے۔ انسانی معاشرت کا تقاضا ہے کہ جیو اور جینے دو۔ ایک دوسرے کو برداشت کرو۔ سماجیات کے ماہر کہتے ہیں کہ اچھی ہمسائیگی کے بغیر انسانی ترقی ممکن نہیں۔ افراد ہی نہیں اقوام بھی اچھے ہمسائے بن کر ہی انسانیت کے ارفع و اعلیٰ مقاصد حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر آپ اپنا پڑوس تبدیل نہیں کر سکتے تو پھر پڑوس کے ساتھ اچھے پڑوسیوں کا طرز عمل اختیار کریں۔

پاکستان اور بھارت ازلی و ابدی پڑوسی ہیں۔ نہ تو پاکستان کو اُٹھا کر کسی اور خطہ ارض میں پھینکا جا سکتا ہے اور نہ بھارت کو کہیں اور منتقل کیا جا سکتا ہے۔ بھارت نے پاکستان کا وجود ختم کرنے کی کوشش کی کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ ابتداء میں اس کا خیال تھا کہ برصغیر کی تقسیم کے بعد کٹا پھٹا اور کمزور ونا تواں پاکستان دو ایک سال

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بعد خود ہی بھارت ماتا کی آغوش میں آنے کیلئے گڑگڑانے لگے گا۔ چنانچہ بھارتی قیادت نے گاندھی جی کا مشورہ نہ مانا اور بڑا بھائی بننے پر پر تیار نہ ہوئے۔ لیکن اثاثہ جات روکنے، مہاجرین کا سیلاب پاکستان میں اتارنے اور افغانستان کو شرارت پر آمادہ کرنے کے باوجود پاکستان رینگتا گھسٹتا اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا اور پھر اِس طرح دوڑنے لگا کہ بھارت کے قابو میں ہی نہ آیا۔

پاکستان کو روزِ اوّل سے ہی بھارت کے عزائم کا اندازہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ اپنی سلامتی کیلئے اس نے ہر وہ قدم اُٹھایا جو عسکری اور دفاعی نکتہ نظر سے ضروری تھا۔ 1965ء میں کشمیر میں صورت حال قابو سے باہر ہوئی تو بھارت نے پاکستان کا قصہ ہمیشہ کیلئے ختم کرنے کا فیصلہ کیا اور ستمبر میں لاہور اور سیالکوٹ پر چڑھائی کر دی، ناکام ہو کر اس نے مشرقی پاکستان کو علیحدہ کر کے پاکستان کو کمزور کرنے کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔ مشرقی بنگال میں پائے جانے والے عدم اطمینان اور ہماری سیاسی اور عسکری قیادت کی ناعاقبت اندیشی سے فائدہ اُٹھایا اور پاکستان کو 1971ء میں دولخت کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب اس کا خیال تھا کہ 1950ء کے عشرے کا خواب 1970ء کے عشرے میں پورا ہو جائے گا اور پاکستان بالآخر اکھنڈ بھارت میں مدغم ہونے پر مجبور ہو جائے گا لیکن تمام تر کوششوں کے باوجود ایسا نہ ہو سکا۔

لیکن اِس تمام تر صورتحال میں دونوں ملک ہتھیار جمع کرنے کی اندھی دوڑ میں مصروف ہو گئے۔ دونوں نے اپنے عوام کے منہ سے نوالہ چھینا اور اسلحہ کے انبار لگا لئے۔ 1974ء میں بھارت نے ایٹمی تجربہ کیا اور برصغیر دفاعی اخراجات کے ایک نئے دور میں داخل ہو گیا۔ اپنی سلامتی کیلئے پاکستان کے خدشات ماضی کے آئینہ میں بے بنیاد بھی نہیں تھے۔ چنانچہ عوام کو واقعتاً گھاس کھانے پر مجبور کر کے اپنی قومی حمیت کے تقاضے پورے کئے گئے۔ میزائیلوں کی دوڑ کے ساتھ ساتھ دونوں ملک ایٹمی طاقت بھی بن گئے۔ اب دونوں ملک ایک دوسرے کو پھنکارتے ہوئے تو دیکھ سکتے ہیں لیکن ایٹمی اسلحہ کی موجودگی میں ایک دوسرے پر حملہ آور ہونے سے پہلے لاکھ بار سوچتے ہیں۔

دُنیا بائی پولر سے یونی پولر ہو گئی تو بین الاقوامی حالات تیزی سے نئے منظر تشکیل

دینے لگے۔ عالمی سطح پر مفادات اور ان کی ترجیحات میں ردوبدل ہوا تو برصغیر میں بھی حالات نئے رُخ پر چل پڑے ہیں۔ پاکستان اور بھارت کی قیادتیں امن و آشتی کیلئے زیادہ بے چین نظر آ رہی ہیں۔ کہا جا رہا ہے کہ برصغیر کے کروڑوں عوام کو کشیدگی، نفرت اور دشمنی کے عذاب سے نکال کر غربت، بیماری، پسماندگی کی بجائے جدید دُنیا کی نعمتوں اور آسائشوں سے صرف اسی صورت میں ہمکنار کیا جا سکتا ہے کہ بھارت اور پاکستان اچھے ہمسائے بن کر رہیں۔ اپنے وسائل کو عسکری اور دفاعی اخراجات کی بھٹی میں جھونکنے کی بجائے ترقیاتی شعبوں کیلئے مخصوص کیا جائے۔

ساری دُنیا جانتی ہے کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان بنیادی تنازعہ کشمیر ہے۔ جب تک کشمیر کا تصفیہ نہیں ہو جاتا برصغیر آتش فشاں کے دہانے پر رہے گا۔ چنانچہ عالمی سطح پر مفادات کے بہاؤ کا نیا رُخ بننے کے بعد پاکستان اور بھارت کی قیادتیں حالات کے دباؤ یا بین الاقوامی حکمت عملیوں کے نتیجہ میں کشمیر سمیت سبھی تنازعات حل کرنے کیلئے پرجوش نظر آتی ہیں۔ بھارت میں تو کہا جا رہا ہے کہ مل بیٹھنے اور بات چیت کرنے کا جو نیا عمل شروع ہوا ہے وہ انتخابات کے بعد آنے والی نئی حکومت بھی جاری رکھے گی۔

پاکستان اور بھارت کے فہمیدہ اور سنجیدہ حلقے ان تازہ جھونکوں پہ اظہار اطمینان کر رہے ہیں۔ معمولی سی سوجھ بوجھ رکھنے والا شخص بھی امن و آشتی اور خیر سگالی کا خیر مقدم کرے گا۔ ان حقائق سے کوئی بھی فرد چشم پوشی نہیں کر سکتا کہ برصغیر کے کروڑوں عوام کی قسمت میں غربت، بے روزگاری، بیماری اور بے بسی اس لئے لکھی جا رہی ہے کہ دونوں ملکوں کے بجٹ دفاع اور غیر ملکی قرضوں اور قرضوں کے سود کی ادائیگی میں صرف ہو رہے ہیں۔ صحت تعلیم اور بہبود کیلئے جو کچھ بچتا ہے۔ اس سے عوام کی آسودگی کا خواب کبھی بھی پورا نہیں ہو سکتا۔ دفاعی بجٹ میں کمی کی ایک ہی صورت ہے کہ دشمنی کی بجائے دوستی کی فضا میں زندگی گزاری جائے۔ اسی حقیقت کا ادراک دونوں ملکوں کے قائدین اور عوام کو ناگزیر دوستی کی طرف لا رہا ہے۔

یقیناً ایسا ہونا چاہیے اور خدا کرے برصغیر کے عوام کو کشیدگی اور تناؤ سے پاک فضائیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میسر آجائیں۔ان کی حکومتیں اپنے بجٹ عوام کی فلاح و بہبود کیلئے مختص کرسکیں۔ترقیاتی کام ہوسکیں۔معیشتیں بہتر ہوسکیں۔لوگوں کی آمدنی میں اضافہ ہو۔قیمتوں میں استحکام آسکے۔ خودکشیوں کی ضرورت نہ رہے۔کھلے آسمان تلے لوگ فٹ پاتھوں پہ سوتے ہوئے دکھائی نہ دیں۔ہمارے نوجوان ہاتھوں میں ڈگریاں پکڑے خوار نہ ہوتے پھریں۔آسودگی کی لہریں پورے برصغیر میں موجزن ہوں۔یورپ کی طرح برصغیر کے لوگ بھی باہمی رابطوں اور صنعت وتجارت میں آزادی کے ساتھ آگے بڑھتے رہیں۔

لیکن کیا یہ سب کچھ اتنا ہی آسان ہے جتنا نظر آتا ہے؟ پاک بھارت تعلقات کے افق پر کتنے سوالیہ نشانوں کو تحلیل کئے بغیر کس طرح ایک تابناک دن طلوع ہوسکتا ہے؟ یہ سوالیہ نشان ہیں مسئلہ کشمیر کا حل؟ گذشتہ پچپن سال سے غالب معاندانہ نفسیات؟ ماضی کے تجربات؟ مستقبل کے باہمی مفادات اور دونوں ملکوں کی خارجہ پالیسیوں کے تقاضے؟

سب سے پہلے مسئلہ کشمیر کو لیجئے۔دونوں ملکوں نے گذشتہ نصف صدی کے دوران اپنے اپنے موقف کو جائز ثابت کرنے اور اس پر قائم رہنے کیلئے اربوں بلکہ کھربوں روپے خرچ کئے ہیں اور یہ اخراجات عوام کے منہ سے نوالہ چھین کر پورے کئے گئے۔اپنے اپنے عوام کو مطمئن رکھنے کیلئے اور ان اخراجات کو قومی سلامتی اور حب الوطنی کے نام پر عوام کی بنیادی ضرورتیں نظر انداز کرکے وصول کیا گیا۔عوام مطمئن رہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ ضروری ہے۔بھارتی حکومت اپنے عوام کو تاثر دیتی رہی کہ پاکستان، بھارت ماتا کا ایک اور اٹوٹ انگ (کشمیر) اس سے چھیننا چاہتا ہے اور ایسا کسی صورت نہیں ہونے دیا جائے گا۔ادھر پاکستان کا موقف تھا کہ کشمیر کی آزادی برصغیر کی تقسیم کے اُدھورے ایجنڈے کی تکمیل ہے۔کشمیر پاکستان کی شہ رگ اور اپنی شہ رگ پر سے دشمن کا قبضہ ختم کرانا قومی فریضہ ہے۔چنانچہ پاکستان کشمیر کی تحریک آزادی کی بہر صورت امداد کرتا رہے گا۔دونوں ملکوں کی قیادتوں نے گذشتہ پچاس پچپن برسوں میں عوام کے ذہنوں میں اپنے اپنے موقف کی اِس طرح آبیاری کی ہے اور انہیں اِس معاملے میں اتنا حساس بنا دیا ہے کہ کسی بھی ملک کے عوام اپنے سابقہ موقف سے دستبرداری یا معمولی سی پسپائی کو آسانی سے برداشت نہیں کریں

گے۔تو پھر آپ کشمیر کو بائی پاس کرکے آگے بڑھ سکتے ہیں؟

خوشگوار دوطرفہ تعلقات کے زینے پر چڑھتے ہوئے ہم پچپن سال کی نفرت و عداوت میں گندھی نفسیات سے یکایک کیسے خود کو آزاد کرلیں گے۔شری واجپائی نے 1857ء کی جنگ آزادی کی ڈیڑھ سو سالہ تقریبات اکٹھے منانے کی تجویز پیش کی تو پاکستان کے متعدد حلقوں نے اِس پر اسی لئے ناک بھوں چڑھائی کہ اِس تاریخ ساز واقع کیلئے ہندوؤں اور مسلمانوں کا نکتہ نظر ہی مختلف ہے۔اِن کے اور ہمارے ہیرو مختلف ہیں۔جنگ آزادی تو مسلمان لڑ رہے تھے جبکہ ہندو انگریزوں کی مدد کر رہے تھے۔پچھلے پچپن سال سے بھارت اور پاکستان میں نصاب کے طور پڑھائی جانے والی تحریک آزادی کی تاریخ مختلف ہے۔نصاب تو رہا ایک طرف غیر نصابی کتابوں میں دونوں ملکوں کے مصنفین نے ایک دوسرے سے مختلف بلکہ متضاد تاریخ مرتب کی ہے۔ہماری تحریک آزادی کے دشمن بیک وقت انگریز اور ہندو تھے۔ہم نے اپنے طالب علموں کو باور کرا رکھا ہے ہندو ہمارا دشمن ہے۔ قائداعظم نے کٹا پھٹا پاکستان اِس لئے قبول کرلیا تھا کہ مسلمان اور ہندو ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔اِدھر مسلمانوں کو ہندوؤں اور بھارت ماتا کا دشمن قرار دیا گیا۔مسلمانوں کیلئے ہندو انتہا پسندوں کا رویہ تقسیم سے پہلے، تقسیم کے وقت اور بعد میں مسلم کشی، ایودھیا اور گجرات کے واقعات معاندانہ نفسیات کے مظاہرے ہیں۔آزادی کے بعد بھارت میں پاکستان کے خلاف اور پاکستان میں ہندوؤں کے خلاف جس طرح کی ذہنی و نفسیاتی ساخت پختہ ہو چکی ہے۔اس کو تحلیل ہونے اور تحلیل کئے جانے میں ایک وقت لگے گا۔آخر آپ ان زنجیروں کو توڑے بغیر آگے کیسے بڑھ سکتے ہیں۔ان زنجیروں کو توڑنے کیلئے آپ کو اپنے ماضی اپنی تاریخ کی نفی کرنا پڑے گی۔صدیوں کا زہر نکالنے کیلئے عشروں کی تپسیا درکار ہوگی۔

چلئے مذکورہ بالا دونوں مشکلات کو آپ زبردستی ایک طرف رکھ کر نیا سفر شروع کرتے ہیں۔اقتصادی تعاون اور تجارتی لین دین شروع کرتے ہیں تو بھارت کے ساتھ تجارت کی بنیاد کیا ہوگی؟ کیا تجارت برابری کی بنیاد پر ہوسکے گی؟ کیا پاکستانی مصنوعات کیلئے بھارت کی منڈیاں کھل جائیں گی؟ تجارت میں کامیابی کیلئے ضروری ہے کہ آپ کا مال معیاری ہو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور دام مناسب ہوں۔ اگر یک طرفہ تجارت کرنے کی کوشش کی گئی تو کیا نتیجہ نکلے گا؟

اور آخر میں خارجہ پالیسی...... کیا بھارت کے ساتھ خوشگوار تعلقات متضاد خارجہ پالیسی کے باوجود برقرار رہ سکیں گے۔ بھارت کو چین کے خلاف حصار بنانے کیلئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ بھارت کو نہ صرف چین کا حریف بلکہ اس کے ہم پلہ سیاسی، عسکری اور اقتصادی طاقت بنانے کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ بھارت سلامتی کونسل میں مستقل نشست چاہتا ہے۔ ایشیا میں چین کی ہمسری چاہتا ہے۔ چنانچہ امریکہ ایشیا میں طاقت کا نیا توازن تشکیل دے رہا ہے۔ اس نئی صورت حال میں ہماری خارجہ پالیسی کیا ہوگی۔ کیا ہم بھارت کو خوش رکھنے کیلئے امریکہ کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے اس نئے منظر میں داخل ہو جائیں گے۔ یہ داخلہ چین سے دوستی ختم کرنے کی قیمت پر ہی ہو سکتا ہے۔ تو کیا ہم بھوٹان بننا پسند کریں گے؟

بھارت سے دوستی کی باتیں ان حالات میں ایک پیراڈاکس Paradox ہیں۔ دونوں ملکوں کی قیادتیں یہ گرہیں کیسے کھولتی ہیں؟ مورخ بے چینی سے اس کا منتظر ہے۔

فروری 2004ء

چار دن چوٹالہ کی قید میں

کورک شیترا...... مہا بھارت اور بھگود گیتا کی سرزمین ہے۔ تاریخ کے جھروکوں سے جھانکنا اور تاریخی مقامات کا سفر بہت سے لوگوں کی طرح میری بھی کمزوری ہے۔ بھارتی صوبہ ہریانہ کے چیف منسٹر چوٹالہ جی نے پاکستان (پنجاب) کے حالیہ دورے کے دوران پاکستانی پنجاب سے ایک وفد کو کورک شیترا میں ورلڈ پنجابی کانگریس کے تحت مجوزہ ایک سیمینار میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ ورلڈ پنجابی کانگریس کے چیئرمین فخر زمان نے جب مجھے اس سیمینار میں شرکت کیلئے وفد میں شامل ہونے کی دعوت دی تو میں نے کورک شیترا کے تاریخی پس منظر کے پیش نظر فوراً حامی بھر لی۔ مجھے اپنے ساتھ اہلیہ اور مزید دو افراد کی معیت کی دعوت دی گئی۔ چنانچہ اپنی اہلیہ، رضوان آغا اور حافظ تقی الدین کے پاسپورٹ ورلڈ پنجابی کانگریس کے حوالے کر دیئے گئے۔

جمعہ دس دسمبر 04ء دو روز قبل جناب فخر زمان کا فون ملا کہ بھارتی ہائی کمیشن اسلام آباد سے ویزے آ گئے ہیں لیکن صرف 80 ویزے جاری ہوئے ہیں۔ آپ کے گروپ سے رضوان آغا اور حافظ تقی الدین کو ویزا نہیں ملا۔ رضوان میرا بیٹا ہے۔ ابھی حال ہی میں اپنی تعلیم مکمل کر کے لندن سے لوٹا ہے۔ اس کے پاسپورٹ پر انگلستان کیلئے ''ملٹی پل'' ویزا لگا ہوا ہے۔ حافظ تقی الدین بھارت سمیت مختلف ممالک کا دورہ کر چکے ہیں۔ ان کی کتاب ''میرا سفرنامہ'' کلاسیک لاہور ہی نے شائع کیا تھا۔ میرا اور میری اہلیہ کا پہلا ردعمل تو یہ تھا کہ ہمیں بھی معذرت کر لینا چاہیے لیکن پھر دوستوں اور اہل خانہ کے اصرار پر ہم نے اس سفر کا فیصلہ کر لیا۔ ورلڈ پنجابی کانگریس کی طرف سے بھارت کا یہ میرا دوسرا سفر تھا۔ پہلے سفر میں ہم بھارتی پنجاب کے مہمان تھے۔ مہاراجہ پٹیالہ کے بیٹے کیپٹن ریٹائرڈ ہرمیندر سنگھ کی میزبانی میں پنجابی کانفرنس تین روز تک چندی گڑھ میں جاری رہی تھی۔ اس کی مکمل روداد ''بھارت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کتنا قریب کتنا دور؟ کے عنوان سے روزنامہ خبریں لاہور (6 قسطوں میں) اور سپوتنک ماہنامہ لاہور اکتوبر 04ء میں شائع ہو چکی ہے۔

فجر کی نماز کے بعد سفر کی تیاری شروع کی۔ خیال تھا کہ ناشتہ پریس کلب لاہور میں کریں گے۔ جہاں سارے ہم سفر جمع ہو رہے ہیں، وہاں پہنچ گئے۔ ساڑھے سات سے ساڑھے آٹھ بجے تک تمام ساتھی جمع ہو گئے۔ روانگی کا طے شدہ وقت سات بجے تھا لیکن بصد مشکل ساڑھے آٹھ بجے کے بعد کوسٹرز واہگہ کیلئے روانہ ہو سکیں۔ ناشتہ میں صرف ایک کپ چائے ملی تھی۔ واہگہ پہنچتے پہنچتے نو بج گئے۔ وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ اسلام آباد سے ویزے اور پاسپورٹ لیکر آنے والے صاحب ابھی تک نہیں پہنچے۔ ان کا انتظار ہے۔ ظاہر ہے ان سفری دستاویزات کے بغیر اگلا کوئی قدم نہیں اُٹھایا جا سکتا تھا۔ اللہ اللہ کر کے ساڑھے دس بجے پاسپورٹ پہنچے اور ان پر ضابطہ کی کارروائی شروع ہوئی۔ اس دفعہ وفد کے سربراہ فخر زمان صاحب بھی شروع ہی سے سب کے ساتھ موجود تھے۔ اب کی بار وہ بھی انتظار کی لذت سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ یہ ایک اچھی بات تھی۔ قائد کو وفد کے ساتھ ہی ہونا چاہیے تھا۔ پچھلی بار یہ کمی شدت سے محسوس کی گئی تھی۔

کسٹمز کا مرحلہ ابھی طے ہو رہا تھا کہ ہریانہ میں کانفرنس کے دعوت نامے تقسیم ہونا شروع ہو گئے۔ دعوت نامہ دیکھ کر پہلا جھٹکا لگا۔ دعوت نامہ ورلڈ پنجابی کانفرنس کی بجائے انٹرنیشنل سیمینار آن انڈیا پاکستان ریلیشنز: ایمرجنگ کواپریشن کیلئے تھا۔ گیارہ سے تیرہ دسمبر تک ہونے والے اس سیمینار کی دعوت کورک شیترا یونیورسٹی کے وائس چانسلر مسٹر اے کے چاولہ کی طرف سے تھی۔ گویا چوٹالہ صاحب نے پاکستان آ کر جس پنجابی کانفرنس کے ہریانہ میں انعقاد کا اعلان کیا تھا اور جس کی خواہش اور تمنا کا اظہار انہوں نے بڑے جوش و خروش سے کیا تھا وہ کہیں ہوا میں تحلیل ہو چکی تھی اور اس کی جگہ پاک بھارت تعلقات اس تقریب کا موضوع بن رہے تھے۔ اس غیر اعلان شدہ تبدیلی پہ سب کو حیرت ہو رہی تھی۔ ہمیں پاک بھارت تعلقات میں مثبت پیش رفت پر کبھی کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ ہم پڑوسی اور اچھے پڑوسیوں کی طرح رہنے کو دل و جان سے پسند کرتے ہیں اور پھر اگر کسی طرح پاک

بھارت تعلقات باہمی تنازعات کی الجھنوں سے آزاد ہو کر امن و خوشحالی کے راستے پر گامزن ہوتے ہیں تو ہم کیا کسی بھی پاکستانی کو کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا لیکن کیا دونوں طرف رائے عامہ خوشگوار تعلقات قائم کرنے کیلئے اس طرح ہموار کرنا سطحی اور غیر موثر نہیں ہوگا؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح کے اقدامات باہمی تعلقات کے ابلتے ہوئے پانی کا جوش ختم کرنے کیلئے اس میں برف ڈالنے کے مترادف ہیں۔ پانی کا جوش ختم کرنا ہے تو اس کے نیچے بھڑکتی ہوئی آگ کو سرد کرنا ہوگا اور یہ آگ یقیناً عوامی سطح پر نہیں بلکہ سرکاری سطح پر ہی بجھائی جا سکتی ہے۔ بہرحال فخر زمان صاحب کے سامنے یہ دعوت نامے تقسیم ہو رہے تھے۔ ان سے کیا پوچھا جاتا۔ اب یہ سفر مکمل ہوگا اور انشاء اللہ تمام حقائق سامنے آ جائیں گے۔

کسٹمز کی رسمی کارروائی کے بعد ہم نے اپنا سفری بیگ مزدور کے حوالے کیا اور "واہگہ بائی فٹ" روانہ ہو گئے۔ جیسے ہی ہم سڑک پر آئے۔ "دو مزدور نما" افراد سامنے آئے۔ دو بندوں کی ایک پرچی بنائی اور کہا چالیس روپے دے دیں۔ میں نے پوچھا کس بات کے؟ بولے، مسجد اور ڈسپنسری کیلئے۔ مزدور سے کہا گیا کہ اپنی مزدوری کے ساتھ یہ بھی لے لینا۔ باب آزادی کے نیچے یعنی کسٹمز پوسٹ سے بمشکل ایک فرلانگ کے فاصلہ پر پاسپورٹ نمبر وغیرہ پھر درج کیے گئے۔ مزدور کو پچاس روپے دیئے تو اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ پرچی کیلئے چالیس روپوں کا الگ مطالبہ کیا۔ بصد مشکل ایک سو روپے دیکر جان چھڑائی۔ نو مینز لینڈ کا تھوڑا سا فاصلہ طے کیا اور پھر بھارت کے گیٹ پر وہی کارروائی سامنے تھی۔ ایک سادہ سے رجسٹر پر پاسپورٹ وغیرہ کا اندراج BSF کا ایک میجر کر رہا تھا۔ نہ معلوم امیگریشن اور کسٹمز اندراجات کے بعد اس کارروائی کی کیا ضرورت تھی؟ بھارتی سرزمین پر مزدوروں کی ایک فوج ظفر موج موجود تھی۔ نیلی قمیضوں میں غریب دیہاتی مزدور سینکڑوں کی تعداد میں یلغار پر تھے۔ ہمارے وفد میں تو اسی افراد تھے پھر یہ اتنی بڑی تعداد کس لئے؟ پتہ چلا کہ افغانستان سے ٹرانزٹ میں ڈرائی فروٹ آ رہا ہے جو انہوں نے اُٹھا کر پہلے کسٹمز کے ویئر ہاؤس میں پہنچانا ہے اور پھر ٹرکوں میں لادنا ہے۔ پاکستان کی سمت سے سامان سے لدے ٹرک باب آزادی تک لا کر کھڑے کر دیئے جاتے ہیں۔ وہاں سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بھارتی مزدور ہی ٹرک سے مال اتار کر لے جاتے ہیں۔ جو طریقہ کار ہندوستان نے اپنایا ہوا ہے وہ پاکستان کیوں نہیں اپناتا۔ جواب تھا، مزدور ہی نہیں ملتے۔

بھارتی مزدور کے ساتھ ہم نے تمام مراحل طے کیے۔ یہاں بھی پرچی والا ڈرامہ موجود تھا۔ پوچھا کہ یہ چالیس روپے کس کھاتے میں؟ جواب ملا۔ ادھر بھی تو لے رہے ہیں۔ یہاں بھی بصد مشکل 100 روپے دیکر نجات حاصل کی۔ یہاں میزبانوں نے کیمپ لگا رکھے تھے۔ مشروبات سے مہمانوں کی تواضع کی جا رہی تھی۔ T.V چینلز اور اخبارات کے نمائندے سرحد پار سے آنے والوں سے گفتگو ریکارڈ کر رہے تھے۔ یہاں ہم نے جوس لیا تو کچھ سہارا ہو گیا۔ بتایا گیا کہ لنچ امرتسر میں ہو گا اور جب سارے ساتھی جمع ہو جائیں گے تو امرتسر کیلئے روانگی ہو گی۔ ایک بج چکا تھا۔ آہستہ آہستہ ساتھی چلے آ رہے تھے۔ اتنے میں سڑک پر کھڑی بسوں کے قریب ہریانے کا روایتی ''کولہا ڈانس'' ڈھول اور طبل کی دھن پر شروع ہو گیا۔ دھوتی قمیص میں ملبوس دس دس لڑکوں کے دو گروپ اپنے اپنے گروپ لیڈر کے ساز پر رقص پیش کر رہے تھے۔ یہاں ہریانہ کے دو وزیر بھی موجود تھے جو ہمارے وفد کے استقبال کیلئے آئے تھے۔ یہ رقص اور موسیقی بھی خوب تھی۔ وقت کا پتہ ہی نہ چلا۔ تین بج گئے بھوک اپنا رنگ دکھا رہی ہے۔ اب آخری گروپ بھی فخر زمان صاحب کی قیادت میں آن پہنچا۔ پریس اور چینلز کے نمائندے بڑی دیر سے ان کے منتظر تھے۔ کیمرے چلنے لگے، گفتگو شروع ہو گئی۔ تعلقات سدھارنے اور دوستی بڑھانے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ بالآخر سیکورٹی کی حفاظت میں قافلہ روانہ ہوا۔

خیال تھا کہ امرتسر میں کھانے کیلئے ٹھہریں گے لیکن قافلہ کمپنی باغ کی طرف سے ہوتا ہوا پھر جی ٹی روڈ پر آ گیا۔ ہریانہ کی طرف سفر جاری رہا۔ کسی نے یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ اب ہم کدھر جا رہے ہیں۔ دو اڑھائی گھنٹے کا سفر طے کر کے حویلی ریسٹورنٹ پہنچے۔ یہ ایک نجی ریستوراں ہے۔ گذشتہ سفرنامے میں اس کا ذکر تفصیل سے ہو چکا ہے۔ یہاں کھانا کھایا، لسی پی، آئس کریم کھائی اور پھر باہر آ کر ملحقہ ولیج ماڈل دیکھنے نکلے تو پتہ چلا کہ پاکستانیوں کیلئے فی کس 250 روپے ٹکٹ لگا دیا گیا ہے۔ ہم نے تو پچھلی مرتبہ گھوم

گھام لیا تھا جو کچھ اندر ہے وہ میں تو دیکھ چکا تھا۔ بیگم کو دکھانا چاہتا تھا لیکن -/250 روپے کا ٹکٹ کسی نے بھی خریدنا مناسب نہ سمجھا۔ چنانچہ بغیر دیکھے واپس آ گئے۔ یہاں سے بسیں روانہ ہوئیں۔ اب ہماری اگلی منزل ہریانہ اور اس میں کروک شیترا تھی۔

کروک شیترا ایک مذہبی شہر ہے۔ اس کے بارے میں مہیا کی گئی معلومات بتا رہی تھیں کہ ہزاروں سال پہلے یہاں شمالی ہندوستان کی ایک خوشحال تہذیب پھل پھول رہی تھی۔ یہاں کرشن مہاراج نے اپنا بچپن گزارا تھا۔ بھگود گیتا کی جنم بھومی اور مہا بھارت کا یدھ کھیشتر ہے۔ 92 مربع کلومیٹر کے علاقہ میں ہندو زائرین کیلئے 360 مقدس مقامات ہیں۔ مقامی روایات کے مطابق بھگوان برہما نے یہیں پر انسان اور کائنات کو تخلیق کیا تھا۔ یہیں راجہ کورو نے اپنی سرزمین کیلئے قربانی پیش کی تھی۔ یہیں شری کرشن نے بھگود گیتا کا وعظ دیا تھا اور اسی سرزمین پر مہا بھارت لڑی گئی تھی برہما سارور کے نام سے یہاں ایک بہت بڑا تالاب ہے۔ کہتے ہیں اس کی لمبائی 4.2 کلومیٹر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کائنات کے خالق...... برہما...... نے خود اس تالاب کا اہتمام کیا تھا۔ ایک اور مقدس تالاب سنہیت سارور ہے۔ یہ برہما سارور سے ایک کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔ ہندی روایات کے مطابق اس تالاب میں مقدس پانی بھگوان برہما کی ناف سے بہہ کر جمع ہوا تھا۔ یہاں کے دیگر مقدس مقامات میں ''جیوتی سر'' ہے۔ یہاں بھگود گیتا کا جنم ہوا تھا۔ ریلوے سٹیشن سے بارہ میل دور اس مقام پر شری کرشن اور ارجن کے خوبصورت مرمریں مجسمے ہیں۔ ستھانیسور شیوا مندر بھی یہاں کے تاریخی اور مذہبی مقامات میں نمایاں ہے۔ لکشمی نارائن مندر کے علاوہ بیسیوں گردوارے ہیں۔ راجہ کرنا کا ٹیلہ، راجہ ہرش کا باغ اور پتھری مسجد بھی کورک شیترا کے تاریخی خدوخال کا حصہ ہے۔

کورک شیترا میں بارہ سال کے بعد ایک میلہ لگتا ہے۔ لاکھوں ہندو بھارت کے دور دراز علاقوں سے یاترا کیلئے یہاں آتے ہیں۔ مقدس تالابوں میں اشنان کیا جاتا ہے۔ مندروں میں خصوصی پوجا ہوتی ہے۔ بڑے تالاب کے ارد گرد سیاحوں کے ٹھہرنے کا انتظام موجود ہے۔ شہر بھر میں دھرم شالائیں بنی ہیں۔ سفر جاری تھا۔ ہمسفر ساتھی ایک دوسرے کی معلومات میں اضافہ کر رہے تھے۔ ہنسی مذاق بھی جاری تھا۔ رات دس بجے ہم کروک شیترا پہنچ گئے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

شہر کے باہر ہی ہمیں ایک ریسٹورنٹ میں روک لیا گیا۔ یہاں بھی ڈھول کی تھاپ پر ہمارا استقبال کیا گیا۔ ریسٹورنٹ اچھا تھا۔ ایک بڑی سی بار یہاں پہلی منزل پہ موجود تھی۔ شوقین حضرات نے ادھر کا رُخ کرلیا۔ کھانا اچھا تھا۔ سبزی ترکاری، دالیں مٹر پلاؤ، چھوٹی چھوٹی روٹیاں، پنیر کے کوفتے، گوشت خوروں کیلئے مرغ کا گوشت قورمے کی شکل میں موجود تھا لیکن اس کی طرف کوئی بھی ہاتھ بڑھانے کو تیار نہیں تھا کہ نہ جانے یہ ذبیحہ ہے یا جھٹکے سے گزرا ہے۔

ضرورت کے مطابق ٹھنڈے گرم مشروبات سے تازہ دم ہو کر پھر روانگی ہوئی۔ اب ہم کروک شیترا میں داخل ہو رہے تھے۔ بتایا گیا کہ چونکہ یہ ایک مذہبی شہر ہے چنانچہ یہاں شراب کا استعمال سختی سے ممنوع ہے۔ یہ بات ہمیں ریسٹورنٹ میں ایک مقامی پروفیسر نے بتائی۔ شاید اسی لئے شہر میں داخلہ سے ذرا پہلے یہ ریسٹورنٹ مے خوروں کی ضروریات پوری کرنے کیلئے بنایا گیا ہے۔ ریسٹورنٹ میں پان کا سٹال بھی تھا۔ اس کی اپنی ایک خوبصورت وضع قطع ہے۔ انواع واقسام کے پان مسالے اور پتے موجود تھے۔ چواڑی میاں مہمانوں کے منہ میں خود گلوری رکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ ہماری رہائش کا انتظام "یاتری نواس" ہوٹل نیل کنٹھ میں تھا۔ کمرے اچھے اور صاف ستھرے تھے۔ اپنے اپنے ٹھکانے پہ پہنچتے ہوئے رات کے دو بج گئے۔

ہفتہ 11 دسمبر 2004ء کو رک کشیترا میں رات خاصی سرد تھی۔ چار کمبل بھی ناکافی ثابت ہوئے۔ لحاف کی جگہ دلائی رکھی گئی تھی۔ جیسے تیسے رات گزر گئی۔ صبح بالکونی میں سے سورج اُبھرتا ہوا نظر آیا چنانچہ قبلے کا تعین کر کے قضا نماز پڑھیں۔ آج فجر کے علاوہ کل کی ظہر، عصر، مغرب اور عشاء بھی قضا ہو چکی تھیں۔ چنانچہ سب قضا پڑھی۔ یہ کروک شیترا میں پہلا دن تھا۔ نیل کنٹھ یاتری نواس ریسٹورنٹ ہریانہ ٹورازم کا 4 سٹار ہوٹل ہے۔ خوبصورت طرز تعمیر ہے۔ درمیان میں لان اور چاروں طرف کمرے ہیں۔ یہ دو منزلہ عمارت محل وقوع کے اعتبار سے پرسکون جگہ پر واقع ہے۔ موسم خوشگوار تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ ناشتہ شروع ہوا۔ دس بجے تک سب لوگ فارغ ہو گئے۔ گیارہ بجے کانفرنس میں شرکت کیلئے یونیورسٹی

آڈیٹوریم میں جانا تھا۔ تقریباً ساڑھے گیارہ بجے روانگی ہوئی۔ آڈیٹوریم کافی بڑا تھا۔ سٹیج کو پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ ہلکی پھلکی موسیقی جاری تھی۔ پاکستانی وفد کے اراکین کیلئے نشستیں مخصوص تھیں۔ اس انٹرنیشنل سیمینار میں پاکستان کے علاوہ کس ملک کی نمائندگی تھی، اس بات کا پتہ نہ چل سکا۔ سٹیج پر پہلی رو میں چوٹالہ صاحب کے دائیں بائیں بیٹھنے والوں میں وائس چانسلر چاولہ، کانگریس کے چیئرمین فخر زمان، پاکستانی ڈپٹی ہائی کمشنر، عبداللہ حسین، فرخندہ لودھی اور منیر نیازی کی نشستیں مخصوص تھیں۔ منیر نیازی کے علاوہ سب موجود تھے۔ پچھلی رو میں امتیاز راشد اور چند پاکستانی اور باقی بھارتی تھے۔ اس موقع پر بھی کسی اور غیر ملکی کا نام سامنے نہ آیا۔ بھارت کی دوسری ریاستوں سے بھی کچھ لوگ آئے ہوئے تھے لیکن ان کا تعارف کرانے کی بھی ضرورت نہ محسوس کی گئی۔ البتہ پاکستانیوں کو ایک ایک کر کے اپنا تعارف کرانے کیلئے مائیک پکڑا دیا گیا۔ یار لوگوں نے اپنے نام اور کام کے ساتھ چیئرمین کی خوشامد میں اپنے جوہر دکھائے۔ تقریباً ایک گھنٹہ بعد اعزاز اسلم کا نمبر آیا تو انہوں نے یہ سلسلہ ختم کر کے مائیک واپس بھجوا دیا۔ اب جو رہ گئے سو رہ گئے۔

سٹیج سے وائس چانسلر صاحب نے استقبالیہ کلمات ادا کئے۔ وفد کو خوش آمدید کہا اور پھر فخر زمان صاحب نے نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ ویزا پالیسی نرم کی جائے۔ آمد و رفت میں آسانیاں پیدا کی جائیں۔ اگر اور کچھ نہیں تو کم از کم ویزا کے حصول میں مشکلات کو ختم کیا جائے۔ ان کے بعد بھارت میں پاکستانی ڈپٹی ہائی کمشنر نے پاکستانی موقف کے مطابق پاک بھارت تعلقات کو بہتر بنانے کیلئے بہت اچھی باتیں کیں۔ آخر میں چیف منسٹر اوم پرکاش چوٹالہ صاحب نے دوستی کی ضرورت پر زور دیا اور فرمایا کہ اگر عوام کا دباؤ بڑھے گا تو حکومتیں بھی اپنی پالیسیوں کو بہتر بنائیں گی۔ دوستی کے بیشمار فائدے گنوائے گئے۔ اُنہوں نے کہا کہ تجارت کریں، آئیں جائیں، ایک دوسرے سے میل ملاپ بڑھائیں۔ سب باتیں کیں لیکن جو کچھ کھل کر کہنا چاہیے تھا اس کا ذکر اشارۃً بھی نہ کیا۔ یعنی کشمیر کا تنازعہ اور ڈیموں کی تعمیر کا مسئلہ وغیرہ وغیرہ۔ چوٹالہ صاحب کی تقریر کے بعد اسٹیج پر بیٹھے پاکستانی وفد کے اراکین کو سوونیئر دیئے گئے۔ چادروں اور پینٹنگز سے نوازا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گیا۔ اسی طرح وائس چانسلر صاحب نے چیف منسٹر کو اور چیف منسٹر نے انہیں تحائف دیئے۔ بعد میں تمام اراکین کو شری کرشن کے رتھ کا مومنٹو پیش کیے گئے۔ ایک ایک ہینڈ بیگ دیا گیا۔ اس میں ہریانہ سے متعلق لٹریچر اور ایک ایک بال پن اور لیٹر پیڈ بھی تھا۔ چند ایک مقامی شرکاء سے گفتگو ہوئی۔ پتہ چلا کہ بھارت کی دوسری ریاستوں سے اساتذہ اور سکالرز کو بلایا گیا ہے۔ یہ لوگ بقیہ دو دنوں میں اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔ ہم نے سوچا کہ اس طرح پورے بھارت سے آئے لوگوں کے خیالات کو سمجھنے کا موقع مل جائے گا۔ ڈھائی بجے یہاں سے بسوں کے ذریعے لنچ کیلئے روانہ ہوئے۔ اس کا انتظام یونیورسٹی کی ملحقہ گراؤنڈ میں تھا۔ یہ پہلا کھانا تھا جس میں دخترِ رز موجود نہیں تھی۔ مذہبی شہر ہونے کے ناطے یہاں تقریبات میں شراب پیش نہیں کی جاتی۔ کم از کم ہمارے سامنے تو اسی تقدیس کا مظاہرہ کیا گیا۔ یہ لنچ ہریانہ کی حکومت کی طرف سے تھا۔ اس میں چیف منسٹر چوٹالہ کے علاوہ کچھ وزراء بھی موجود تھے۔ کھانا یونیورسٹی کے دوسرے کمپاؤنڈ میں تھا۔ سلیقے سے اہتمام کیا گیا تھا۔ یہاں چند پروفیسروں سے دوستی کے موضوع پر بات ہوئی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ آزادی کے 57 سال بعد یہ احساس جڑیں پکڑ رہا ہے کہ ہمارے تنازعات سے دوسرے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ آزادی کی نعمت کے بعد برصغیر کے عوام کو بے روزگاری مہنگائی اور عدم تحفظ کے علاوہ کیا ملا ہے؟ اس ساری گفتگو میں اشارتاً بھی کسی ہندوستانی نے جنگوں پر اظہار افسوس یا کشمیر کے مسئلہ پر بنیادی اسباب پر یا کشمیریوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا ذکر اور کشمیریوں سے کسی ہمدردی کا اظہار نہ کیا۔ بھارتی عوام کو گذشتہ ستاون برسوں سے ان کی سرکار جو کچھ بتا رہی ہے اس کے نتیجہ میں ان کا نکتہ نظر مخصوص زاویہ رکھتا ہے۔ بھارتی عوام کو کشمیر کی آئینی حیثیت تو باور کرا دی گئی ہے۔ تقسیم کے ادھورے ایجنڈے کی ان کو خبر ہی نہیں۔ ہم نے ملنے والے گنتی کے چند افراد کو مسئلہ کشمیر کے درست پس منظر سے آگاہ کرنے کی کوشش تو ضرور کی لیکن اس طرح انفرادی کوششوں سے پوری بھارتی رائے عامہ تو تبدیل نہیں ہو سکتی۔ بہرحال اپنا فرض ہم نے ادا کرنا تھا سو کر دیا۔

کھانے کے بعد پھر بسوں کا سفر شروع ہوا۔ یہ سفر کرنال کیلئے تھے۔ جہاں رات کا

ڈنر ایک فور سٹار ہوٹل میں تھا۔ کرنال ریاست ہریانہ کے بڑے شہروں میں سے ایک اور اتر پردیش کی سرحد پر ہے۔ 1971ء پنجاب سے الگ ہونے کے بعد ہریانہ نے کافی ترقی کی ہے۔ زبان کی بنیاد پر ہریانہ کے عوام نے خود کو پنجاب سے الگ تشخص دینے کیلئے تحریک شروع کی بالآخر کامیاب ہو گئے۔ اس تحریک کی کامیابی میں موجودہ چیف منسٹر چوٹالہ جی کے والد دیوی لال کا اہم کردار تھا۔ دیوی لال بذات خود بھارت کی مرکزی سیاست میں ایک اہم کردار رہے ہیں۔ ہریانہ ٹورازم کی طرف سے فراہم کردہ لٹریچر کے مطابق ہریانہ 44212 مربع کلومیٹر رقبہ اور دو کروڑ کے قریب آبادی رکھتا ہے۔ اس کے 4 ڈویژن 19 اضلاع، 67 تحصیلیں اور 6756 دیہات ہیں۔ ریاست ہریانہ میں تین ہزار ہائی سکول، تیرہ سو کالجز اور پانچ یونیورسٹیاں ہیں۔ سرسہ، حصار، ہانسی، بھوانی، پلی، انبالہ کرنال، پانی پت، روہتک جیسے قدیم شہر اسی ریاست میں ہیں۔ ہریانہ کے مشرق میں اتر پردیش، مغرب میں پنجاب، جنوب میں راجھستان اور شمال میں ہماچل پردیش ہے۔

پاکستان کے پہلے وزیراعظم اور قائداعظم کے دست راست خان لیاقت علی خان کرنال میں پیدا ہوئے تھے۔ کرنال کا ذکر سنتے ہی ہمارا ذہن لیاقت علی خان اور تحریک پاکستان میں ان کے نمایاں کردار کی طرف چلا جاتا ہے۔ ہم کرنال میں ہوٹل میں پہنچے تو رات ہو چکی تھی۔ موسیقی کا پروگرام یہاں بھی جاری تھا اور غزلیں چل رہی تھیں۔ کچھ مقامی گائیک اردو غزلوں پر گلا صاف کر رہے تھے۔ ہمارے پہنچنے پر باضابطہ کارروائی شروع ہوئی۔ پاکستانی شاعروں کا کلام پیش کیا گیا۔ اس پروگرام میں ہمارے ایک فنکار استاد ریاض حسین خان نے بھی اُردو اور پنجابی کلام پیش کیا۔ یہ استاد شام چوراسی گھرانے کے ہیں۔ اس لئے ان کا انداز کلاسیکی ہے۔ ان کے بعد ہمارے لاہور کے ایک آرٹسٹ بلبلہ صاحب پیش ہوئے۔ میں نے اتفاق سے انہیں پہلی بار سنا۔ یہ ایک نان سٹاپ قسم کی پیروڈی/کامیڈی تھی۔ بلبلہ صاحب نے یقیناً کافی محنت کر کے یہ گیت یا نظم ازبر کی ہوگی۔ ان کی ادائیگی میں تسلسل اور حیرت انگیز روانی تھی۔ موسیقی کے پروگرام کے دوران جام کھنکتے رہے اور جو اس نعمت سے محروم تھے وہ کولا یا پانی پر گزارا کرتے رہے۔ گیارہ بجے کھانے کا دور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

شروع ہوا۔ سخی شہباز قلندر کی دھن پر جب دھمال پڑا تو چند پاکستانی اس دھمال میں شریک ہو گئے اور شراب تو اپنا رنگ دکھا چکی تھی چنانچہ بہت سے احباب می رقصم .... دُنیا و مافیہا سے بے خبر دھمال میں ڈوب گئے۔ ان کے چہرے سرخ ہو گئے۔ سانس اکھڑ گئے۔

ساڑھے بارہ بجے واپسی کا طبل بجا۔ واپس کروک شیترا میں اپنی قیام گاہ کی طرح رُخ ہوا۔ پاکستانی وفد تین مختلف مقامات پر ٹھہرایا گیا تھا۔ ہمارا گروپ جس میں کپل (جوڑے) اور فنکار شامل تھے، نیل کنٹھ یاتری نواس میں مقیم تھا۔ اس میں صحافی بھی موجود تھے۔ دوسرا گروپ یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس میں اور تیسرا گروپ ہوسٹل میں تھا جو گیسٹ ہاؤس کے قریب ہی ہے۔ رات ایک بجے واپسی شروع ہوئی۔ راستے میں کئی لطیفے ہوئے۔ ایک مستقل فیچر یہ تھا کہ ہر سفر شروع ہونے سے پہلے مہمانوں کی گنتی شروع کی جاتی اور کمی بیشی پر نئی پریشانی پیدا ہو جاتی۔ اگر کسی ایک بس کا مسافر کسی دوسری بس میں بیٹھ جاتا تو سیکورٹی والے اس وقت تک ناچتے پھرتے جب تک وہ واپس لا کر اپنی جگہ پر نہ بٹھا دیا جاتا۔ یوں گاڑیاں خوامخواہ کھڑی رہتیں۔ سیکورٹی کے پانچ چھ آدمیوں کی یہی ڈیوٹی تھی لیکن لگتا ہے ان کی کوارڈی نیشن کچھ زیادہ ہی غیر موثر تھی۔ نہ تو وہ ایک دوسرے کی بات مانتے تھے اور نہ اپنی عقل سے کام لیتے تھے۔ سب اپنے اپنے باس کے احکامات کی تعمیل میں مصروف رہتے۔ اس اطاعت شعاری میں مہمانوں کو بلاوجہ انتظار کی اذیت برداشت کرنا پڑتی تھی لیکن انہیں اس بات کی کیا پرواہ تھی۔ لگتا تھا کہ وہ مختلف ایجنسیوں کے اہلکار ہیں اور اپنی اپنی ایجنسی کی کارکردگی قابل تعریف بنانے کیلئے ضرورت سے زیادہ رخنہ اندازی کر رہے تھے۔ بہرحال کرنال سے اسی طرح کے ایک بے ہنگم آغاز کے بعد رات گئے کروک شیترا پہنچے۔ بستر پہ پہنچتے ہی نیند نے دبوچ لیا۔

اتوار...... 12 دسمبر 2004ء صبح کے معمولات سے فارغ ہوئے۔ پرسکون ماحول، جگجیت کی غزلوں سے گونج رہا تھا۔ پتہ چلا نیل کنٹھ کے لان میں کوئی پروگرام ہے۔ تیاری کے بعد نیچے آئے تو باقی دو مقامات سے بھی اپنے ساتھی اور بڑی تعداد میں مقامی مہمان

ناشتہ صاف کرنے میں مصروف تھے۔ ہم نے بھی ناشتہ کیا اور باہر لان میں آ بیٹھے جہاں دھوپ میں کرسیاں لگا دی گئی تھیں۔ ساتھیوں سے پوچھا کہ یہ کیا ہے تو کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ اس بات کا خاص اہتمام کیا جا رہا تھا کہ مہمانوں کو اگلے پروگرام کا قبل از وقت کچھ علم نہ ہو سکے۔ یہ سرپرائز تھا یا کوئی سرکاری حکمت عملی۔ اپنی سمجھ سے باہر تھا۔ یونیورسٹی کے ایک شعبہ کے سربراہ سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ چندی گڑھ میں صحافیوں کی ایک انجمن کی طرف پاکستانی وفد کے اعزاز میں استقبالیہ ہے۔ اس میں تقریریں ہوں گی اور تحائف مہمانوں کو دیئے جائیں گے۔ یونیورسٹی کے یہ استاد محترم ایک سردار صاحب تھے۔ ان سے پوچھا کہ پروگرام سے ہمیں بے خبر رکھنے میں کیا مصلحت ہے؟ سردار جی ہنسے اور کہنے لگے آپس کی بات ہے خود مجھے بھی تھوڑی دیر پہلے ہی اس پروگرام کا علم ہوا ہے۔ مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا اور میں بے اختیار مسکرا اٹھا۔ پوچھنے لگے کیا بات ہے۔ آپ کیوں ہنسے۔ میں نے ٹالنے کی کوشش کی تو بضد ہوئے اور بولے جو بھی بات آپ کے ذہن میں آئی ہے مجھے ضرور بتائیں وہ تاڑ گئے۔ انہوں نے کہا یقیناً یہ کوئی لطیفہ ہوگا اور سکھوں کے بارے میں ہوگا۔ میں نے کہا یہاں تک تو ٹھیک ہے لیکن میں لطیفہ نہیں سناؤں گا۔ سنایا تو آپ کو یقیناً بُرا لگے گا۔ ان کا اصرار تھا کہ نہیں ہم لوگ کھلے دل کے مالک ہیں۔ برا نہیں مناتے۔ آپ سنائیں تو سہی۔ مجھے مجبوراً لطیفہ سنانا پڑا لیکن میں نے تمہید میں بتایا کہ یہ جگجیت اپنے ایک پروگرام میں سنا چکا ہے۔ سکھ فیملی کی ایک نو بیاہتا دلہن نے اپنی ساس سے پوچھا اماں آٹھ دن ہو گئے ہیں مجھے پتہ نہیں چل سکا کہ میرا شوہر کون ہے۔ ساس ہنس کر بولی۔ مجھے آج تک نہیں پتہ چلا تم ابھی سے پریشان ہو گئی۔ یہ سن کر سردار جی بہت دیر تک ہنستے رہے۔ اور کہنے لگے مجھے معلوم ہے کہ پاکستان میں سکھوں کے بارے میں بہت سے لطیفے مشہور ہیں۔ آپ کو جتنے معلوم ہیں مجھے ضرور سنایئے۔ میں نے کہا جب آپ لاہور آئیں گے تو آپ کو ایسے لوگوں سے ملا دوں گا جنہیں سکھوں کے بارے میں بے شمار لطیفے یاد ہیں۔ ان میں ہمارے ایک سابق صدر بھی شامل ہیں۔

یہ گپ شپ جاری تھی کہ تقریب کا باقاعدہ آغاز ہو گیا۔ چندی گڑھ کی صحافیوں کی تنظیم کے صدر اور دو اخبارات کے مالک و مدیر کا دعویٰ تھا کہ ان کا ایک اخبار ہند سماچار

www.iqbalkalmati.blogspot.com

20لاکھ کی تعداد میں چھپتا ہے۔اس موقع پر اخبارات اور ٹی وی چینلز کے نمائندے بڑی تعداد میں موجود تھے۔ان کی ظاہری حالت اس بات کی غماض تھی کہ یہ سادگی نہیں غربت کا شکار ہیں۔ان میں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں شامل تھے۔تقاریر میں دوستی کی اہمیت پر زور دیا گیا۔تجارت اور میل ملاپ کے فوائد گنوائے گئے۔ ماضی کو بھولنے پر زور دیا گیا۔اگر کسی بات پر زور نہیں دیا گیا یا جسے نظرانداز کیا گیا تو وہ مسئلہ کشمیر تھا حالانکہ پاکستان اور بھارت کے درمیان یہی بنیادی تنازعہ ہے۔ یہاں بھی فخرزمان صاحب اور چند سرکردہ افراد کو تحائف سے نوازا گیا۔باقی سب کو مومنٹو پر ٹرخا دیا گیا۔اگلا پروگرام کیا تھا؟کسی کو معلوم نہیں تھا۔بس بسوں میں بیٹھنے کا حکم ہوا۔جب بسیں روانہ ہوگئیں تو پتہ چلا کہ ان کی منزل انبالہ ہے۔انبالہ،کورک شیترا سے تقریباً25 کلومیٹر دور ہے۔ڈیڑھ بجے انبالہ ریلوے اسٹیشن کے سامنے پہنچے تو وہاں گاڑیاں رک گئیں۔ہم سمجھے ٹریفک کا کوئی مسئلہ ہے لیکن تھوڑی دیر بعد لاؤڈ سپیکر پر تقریروں کی آوازیں سنائی دیں۔اب معلوم ہوا کہ باہر کوئی استقبالیہ کیمپ لگا ہوا ہے۔پاک بھارت دوستی کے نعروں کے ساتھ استقبال کیا جارہا تھا لیکن وفد کے ارکان کو باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی۔سیکورٹی کا بہانہ بنایا گیا۔جبکہ شہر کے لوگوں نے خاصہ انتظام کیا ہوا تھا۔نعروں کی گونج اور پھولوں کی بوچھاڑ میں قافلہ آگے بڑھا۔مجبوراً ہم بسوں میں صرف ہاتھ ہلا ہلا کر ان کے جذبات کا جواب دیتے رہے۔یہاں سے چند قدم کے فاصلہ پر گورنمنٹ کالج میں استقبالیہ تھا۔وہاں مہمانوں کے استقبال کا شاندار انتظام تھا۔ہر مہمان کے گلے میں گیندے کے ہار اور ہاتھ میں پلاسٹک میں پیک گلاب دیا گیا۔یہ ایک پرانا کالج ہے۔اس کی عمارت آزادی سے پہلے کے طرز تعمیر کا نمونہ تھی۔اس میں کوئی اضافہ نظر نہ آیا۔البتہ مہاتما گاندھی کا ایک مجسمہ لان میں نصب تھا۔کالج کے بینڈ نے استقبالیہ دھنیں بجائیں۔لان میں چائے پکوڑے اور برفی لذت کام ودھن کیلئے موجود تھی۔تواضع کے بعد آڈیٹوریم میں کلچرل پروگرام پیش کیا جانا تھا۔چنانچہ وہاں داخل ہوکر سب اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔کالج کا تفصیلی تعارف کرایا گیا جن مضامین میں تعلیم دی جارہی ہے۔ان کا تذکرہ ہوا۔پرنسپل نے پاکستانی طلبہ کو تعلیم و قیام کی سہولتیں مفت پیش کرنے کا اعلان کیا

حالانکہ دو آزاد ملکوں کے درمیان اس طرح کے کام مرکزی حکومتوں کی مرضی کے بغیر نہیں ہوتے۔یہاں تقاریر میں بہت سی جذباتی باتیں بھی کی گئیں۔جن کی وضاحت فخرزمان صاحب نے موقع پر ہی کردی۔یہاں اساتذہ میں سکھوں کی تعداد کافی دکھائی دی۔چونکہ سکھ بڑی تعداد میں تھے۔اس لئے جذباتی ماحول طاری رہا۔لان میں گاندھی جی کے مجسمہ پر پاکستانی وفد کے ارکان کی اکثریت جمع ہوگئی۔انہوں نے اپنے گلے سے ہار اُتار کر گاندھی جی کے مجسمہ کے گلے میں ڈال دیئے۔یہاں بھی مقامی لوگوں سے تبادلہ خیال ہوتا رہا۔

دوپہر کے اڑھائی بج رہے تھے۔کھانے کا اہتمام ہو چکا تھا۔کھانا کھاتے کھاتے ساڑھے تین بج گئے۔پانچ بجے کے قریب واپسی کا سفر شروع ہوا۔پھر وہی گنتی اور بدنظمی دیکھنے میں آئی۔اب کہاں جانا ہے کسی کو پتہ نہیں تھا۔انبالہ سے واپسی پر کورک شیترا کے دروازے پر واقع ریسٹورانٹ میں رات کے کھانے کا اہتمام تھا۔پہلے مشروبات اور پھر کھانا کھانے کے دوران مقامی افراد سے مختلف موضوعات پر بات چیت جاری رہی۔ہندوؤں کی سوچ اور سکھوں کی سوچ میں نمایاں فرق ہے۔ہندو بالادستی اور سکھ برابری کی سوچ رکھتے ہیں۔کھانے سے فارغ ہونے پر ہمیں سیدھا کورک شیترا یونیورسٹی سپورٹس گراؤنڈ میں پہنچا دیا گیا۔یہاں چیف منسٹر ہریانہ نے ایوارڈز تقسیم کرنا تھا۔پورا کورک شیترا جمع تھا۔کھلی جگہ پر ایک بہت بڑا سٹیج تھا۔اس پر ڈانس پارٹی اپنے جوہر دکھا رہی تھی۔اگرچہ بے پناہ ہجوم تھا لیکن پاکستانی وفد کیلئے خصوصی انتظامات تھے۔پائپ لگا کر گزرنے کا راستہ بنایا گیا تھا۔دس منٹ میں ہم لوگ اپنی اپنی نشستوں پہ پہنچ گئے تھے۔آگے VIP کی قطار تھی۔پیچھے پٹڑی پر کیمرہ ٹرالی دائیں بائیں دھکیلی جارہی تھی اور پٹڑی کے پیچھے ہماری نشستیں تھیں۔دائیں بائیں پائیوں کی اونچی گھوڑیاں بنا کر لائٹیں لگائی گئی تھیں۔ایک کرین پر کیمرہ ریموٹ کنٹرول سے مسلسل متحرک تھا۔اسٹیج پر ایک سردار جی کیمرہ اٹھائے شہد کی مکھی کی طرح دائیں بائیں،آگے پیچھے اوپر نیچے مصروف عمل تھے کچھ فکس کیمرے بھی مختلف زاویوں پر نصب تھے۔مہمانوں میں چیف منسٹر اور ہریانہ حکومت کے سرکردہ لوگ بیٹھے تھے۔تقریب کا آغاز ہوا کچھ مشہور بھارتی سنگروں نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔اس دوران ہمارے سیدھے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہاتھ لگا لائٹوں کا سٹینڈ جھکا اور زمین بوس ہو گیا۔ کچھ لائٹیں ٹوٹ گئیں۔ متعلقہ لوگ فوراً لپکے اور صورت حال سنبھال لی گئی ورنہ کافی نقصان ہو سکتا تھا۔ سردی میں باہر کھلے میدان میں رات گیارہ بجے بیٹھنا آ بیل مجھے مار والی بات تھی۔ بیگم نے اپنی گرم چادر مجھے دے دی۔ اس سے میں نے اپنا سر ڈھانپ لیا۔ موسم کے مطابق ہمارے پاس گرم کپڑے، مفلر کوٹ سوئیٹر وغیرہ تو تھے لیکن وہ ہوٹل کے کمرے میں تھے۔ ان کا استعمال تو تب ہو سکتا تھا جب پروگرام کے بارے میں تفصیل سے آگاہی ہو۔ ہمیں تو ناشتہ کے بعد کسی شیڈول سے آگاہ کئے بغیر بسوں کی طرف ہانک دیا گیا تھا۔ کہاں جانا ہے کس وقت تک رہنا ہے اگر بتا دیا جاتا تو مناسب لباس ساتھ رکھتے۔ رات کے پروگرام سے پہلے اگر قیام گاہ پر جانے دیا جاتا تو بھی کچھ ممکن تھا لیکن یہاں اس طرح کی پابندیاں کیوں تھیں ان کا علم میزبانوں کو تھا، ہمارے وفد کے سرکردہ احباب کو بھی کچھ علم نہ تھا۔ ہمارے لئے تو معمہ تھا۔ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔

یونیورسٹی گراؤنڈ کی اس تقریب میں ایک خصوصی ایوارڈ اور گیارہ لاکھ روپے (پاکستانی پندرہ لاکھ چالیس ہزار روپے) فخر زمان صاحب کیلئے اناؤنس ہوئے۔ پاکستانی فنکاروں کیلئے بھی تین لاکھ روپے کا اعلان کیا گیا۔ فخر زمان صاحب نے پنجابی زبان کے فروغ کیلئے یہ پیسہ ہریانہ حکومت کو واپس کرنا چاہا تو اوم پرکاش چوٹالہ نے اصرار کیا کہ پنجابی زبان کیلئے فخر زمان صاحب کی خدمات پوری دُنیا میں ہیں۔ اس لئے یہ انعام ان کی ذات کو دیا جا رہا ہے۔ ہریانہ میں پنجابی زبان کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جا چکا ہے۔ اس لئے یہاں ہم علیحدہ ادارے بنائیں گے اور پنجابی کے فروغ کیلئے کام کریں گے۔ اوم پرکاش چوٹالہ صاحب کے اعلان کے بعد ہریانہ کے نامور لوگوں کو ایوارڈز دیئے گئے۔ ان میں سنجے دت اور سنیل دت شامل تھے۔ ایوارڈز کے بعد پاکستانی فنکاروں نے اپنے فن کا مظاہرہ کرنا تھا لیکن یہ اسٹیج سنجیدہ موسیقی کا نہیں تھا۔ پھر بھی استاد حامد علی خان، ثریا خانم اور شوکت علی نے اپنا رنگ جمایا۔ پاکستانی فنکاروں کیلئے اگر علیحدہ سے ایک پروگرام ہوتا تو زیادہ بہتر تھا۔ موسم اپنا رنگ دکھا رہا تھا۔ بیٹھنا مشکل ہو گیا تو میں بیگم کے ساتھ واپس آ کر بس میں بیٹھ گیا۔ یہاں سے ایک بجے کے بعد واپسی ہوئی۔ تقریباً دو بجے اپنے بستر پر تھے۔

13 دسمبر 2004ء صبح نو بجے ہم لوگ ناشتہ کیلئے ریسٹورنٹ میں تھے۔ ناشتہ حسب معمول بہت اچھا تھا۔ دس بجے کے بعد بسیں آ گئیں۔ گیارہ بجے روانگی ہوئی آج کانفرنس کا آخری دن ہے۔ کانفرنس کے کل کے سیشن کے بارے میں جو رپورٹیں آج اخبارات میں شائع ہوئی ہیں وہ کافی تکلیف دہ ہیں۔ کہا گیا ہے کہ پاکستانی ہر شرط مان کر ہم سے دوستی کرنا چاہتے ہیں۔ کشمیر کے مسئلہ پر بھی پاکستانیوں کا اصرار ختم ہو چکا ہے۔ آنے والے دنوں میں حالات مزید بھارت کیلئے بہتر ہو جائیں گے۔ گذشتہ دو دنوں کے اجلاسوں سے پاکستانی وفود کو دور رکھا گیا تھا۔ یہ سارا پروگرام بہت سوچ سمجھ کر بنایا گیا ہے۔ دعوت نامہ میں **Study Destinations** چنڈی گڑھ، انبالہ، جمنا نگر، کیتھل، پانی پت، کمال، کڑگاؤں اور حصار تھیں جبکہ پروگرام 5 دن کا ہے۔ گویا یہ بات اُنہوں نے پہلے سے طے کر رکھی تھی کہ پاکستانی وفد کو پہلے اور آخری رسمی سیشن میں بلانا ہے۔ آخری سیشن میں مشترکہ کلچرل شو ہونا تھا۔ دراصل پہلے ابتدائی اجلاس میں اوم پرکاش جی نے اپنی تقریر کے اختتام پر ایک افسوسناک خبر کہ سابق وزیر اعظم نرسیما راؤ اب ہمارے درمیان موجود نہیں رہے۔ ان کے سوگ اور احترام میں پورے حال نے کھڑے ہو کر دو منٹ کی خاموشی اختیار کی۔ اس موقع پر ہم نے سنا کہ تمام پروگرام منسوخ کر دیئے گئے لیکن اگلے دن پتہ چلا کہ نرسیما راؤ بیمار ضرور ہیں مگر ان کا دیہانت نہیں ہوا۔ ویسے ہمارے چیئرمین صاحب سمیت سب لوگ مکمل اندھیرے میں تھے۔ کسی کو کچھ معلوم نہ تھا۔ کھانا اور بس کا سفر، استقبال اور کلچرل شو بس یہی کچھ اس پروگرام کا حاصل تھا۔ لیکن جب یہ پتہ چلا کہ بھارت کی دوسری ریاستوں سے آئے وفود نے اس انٹرنیشنل سیمینار کا استعمال کرتے ہوئے اپنا رٹا رٹایا موقف دھرایا ہے تو بہت افسوس ہوا۔ انہیں پورا حق تھا کہ وہ اپنا موقف بیان کرتے لیکن اس کیلئے ہمیں سیمینار سے کیوں دور رکھا گیا۔ یونیورسٹی کے ایک استاد سے جب ہم نے اس حوالے سے بات کرنا چاہی تو اُنہوں نے کمال سادگی سے فرمایا۔ اچھا آپ لوگوں کو اس میں نہیں بلایا گیا؟ ہم تو سمجھ رہے تھے کہ آپ کی دلچسپی شائد دوسری چیزوں میں ہے۔ 13 تاریخ کا دن بھی اسی طرح ہمیں گھمانے پھرانے میں ضائع کیا گیا۔ شام یونیورسٹی آڈیٹوریم میں مشترکہ کلچرل شو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تھا۔اس میں پہنچے تو بھارتی سنگیت کا پروگرام جاری تھا۔بعض گائیک اچھے تھے۔پھر پاکستانی فن کاروں نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔افضال شاہد نے کمپیئرنگ کی یہاں ان کا نام جس طرح لیا جاتا رہا وہ خوب تھا۔اکھجال تھاہد۔

پاکستانی فن کاروں کے بعد بھارتی کلچر کا مظاہرہ دیکھنے کو ملا۔پہلے تو روایتی لوک گیت ہریانہ اور راجستھان کے پیش کئے گئے۔اس کے بعد کالج کے لڑکے لڑکیوں نے ناچ گانا شروع کیا۔جدید منی سکرٹ یا پھر جین اور معمولی شرٹ میں ملبوس لڑکیوں نے بھارت کے مستقبل کی ثقافت کے بارے میں واضح منظر پیش کر دیا۔رنگا رنگ پروگرام کے آخر میں مختلف ریاستوں کا ایک ثقافتی کلچر فلمی گیتوں کی شکل میں پیش کیا گیا۔اس میں کشمیر کا ایک مشہور گیت ''کھنکھرو'' بھی پیش کیا گیا۔اس گیت کے بول خود کشمیر کے لوگوں کو بھی پسند نہیں ہیں۔بہر حال گیت کے اختتام پر بھارتی پرچم اور ہم ایک ہیں کی رٹ سنائی گئی۔اس پروگرام کے پس منظر میں اکھنڈ بھارت کا پیغام دیا گیا ہے۔رات کے بارہ بج گئے تھے۔واپسی کی تیاری شروع ہوئی۔

آڈیٹوریم سے ہوٹل جاتے ہوئے اعلان ہوا کہ صبح ایک بس دہلی جائے گی اور ایک واہگہ جو لوگ واہگہ جانا چاہتے ہیں صبح سات بجے تیار ہو جائیں۔ابھی 12 بجے رات ہم پہلے کرنال جائیں گے وہاں کھانا کھایا جائے گا اور پھر قیام گاہوں کا رخ کیا جائے گا۔کرنال وہاں سے 40 کلومیٹر دور ہے۔ہم نے سخت احتجاج کیا کہ جب پچھلے تین گھنٹے سے ہم یہاں کلچرل شو میں موجود ہیں تو کھانا یہاں کیوں نہیں منگوا لیا گیا۔اب ہم کھانے کے بغیر ہی سو جائیں گے۔صبح سات بجے واپسی ہے۔غرض ہم اپنے ہوٹل میں اُتر گئے۔یہ ہوٹل سرکاری ہے اس لئے وہاں چوکیدار کے سوا کوئی نہ تھا۔کچن وغیرہ سب بند تھا۔قریب و جوار میں بازار بھی کوئی نہیں اس لئے بھوکے ہی سونا پڑا۔صبح پانچ بجے آنکھ کھل گئی۔نماز فجر کا وقت تھا۔نماز پڑھ کر تیاری شروع کر دی۔چھ بجے دروازے پر دستک ہوئی۔پتہ چلا پروگرام کینسل ہو گیا ہے۔اب رات کو جائیں گے۔آج کا ناشتہ بھی کینسل ہو گیا ہے۔کاؤنٹر پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ جو لوگ کرنال کھانے کیلئے گئے تھے وہ صبح ساڑھے چار بجے واپس آئے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد ہمارے اردگرد رہنے والے مختلف محکموں کے چار افراد جمع ہو گئے۔ ان میں سے دو سرکاری ملازموں کو پروگرام کی تبدیلی کا علم نہیں تھا۔ادھر ہمارے فنکار تیار بیٹھے پیچ و تاب کھا رہے تھے۔لاہور میں ان کے کئی پروگرام طے تھے۔اس بحث و تمحیص میں نو بج گئے۔تب وہ ٹھنڈے ہوئے کہ اب واپسی ممکن نہیں۔بارڈر پر 2 بجے سے پہلے نہیں پہنچ سکتے۔جس بندے نے ناشتہ کینسل کروایا تھا اس کا پتہ نہ چل سکا۔بڑی مشکل سے دس بجے ناشتہ تیار ہوا۔ناشتہ سے فارغ ہونے کے بعد سب لوگ لان میں جمع ہو گئے۔فیصلہ ہوا کہ آج چنڈی گڑھ کا سفر کیا جائے گا۔چنانچہ سامان بسوں میں لوڈ کرا دیا گیا۔چنڈی گڑھ کا سفر بھی محض ہاتھ لگا کر آنے والی بات تھی۔سیکٹر 17 میں دو گھنٹے گزارے۔اڑھائی گھنٹے جانے کے اور اڑھائی گھنٹے آنے میں گزار کر ہم رات کو واپس کورک شیترا پہنچے۔یہاں یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی طرف سے الوداعی ڈنر تھا۔پہلے چائے، سوپ وغیرہ سے تواضع کی گئی پھر کھانا اور الوداعی ملاقات ہوئی۔

رات گیارہ بجے بسیں واہگہ کیلئے روانہ ہوئیں۔دہلی جانے والی بس دہلی کو روانہ ہو چکی تھی۔فخر زمان صاحب اس قافلے کے ساتھ دہلی چلے گئے تھے۔ہمارے دو بندے غائب تھے۔بار بار فہرستیں چیک ہو رہی تھیں۔بہت بعد میں پتہ چلا کہ تاخیر کا سبب ان غائب افراد کی تلاش ہے۔کچھ دیر کے بعد بسیں روانہ ہو گئیں۔تیس پینتیس کلومیٹر فاصلہ طے کرنے کے بعد بسوں کو واپس یونیورسٹی لایا گیا۔اب دو غائب افراد حاضر تھے۔وہ بسوں میں سوار ہوئے اور قافلہ پھر سے روانہ ہوا۔

لدھیانہ کے قریب ایک ڈھابے پر بسیں رکیں۔چائے کا ایک کپ پیا۔پروگرام یہ تھا کہ صبح صبح دربار صاحب پہنچ کر ناشتہ کسی اچھے سے ہوٹل میں کریں گے لیکن اب یہ ممکن نہیں تھا۔سڑک پر گہری دھند اور سردی تھی۔ہمارے آگے اور پیچھے پولیس کی دو دو جیپیں چل رہی تھیں۔دھند میں رفتار بہت کم تھی۔ٹریفک بھی بہت کم تھی۔میرے ساتھ منیر نیازی بیٹھے تھے اور اپنا شغل جاری رکھے ہوئے تھے۔اس ترنگ میں انہوں نے وہ سب کچھ بتا دیا جو نہیں بتانا چاہیے تھا۔اس عمر میں ان سے یہ مشقت لینا کچھ اچھا نہیں لگا۔اس سفر میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہمارے ساتھ فنکاروں کے علاوہ ادیب، کالم نگار، شاعر اور اساتذہ شریک تھے۔

بسیں امرتسر بائی پاس سے واہگہ کیلئے مڑ گئیں۔ غالباً دو افراد کی گمشدگی وجہ سے بسوں کو واپس لے جانے کے عمل کا بدلہ لیا گیا تھا۔ صبح چھ بجے اٹاری پہنچا کر بسیں پارکنگ میں کھڑی کر دی گئی تھیں۔ امیگریشن آفس اور تمام ڈھابے بند تھے۔ کچھ وقت ادھر ادھر گھوم پھر کر گزارا۔ 8 بجے کے قریب امیگریشن آفس کھل گیا۔ یہاں واش روم اچھا تھا۔ دانتوں کو برش کرنے اور پھر شیو کرنے میں کچھ وقت گزارا۔ ابھی مزید کچھ وقت ضائع کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے کہ ہمارے ہم سفر تجمل گورمانی صاحب نے امرتسر گھومنے کی دعوت دی۔ ان کا کوئی دوست یہاں پولیس چوکی کا انچارج ہے۔ اس نے اپنی گاڑی اور ڈرائیور دیا کہ یہ آپ کو دربار صاحب کے درشن کرا لائے گا۔ ہمیں کچھ چیزیں بھی لینا تھیں۔ بیگم نے گولڈن ٹمپل نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے امرتسر کی طرف روانہ ہو گئے۔ پہلے آفیسرز کالونی میں پولیس آفیسر کے گھر گئے۔ گاڑی وہاں چھوڑ دی۔ دوسری گاڑی لیکر نکلے۔ ڈرائیور پولیس کانسٹیبل کی وردی میں تھا۔ یہاں انکشاف ہوا کہ یہ سردار صاحب دراصل ہندو ہیں۔ دہشت گردوں کے خوف سے سکھ بنے ہوئے ہیں۔ گھر میں بیگم صاحبہ سے ملاقات ہوئی۔ وہ کسی شادی میں شرکت کیلئے جا رہی تھی۔ ضد کر کے چائے بسکٹ کھلائے۔

امرتسر میں صبح کا وقت تھا۔ زبردست ٹریفک تھی۔ گیارہ بجے کے قریب گولڈن ٹمپل پہنچے۔ رش کچھ زیادہ نہیں تھا۔ ایک چکر لگایا اور باہر آ گئے۔ بچوں کیلئے کچھ مٹھائی، اناس اور ناریل لیکر واپس بارڈر پر آ گئے۔ یہاں انچارج چوکی کو ''اے جے کے لندن'' پیش کی۔ امیگریشن، کسٹمز وغیرہ کے مراحل طے کرتے ہوئے انچارج کسٹمز کے پاس پہنچے۔ شوکت علی اور ثریا خانم وغیرہ بھی وہاں آ گئے۔ بھارتی پولیس، امیگریشن اور کسٹمز کے عملہ کی رہائش پر یہاں بھی موسیقی کی ایک محفل جمی۔ ابھی محفل جاری تھی کہ افضال شاہد ہریانہ کے ایک وزیر کے ساتھ فیروزپور سے واپس پہنچ گئے۔ اب سب لوگ سرحد پار کر کے واہگہ میں داخل ہو گئے۔ ہریانہ کا سفر انجام بخیر ہوا۔

[illegible] / فروری 2005ء

تین دن چوٹالہ کے ساتھ

ہریانہ کے وزیر اعلیٰ اوم پرکاش چوٹالہ، عالمی پنجابی کانگریس کے چیئرمین جناب فخر زمان کی دعوت پر 10 ستمبر کو لاہور اور پنجاب کے دیگر شہروں کے تین روزہ دورہ پر تشریف لائے۔ راقم بھی میزبان ٹیم کا رکن تھا۔ فخر زمان نے پندرہ روز پہلے ایک پریس کانفرنس میں شری چوٹالہ کی آمد اور پنجاب میں ان کے پروگرام کی تفصیلات ذرائع ابلاغ کو مہیا کیں۔ ذرائع ابلاغ نے اس پریس کانفرنس کو نمایاں انداز میں شائع اور نشر کیا۔ فخر زمان شری چوٹالہ کے مجوزہ دورے کو حتمی شکل دینے میں مصروف ہو گئے۔ انہوں نے دن رات خوب محنت کی۔ ان کی محنت کے نتیجہ میں عالمی پنجابی کانگریس اب محض تقریریں کرنے کا فورم نہیں رہا۔ فخر زمان نے اسے فعال بناتے ہوئے ایک موثر ادارے میں تبدیل کر دیا ہے۔ سرحد کے دنوں طرف اور دُنیا بھر میں پنجابی بولنے والے اب اس ادارے کی سرگرمیوں میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ فخر زمان نے پاکستان میں اس تنظیم کی ممبر شپ کو خوب وسعت دی ہے۔ اٹھارہ انیس شعبے تشکیل دیکر ان کی سربراہی فعال افراد کے سپرد کی گئی ہے۔ ان کے ذمہ آنے والے پروگراموں میں بھرپور شرکت کا ٹاسک دیا گیا ہے۔

10 ستمبر کی صبح ہم لوگ اپنی اپنی سواری اور اپنے اپنے پھولوں کے ہاروں کے ساتھ دس پندرہ ''ممبران'' واہگہ پہنچ گئے۔ میرے ساتھ امتیاز راشد (جنگ) تھے۔ انہوں نے ہریانہ کے وزیر اعلیٰ کو خوش آمدید کہنے کیلئے دو بینر لکھوا لئے تھے۔ واہگہ چیک پوسٹ پر پہنچ کر یہ بینر ''نومینز لینڈ'' میں سیدھے ہاتھ پہ لگے شامیانے پر آویزاں کر دیئے گئے۔

ستمبر کا مہینہ حبس اور گرمی کا ہوتا ہے۔ چنانچہ 10 ستمبر کو یہ موسم اپنے شباب پہ تھا۔ سخت گرمی، تیز دھوپ اور شدید حبس میں پینے کیلئے پانی کا بھی انتظام نہیں تھا لیکن VIP روم میں باوردی بیرے مشروبات لئے دوڑتے پھر رہے تھے۔ AC چل رہے تھے۔ دروازے پر معزز مہمان کے انتظار میں بلٹ پروف مرسیڈیز بھارتی پرچم کے ساتھ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کھڑی تھی۔ دوسرے مہمانوں کیلئے "تین کوسٹرز" کھڑی تھیں۔ وقت نہایت سست رفتاری سے گزر رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں ناظم لاہور، میاں عامر محمود آ گئے۔ وزیر اعلیٰ پنجاب چوہدری پرویز الٰہی اسلام آباد چلے گئے تھے چنانچہ ان کی نمائندگی کیلئے دو وزیر آ گئے۔

استقبال کیلئے سب لوگوں کو لائن اپ کر دیا گیا۔ وی آئی پی رومز کی چھت پر پنجاب کی ثقافت کا مظاہرہ کیا جا رہا تھا۔ ڈھول بج رہے تھے۔ فنکار رنگ برنگے کپڑوں اور مصنوعی گھوڑوں کے ساتھ رقص میں مصروف تھے۔ ڈھول کی تال اور شہنائیاں مہمانوں کو خوش آمدید کہنے اور مسرت کے اظہار کرنے میں مصروف تھیں لیکن اس گرمی، حبس اور دھوپ میں اس خوشی کا مظاہرہ کرنے والے پنجابی طائفہ گرم چھت پر جھلس رہا تھا۔ ان کیلئے پینے کا پانی بھی نہیں تھا اور نیچے یخ بستہ وی آئی پی روم میں بیٹھے وی آئی پی اپنا میک اپ درست کر رہے تھے۔ وہ اپنی چمک دمک برقرار رکھنا چاہتے تھے کہ حکمران کلاس کا کلچر آنے والوں پر واضح ہو جائے۔ انہیں پتہ چلے کہ پاکستانی عوام کے نمائندے کیسے ہوتے ہیں۔ ان کا کروفر کیسا ہے اور شان و شوکت کسے کہتے ہیں میں ان دونوں طبقات کے امتیاز کے بارے میں سوچتا اور وی آئی پی کمروں کے اندر اور باہر کے مناظر سے "لطف اندوز" ہوتا رہا۔ ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے چیف منسٹر ہریانہ شری اوم پرکاش چوٹالہ سبز رنگ کی پگڑی باندھے، ہاتھ میں چھڑی پکڑے، بھارتی حصہ اٹاری سے نمودار ہوئے۔ نومینز لینڈ کا فاصلہ انہوں نے خاموشی کے ساتھ پیدل طے کیا۔ پاکستانی سرحد میں داخل ہوتے ہی ہمارے "پروٹوکول" والوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ لائن میں لگے لوگوں کی، تعارف کیلئے اور تصویریں بنانے والوں کی اپنے کام کیلئے بے قراریاں دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔

چوٹالہ صاحب کے ساتھ چار عدد وزیر، کچھ ارکان پارلیمنٹ، افسران اور اخبار نویس تھے لیکن ان کو کسی نے گھاس نہ ڈالی۔ چوٹالہ صاحب کو میڈیا اور VIP نے گھیر رکھا تھا۔ چوٹالہ صاحب کی آمد فخر زمان کی دعوت پر تھی چنانچہ یہ نیم سرکاری استقبال تھا۔ فخر زمان خود موجود نہیں تھے۔ دھکم پیل میں بالآخر مہمانِ خصوصی عالمی پنجابی کانگریس کے وفد کے پاس پہنچے۔ ان کے پہنچتے ہی محمود و ایاز ایک ہو گئے۔ چنانچہ انہیں فوراً یخ بستہ کمرے میں پہنچا دیا

گیا۔ یہاں مہمانوں کیلئے لذت کام و دہن کا بھرپور انتظام تھا لیکن مہمانوں کی مدارات کم اور اپنی تواضع زیادہ ہو رہی تھی۔

واہگہ سے چوٹالہ صاحب کو سیدھے فخر زمان کے گھر ان کی اہلیہ کے افسوس کیلئے جانا تھا۔ ہمیں وہاں پہلے پہنچنا تھا اس لئے ہم وہاں سے نکل پڑے جیسے ہی بی آر بی نہر کی طرف مڑنے لگے، پولیس نے روک لیا کہ یہ سڑک بند کر دی گئی ہے۔ آپ شالیمار کی طرف سے جائیں۔ ہم ادھر آ گئے۔ آگے آ کر پتہ چلا کہ سارا شہر بند اور سیل ہے۔ ہم ٹریفک جام میں پھنس گئے۔ ہمارے سامنے سے جب قافلہ گزر گیا تب آگے نکلنے کا راستہ ملا۔ دو گھنٹے کا کشٹ کاٹ کر ہم فخر زمان کے گھر پہنچے تو چوٹالہ صاحب واپسی کیلئے نکل رہے تھے۔ یہاں سے انہیں سٹیٹ گیسٹ ہاؤس جانا تھا۔ ان کے قیام کا انتظام وہاں تھا۔ لیکن پروگرام تبدیل ہو گیا اور وہ اپنے وفد کے کچھ ارکان کے ساتھ آواری میں قیام پذیر ہوئے۔ وفد میں شامل دوسرے درجہ کے لوگوں کو ہالی ڈے ان میں ٹھہرایا گیا۔

شام کو الحمرا میں "لٹریچر، کلچر اور امن" کے موضوع پر سیمینار تھا۔ ہال نمبر 2 میں اس سیمینار کیلئے حاضری مناسب تھی ورنہ عام طور پر ایسے خشک موضوع پر بہت کم لوگ آتے ہیں۔ چار بجے سیمینار شروع ہوا۔ تقریریں مختصر تھیں۔ وفد کے لوگوں نے اپنی تقریروں میں امن، دوستی اور بھائی چارے کی بات کی۔ ویزوں میں سہولت اور آمدورفت میں آسانیاں پیدا کرنے پر زور دیا۔ میل ملاپ بڑھانے کی باتیں ہوئیں۔ باہمی تجارت کے مشورے دیئے گئے۔ میرا دھیان یورپ امریکہ وغیرہ کی طرف گیا کہ وہ تاک میں ہیں۔ برصغیر کی مارکیٹ پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں ان کو موقع نہیں دینا چاہیے لیکن اس طرف کسی نے توجہ دی تو وہ ڈاکٹر نور تھے۔ وہ سکھ ہونے کے ناطے پاکستان اور بھارت میں دوستی چاہتے ہیں لیکن وہ بھی اس موضوع کو محض "ٹچ" کر کے گزر گئے۔ اصل بات جو فساد کی جڑ ہے اس پر کسی نے کھل کر بات نہ کی۔ یہ ان لوگوں کی پرانی عادت ہے۔ وہ ابھی ہندوتا اور اکھنڈ بھارت کے سحر سے نہیں نکلے۔ شائد طاقت کا نشہ ہے لیکن ہم طاقت کے استعمال اور اس کے نتائج کا مظاہرہ افغانستان اور عراق میں دیکھ ہی رہے ہیں۔ بہرحال باہمی تعلقات کا یہ ایک

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نیا دور ہے۔ 56 سال میں کئی دور آئے اور گزر گئے۔ جو دور پاکستان اور بھارت کے درمیان سے گزرا ہے اس نے اپنے نقش ثبت کئے ہیں لیکن سرکاری سطح پر باہمی قربت اور یگانگت کی فضا ابھی تک خواب ہے۔

اگر حقائق سے منہ موڑ کر اور عدل وانصاف سے بے نیاز ہو کر معاملات طے کرنے کی کوششیں جاری رہیں تو حالات مزید خراب تو ہو سکتے ہیں، ٹھیک نہیں ہو سکتے۔ یہ سب کچھ مصنوعی ہے۔ بھارتی نیتاؤں نے طاقت کا استعمال کر کے دیکھ لیا۔ ہمارا ایک بازو کاٹ دینے کے باوجود وہ ہمیں جھکانے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ اب انہوں نے پینترا بدل لیا ہے۔ وہ عوامی سطح پر میل ملاپ بڑھا کر دنیا کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ پاکستانی عوام تو بھارت کے قریب آنا چاہتے ہیں لیکن پاکستان کی حکومتیں ان کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ بھارتی "داناؤں" کا خیال ہے کہ اگر عوامی سطح پر باہمی رابطے بڑھائے جائیں تو کچھ عرصہ بعد پاکستانی رائے عامہ کشمیر کو بھولنے اور ماضی کی بھارتی زیادتیوں سے چشم پوشی پر تیار ہو جائے گی۔ لیکن وہ بھول جاتے ہیں کہ کشمیر اور بھارت کیلئے پاکستان کی پالیسی سیاست نہیں عوامی امنگوں کے مطابق ہے۔ بھارت کو اگر بڑا بھائی ہونے کا دعویٰ ہے تو وہ پاکستان کو فارسی مقولے والا برادر خورد بنانے کی خواہش ترک کر دے۔

سیمینار کے دوران پنڈت جسراج اور ان کی ستری برکھا جسراج نے اپنی گائیکی کے فن کا مظاہرہ کیا۔ پتہ چلا کہ موصوف نسبت روڈ کے رہنے والے ہیں۔ اپنی گائیکی میں انہوں نے اللہ رحمٰن رحیم میں سے اوم نکالا اور پرانی تھیوری رام اور رحیم کو ایک ثابت کرنے کی کوشش کی۔ یہ بھی ایک پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ امریکہ اور کینیڈا میں ان کے موسیقی کے سات سکول ہیں۔ وہ ان میں ذاتی طور پر موسیقی سکھانے کا کام کر رہے ہیں۔ ان کی 300 سے زائد سی ڈیز ریلیز ہو چکی ہیں لیکن پاکستان میں لوگ ان سے واقف نہیں ہیں۔

سیمینار کے آخر میں اوم پرکاش چوٹالہ نے تقریر کی۔ شری چوٹالہ صاف ستھری اُردو میں تقریر کرتے ہیں۔ یہ خوشگوار حیرت انہوں نے ہمیں چندی گڑھ میں عالمی پنجابی کانگریس کے اہتمام میں دیئے گئے ڈنر میں دی تھی۔ چوٹالہ ایک منجھے ہوئے سیاستدان ہیں۔ وہ

پانچویں بار ریاست ہریانہ کے چیف منسٹر بنے ہیں۔ سیاست انہوں نے وراثت میں پائی ہے۔ ان کے والد دیوی لال بھی ہریانہ کے وزیراعلیٰ اور بھارت کے ڈپٹی پرائم منسٹر رہ چکے ہیں۔ انہوں نے بھی بھارتی حکمت عملی کے مطابق بات کی۔ انہوں نے کہا کہ سرحدیں کھلنی چاہئیں۔ آمدورفت بڑھے گی تو سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ ہمارے وزیراعلیٰ چوہدری پرویز الٰہی اور عالمی پنجابی کانگریس کے چیئرمین فخر زمان کی انہوں نے خوب تعریف کی۔ شام سات بجے کے قریب تقریب اختتام پذیر ہوئی۔ میں الحمرا سے نکلا اور خراماں خراماں کلاسیک پہ آ گیا۔ مہمان اپنے ہوٹل چلے گئے تھے۔ اب انہیں چیف منسٹر چوہدری پرویز الٰہی کے عشائیہ میں شرکت کرنا تھی۔

گیارہ ستمبر کو صبح نو بجے آواری سے ہمارا قافلہ وزیرآباد کے گاؤں سوہدرہ کیلئے روانہ ہوا۔ سوہدرہ میں چوٹالہ جی اور ان کا وفد "بھائی کنہیہ جی" کے تین سو سالہ "بخشش دیوس" منانے کیلئے جا رہا تھا۔ بھائی کنہیا جی بکرمی تقویم کے مطابق 1705 (1648 عیسوی) میں سوہدرہ میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے سکھ دھرم میں سیواپنتھی فرقے کی بنیاد رکھی۔ ان کا اعزاز یہ ہے کہ ریڈ کراس کی طرز پر جنگ وجدل میں زخمی ہونے والوں کی مدد بلا مذہب و ملت کی۔ وہ گرو تیغ بہادر اور گرو گوبند کے پیروکار تھے۔ سکھوں اور مغلوں کی لڑائیوں کے دوران انہوں نے زخمیوں کو پانی پلانے اور مرہم پٹی کرنے کی خدمات سرانجام دیں۔ ایسا کرتے ہوئے وہ اپنے یا دشمنوں کے سپاہیوں میں کوئی امتیاز نہیں رکھتے تھے۔ سوہدرہ میں ان کے ڈیرے کا پانی تبرک اور شفا بخش قرار دیا جاتا تھا۔ وہ اپنے ڈیرے پر آنے والے لوگوں کا جسمانی علاج کرتے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے کنوئیں کا پانی پینے والا جسمانی بیماریوں سے نجات پا جاتا تھا۔ بھائی کنہیہ کا کنواں تو اب موجود نہیں ہے لیکن اس زرخیز زمین میں اب ٹیوب ویل لگا دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ایک پرانا کھنڈر نما مکان ہے جس کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہاں بھائی کنہیہ کی رہائش تھی۔ ناظم علاقہ چوہدری شوکت منظور چیمہ نے اس کھنڈر کی چھت مرمت کروا کے سفیدی کرا دی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ بھائی کنہیہ جی کو غیب سے آشیرواد 20 ستمبر 1704 کو بخشا گیا تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چنانچہ یہ دن بخشش دیوس کے طور پر سکھ اور ہندو مل کر مناتے ہیں۔اس سال 20 تاریخ کو ہریانہ میں سوہدرہ سے بھائی کنہیا جی کے ڈیرے کا پانی لوگوں میں تقسیم کیا جائے گا۔شری اوم پرکاش چوٹالہ اوران کے ساتھی بھی متبرک پانی لینے کیلئے سوہدرہ جارہے تھے۔

آواری ہوٹل سے چوٹالہ جی کا قافلہ ٹھیک دس بجے روانہ ہوا۔پہلا پڑاؤ بادشاہی مسجد اورشاہی قلعہ کے پہلو میں رنجیت سنگھ کی مڑھی تھی۔قلعہ اور مسجد کے درشن کا پروگرام کینسل ہو چکا تھا۔مڑھی میں تقریباً آدھا گھنٹہ گزرا۔میں بھی زندگی میں پہلی بار اس عمارت کے اندر گیا۔بہت اچھا انتظام ہے۔سکھوں کے زیادہ تر متبرک مقامات پاکستان میں ہیں۔اس لئے ساری دُنیا کے سکھوں کی توجہ پاکستان پر رہتی ہے۔دُنیا بھر کے سکھ عقیدت کے تحت ان مقامات کی دیکھ بھال کیلئے پیسہ مہیا کرتے رہتے ہیں چنانچہ انتظامات بھی بہت اچھے ہوتے ہیں۔مڑھی کی انتظامیہ نے ہمیں ایک کیلنڈر کا تحفہ اور سرسروں کا تبرک دیا۔یہاں سے قافلہ روانہ ہوا اور جی ٹی روڈ سے ہوتے ہوئے تقریباً 12 بجے سوہدرہ پہنچا۔قرب و جوار سے سینکڑوں دیہاتی جمع تھے۔ڈھول کی تھاپ پر کرائے کے چند لوگ رقص کناں تھے۔اسکول کے بچے مہمانوں پہ گلاب کی پتیاں نچھاور کر رہے تھے۔سوہدرہ ایک تاریخی گاؤں ہے۔سلطان محمود غزنوی کا محبوب غلام ایاز اس گاؤں کا بانی سمجھا جاتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ وہ اس مقام پر ایک ایسا شہر تعمیر کرنا چاہتا تھا جس کی فصیل کے سو دروازے ہوں۔چنانچہ اس کا نام سودرہ تجویز ہوا۔قلعہ کی بنیاد رکھی گئی۔حویلیاں تعمیر ہوئیں لیکن اس دوران لاہور کی تعمیر نو شروع ہوگئی چنانچہ سوہدرہ کی بجائے ایاز کی توجہ لاہور پر مرکوز ہوگئی اور پھر وقت نے اسے شہر سودرہ کا خواب پورا نہ کرنے دیا۔کچھ تاریخی کتابوں مین کہا گیا ہے کہ لفظ سوہدرہ اصل میں سدراہ اور ابتدائی کتب میں چندراہ ہے۔

سوہدرہ مردم خیز علاقہ ہے۔اس نے بہت سی نامور علمی وادبی ہستیوں کو جنم دیا ہے۔آجکل یہ چاول کی کاشت کا علاقہ ہے۔گاؤں کا چکر لگا کر ہمارا قافلہ ایک کھلی جگہ پر نصب شامیانوں کے سائے میں آ گیا۔میزبانوں نے ٹن کے ڈبوں میں مختلف جوس پیش کئے۔خوب پیاس لگی ہوئی تھی چنانچہ یہ جوس آب حیات محسوس ہوا۔

مہمانوں کو پانی کی زیارت یا درشن کیلئے ٹیوب ویل پر لے جایا گیا۔اسے دیکھ کر انہوں نے خوشی کے نعرے لگائے۔یہاں ایک مشک، کچھ مٹکے اور کچھ بوتلیں ہریانہ لے جانے کیلئے بھری گئیں۔خود مہمانوں نے جی بھر کر پانی پیا۔یہ پانی آنند پور سے ایک جلوس کے ساتھ ریاست کے مختلف حصوں سے گزرتا ہوا 18 ستمبر کو سرسہ میں پہنچے گا۔اسی روز وہاں بھائی کنہیہ جی کے مجسمہ کی نقاب کشائی ہوگی۔

سوہدرہ میں شری چوٹالہ جی نے اعلان کیا کہ وہ یہاں زمین خرید کر ایک سینٹر بھائی کنہیہ جی کے نام پر بنائیں گے۔یہ سارا کام فخر زمان صاحب کی نگرانی میں ہوگا۔اس متبرک جگہ پر ہر سال سکھوں کی طرح ہندوؤں کے جتھے بھی آتے جاتے رہیں گے۔بھارتی وفد کا کہنا تھا کہ اس سے ہندو مسلم اتحاد کی راہیں ہموار ہوں گی جبکہ پاکستانی دانشوروں کا کہنا ہے کہ یہ سب کچھ سوچ سمجھ کر کیا جارہا ہے۔پاکستان کی نظریاتی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کی حکمت عملی کے تحت اس جانب ایک اور پیش رفت ہے۔

یہاں سے قافلہ گوجرانوالہ کیلئے روانہ ہوا جہاں ضلع ناظم گوجرانوالہ نے کھانے کا اہتمام کیا ہوا تھا۔یہاں بعض دوست ملے جو بہت خوش تھے۔جنرل مشرف کی وردی سے ناراض یہ دوست ملکی سیاست اور قومی مفاد کو گڈمڈ کر رہے تھے۔انہیں اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس موقع پر کیا بات کرنا چاہیے۔غیر ملکی مہمانوں کے سامنے قومی سیاست کا تذکرہ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔یہ ہمارے گھر کا معاملہ ہے اسے ہم خود سلجھاتے رہیں گے لیکن کچھ لوگوں کو ان باتوں کی پرواہ نہیں ہوتی یا شائد وہ جان بوجھ کر اپنی سیاسی بصیرت کا بھونڈا مظاہرہ کرنا پسند کرتے ہیں۔

بھارتی وفد میں شامل ایک مسلمان وزیر نے کہا۔"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ تقسیم کیوں ہوئی تھی۔" میں نے کہا۔"آپ کی سوچ ایک بھارتی شہری ہونے کے ناطے درست ہے۔آپ کی عمر میرے برابر ہی ہے۔یقیناً آپ کا بچپن تحریک آزادی کے آخری دنوں کا شاہد ہوگا۔اس کے باوجود اگر آپ یہ بات کر رہے ہیں تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو یہی بات کرنا چاہیئے۔" ہم بحث نہیں کریں گے بلکہ دُعا کریں گے کہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اللہ تعالیٰ ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کیلئے آسانیاں پیدا کرے۔ وہ بھی امن و سکون اور عزت و وقار کے ساتھ زندہ رہ سکیں۔ آئندہ کوئی اور ''گجرات'' جنم نہ لے۔

گوجرانوالہ سے لاہور کیلئے واپسی ہوئی۔ لاہور پہنچتے پہنچتے 5 بج گئے۔ رات کو 8 بجے آواری میں ڈنر تھا۔ فخر زمان اور ان کے ایک دوست نے اس ڈنر میں شرکت کیلئے مجھے دو کارڈ دیئے تھے۔ میں نے بیگم کو ڈنر کیلئے تیار کیا ہوا تھا۔ روانہ ہونے سے پہلے احتیاطاً لفافے میں کارڈ چیک کئے تو دیکھا کہ کارڈ سیمینار کے تھے۔ چنانچہ بیگم سے معذرت کی۔ میں خود بھی شرکت نہ کرتا لیکن آج صبح افضال شاہد کے ساتھ پروگرام طے ہوا تھا کہ چوٹالہ صاحب کو کتابوں کا تحفہ پیش کیا جائے چنانچہ اکیلا چلا آیا۔ ساڑھے نو بجے چوٹالہ صاحب آ گئے۔ سٹیج سے اعزاز آذر نے ابتدائی گفتگو کے بعد کتابوں کا تحفہ پیش کرنے کیلئے مجھے بلایا۔ میں نے کچھ کتابوں کا ایک خوبصورت گفٹ پیک چوٹالہ جی کو پیش کیا۔ پھر فخر زمان نے گفتگو کی۔ آخر میں شری چوٹالہ نے سوہدرہ میں اپنے ''بے پناہ'' استقبال پر تاثرات بیان کئے۔ اس موقعہ پر انہوں نے عید کے بعد عالمی پنجابی کانگریس کے تحت کروشیتر میں کانفرنس کی میزبانی اور شرکاء کی مہمانداری کی خواہش کا اظہار کیا اور اسے قبول کرنے کیلئے شدت سے اصرار کیا۔ فخر زمان نے یہ دعوت قبول کر لی۔ پھر کھانا شروع ہو گیا۔ کھانے کے دوران ضیاء شاہد آ گئے۔ آجکل بلڈرز کا سکینڈل زبان زد خاص و عام ہے تقریباً 34 ارب روپے کا ایک اور فراڈ عوام کے ساتھ ہو گیا۔ یہ کریڈٹ ضیاء شاہد کے خبریں کو جاتا ہے جس نے اس فراڈ کو طشت از بام کیا۔

کھانے کے دوران بھارتی مہمانوں سے باتیں ہوتی رہیں۔ فاصلے کم کرنے اور پیار محبت بڑھانے کی میٹھی میٹھی باتوں کے ساتھ ساتھ ''پرنالہ'' اپنی جگہ پر ہی تھا۔ ان کا اصرار ہے کہ دوستی ہونی چاہیے۔ لیکن اس انداز میں کہ آئے ہو تو کیا لائے ہو۔ جا رہے ہو تو کیا دے کر جاؤ گے۔

تقریباً گیارہ بجے رات تھک ہار کر گھر پہنچا۔ آنے والے دن کا پروگرام بھی طویل ہے۔ لیکن میزبانی کا آخری دن ہوگا۔ صبح نو بجے پھر آواری پہنچنا ہے۔

بارہ ستمبر کو دس بجے آواری سے قافلہ روانہ ہوا۔ آؤٹ فال روڈ سے بند روڈ اور پھر موٹروے پہ ہوا ہو گیا۔ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب شیخوپورہ میں جنڈیالہ شیر خان میں وارث شاہ کے مزار پر پہنچے۔ وہاں پہ فاتحہ پڑھی۔ مہمانوں نے چادریں چڑھائیں۔ پھول نچھاور کئے۔ وارث شاہ کا مزار ایک کھلی جگہ پر خوبصورت انداز میں تعمیر کیا گیا ہے۔ باقاعدہ پلاننگ نظر آتی ہے۔ سخت گرمی اور حبس کے باوجود وہاں شامیانوں کے نیچے بہت اچھا انتظام موجود تھا۔ ''ہیر'' پڑھنے والے پانچ مشہور و معروف افراد نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ اگرچہ گرمی اور ہجوم پریشان کر رہے تھے لیکن پروگرام بہت اچھا رہا۔ چائے اور لوازمات بھی مناسب تھے۔ یہ اہتمام خاص خاص لوگوں کیلئے تھا۔ عوام کو باہر دھوپ میں فاصلہ پر پولیس نے روک رکھا تھا۔ ان کے نصیب میں ''افتادگان خاک'' ہی رہنا ہے۔ سو یہاں بھی تھے۔ تحائف کا تبادلہ ہوا۔ مہمانوں کو شیلڈ اور ہیر کے نسخے پیش کئے گئے۔ دوپہر ایک بجے کے قریب یہاں سے نکل سکے۔ اب ہماری منزل ننکانہ صاحب تھی۔

فیصل آباد آتے جاتے میں نے ننکانہ صاحب کا راستہ تو ضرور دیکھا تھا لیکن کبھی ادھر جانے کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ خواہش تو تھی جواب پوری ہو رہی تھی۔ مین روڈ فیصل آباد کو ایکسپریس وے بنایا جا رہا ہے۔ کام جاری تھا چنانچہ قافلے کی رفتار کم تھی۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم لوگ ننکانہ صاحب کیلئے سائیڈ روڈ پر مڑ گئے۔ اور پھر چالیس منٹ میں ہم ننکانہ صاحب پہنچ گئے۔ بابا گورونانک کا جنم استھان دیکھنے کی تمنا پوری ہوئی۔ تین بچیوں نے کیرتن سنایا۔ چوٹالہ جی نے کچھ پیسے ہارمونیم پر رکھے، ماتھا ٹیکا اور لان میں لگے شامیانوں کے نیچے آ گئے۔ یہاں مختلف افراد سے ملاقات ہوئی۔ دیہی ثقافت پر جدید دور کے اثرات کا تذکرہ ہوا اور پھر کھانے پینے کی چیزوں پر یلغار ہو گئی۔ انتظامات قابل تعریف نہیں تھے۔ گرمی کے سبب سخت پیاس تھی لیکن پینے کو پانی نہیں تھا۔

تین بجے کے قریب اطلاع ملی کہ بلوکی ہیڈ پر کھانے کا اہتمام ہے۔ فخر زمان صاحب کا کہنا تھا کہ وہاں کوئی سٹڈ فارم بھی دیکھنا ہے۔ چار بجے کے قریب بلوکی ہیڈ ورکس سے گزر کر پھول نگر (بھائی پھیرو) پہنچے۔ پھول نگر میں ناظم صاحب کا گھر ہماری منزل تھی جو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تین ایکڑ میں پھیلا ہوا ایک قلعہ نما مکان ہے۔ آتش بازی اور ڈھول تاشوں کے ساتھ استقبال کیا گیا۔ ضیافت کا اہتمام تو تھا مگر انتظام ناقص تھا۔ ایک بڑے گھر کے چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں بہت سارے لوگوں کو کھانا پیش کیا گیا۔ کھانا اچھا اور وافر تھا لیکن بدنظمی اور نااہلی کے قطب مینار کھڑے کر دیئے گئے۔ بھوک چمک رہی تھی۔ بڑی مشکل سے ایک پلیٹ ملی۔ تھوڑا بہت کھایا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ یہاں ایک زبردست لطیفہ ہوا۔ چوٹالہ صاحب اُٹھ کر باتھ روم جانے لگے تو دسیوں افراد بھی ساتھ گھسنے کیلئے تیار تھے۔ انہوں نے کہا کہ بھائی اگر اجازت دیں تو پیشاب کرلوں۔

پھول نگر آنے کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ رانا پھول محمد بھی ہریانے کے میوات میں سے ہیں۔ چوٹالہ فیملی کے ساتھ ان کے دیرینہ مراسم ہیں۔ یہ لوگ بضد تھے کہ چوٹالہ صاحب وہاں آئیں۔ دراصل وہ اپنی جاگیر دکھانا اور سیاسی اثرات میں اضافہ کرنا اور اپنے شریکوں پر رعب ڈالنا چاہتے تھے۔ ایسی باتوں سے ہی ووٹروں کو بتایا جاتا ہے کہ وہ کتنے بااثر ہیں۔ ناظم صاحب رانا پھول محمد کے خاندان سے ہیں لیکن رانا پھول کے بیٹوں سے "شریکہ" ہے۔ رانا پھول محمد کے بیٹوں کا اصرار تھا کہ اگر چوٹالہ صاحب ہمارے شریکوں کے گھر آئیں گے تو پھر انہیں ہمارے گھر بھی آنا ہوگا اور پورے پروٹوکول کے ساتھ آنا ہوگا ورنہ برادری اور شہر میں ناک کٹ جائے گی۔ وہ جو کہتے ہیں کہ شریکوں کی دیوار گرانی ہے چاہے اس کے نیچے آکر اپنا بیٹا ہی کیوں نہ مارا جائے۔

ناظم صاحب کے گھر سے نکل کر چائے کیلئے یہ قافلہ پورے کروفر اور ہوٹروں کی ہٹو بچو کے ساتھ......ساتھ والے گھر میں یعنی رانا پھول محمد کے گھر میں داخل ہوا۔ چائے کا انتظام پورے لوازمات کے ساتھ تھا۔ پھل کی فراوانی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا گاؤں پھلوں پہ ٹوٹ پڑا۔ مقصد بھی یہی تھا کہ چوٹالہ صاحب دیکھ لیں کہ ہم لوگ کس طرح اپنے گاؤں والوں کا خیال رکھتے ہیں اور اپنی ہر خوشی میں انہیں شریک کرتے ہیں۔

ایک گھنٹہ مزید ضائع کر کے سٹڈ فارم دیکھے بغیر قافلہ لاہور کی جانب روانہ ہوا۔ پھول نگر سے ملتان روڈ پر سفر کرتے دائیں بائیں کارخانے دیکھتے ہوئے ٹھوکر نیاز بیگ پہنچے۔ نہر

کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے اب ہمارا خیال تھا کہ اگلے بیس پچیس منٹ میں آواری پہنچ جائیں گے۔ لیکن ڈاکٹرز ہاسپٹل والے موڑ سے قافلے کا رُخ فیصل ٹاؤن کی طرف ہو گیا اور پھر ماڈل ٹاؤن ایکسٹینشن کی طرف مڑ گیا۔ ہمارے ساتھ بیٹھے پروٹوکول کے ذمہ دار فرد نے بتایا کہ ماڈل ٹاؤن ایکسٹینشن میں حامد میو رہتے ہیں۔ یہ اوم پرکاش چوٹالہ کے رشتہ دار ہیں۔ چوٹالہ صاحب کو ان سے ملنے جانا ہے۔ میں نے پوچھا رشتہ داری کیسی؟ تب اسی بھلے مانس نے بتایا کہ 1947ء کے فسادات میں جو مسلمان عورتیں ہندوؤں نے چھین لی تھیں ان میں حامد میو کی کوئی بہت قریبی عزیزہ بھی شامل تھیں۔ اسے چوٹالہ فیملی نے اپنے گھر ڈال لیا تھا اور پھر شادی کر لی۔ اب چونکہ اوم پرکاش چوٹالہ چیف منسٹر ہریانہ ہیں اس لئے ان کے ساتھ رشتہ داری توقیر کی بات بن گئی۔

میں نے سوچا یہ تو نجی ملاقات ہوگی۔ ہمارا وہاں کیا کام؟ ہم نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا اور اپنی کوسٹر کو قافلے سے علیحدہ کر کے واپس ہوٹل آ گئے۔ میرا چھوٹا بیٹا رضوان گاڑی لئے انتظار میں تھا۔ میں رضوان کے ساتھ ریگل چوک میں اکبر زیدی کے گھر آ گیا۔ رجب کی 26 تاریخ تھی۔ یہ دن نذر نیاز کا ہوتا ہے۔ چنانچہ کچھ دیر کیلئے بیٹھ گئے۔ اب ہمیں الحمرا میں کلچرل پروگرام میں شرکت کرنا تھی۔

غیر ملکی وفود اور خصوصاً بھارت سے آنے والے وفود میں کس طرح کے لوگ شامل کر دیئے جاتے ہیں۔ اس کا ذکر گزشتہ روز کے واقعات میں کرنا بھول گیا تھا۔ اب سن لیجئے۔ دس تاریخ کو چوٹالہ صاحب کے ساتھ آنے والے وفد میں تین صحافی بھی تھے۔ ان میں سے ایک صاحب بلیک لسٹ تھے۔ وہ رات کو خاموشی سے ہوٹل سے نکلے اور کسی اور جگہ منتقل ہو گئے۔ ایک ایجنسی کی اس پر نظر تھی۔ رات دو بجے اس کی مصروفیات دیکھنے کے بعد اسے تحویل میں لے لیا گیا اور صبح واہگہ کے اس پار دھکیل دیا گیا۔ یہ ناپسندیدہ شخصیت ہندوستان ٹائمز کے چندی گڑھ ایڈیشن کی ایڈیٹر ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا بھائی کنہیا جی کے جنم استھان سوہدرہ آنے والے افراد میں اس قسم کے لوگ نہیں ہوں گے؟

الحمراء ہال نمبر 1 بہت بڑا اور ایئر کنڈیشنڈ ہے۔ اس میں 750 نشستوں کا انتظام

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے۔ کلچرل پروگرام چونکہ میوزیکل تھا چنانچہ حاضری ٹھیک ٹھاک تھی۔ لوگ آ رہے تھے۔ ابھی لوگ اطمینان سے اپنی نشستیں سنبھال بھی نہیں پائے تھے کہ پتہ چلا کہ چوٹالہ صاحب پاکستان انڈیا فورم کے ڈنر سے فارغ ہو کر جم خانہ سے نکل چکے ہیں۔ انہیں ریسیو کرنے کیلئے فخر زمان کے ساتھ باہر آ گیا۔ چند منٹ میں چوٹالہ صاحب کا قافلہ پہنچ گیا۔ انہیں ساتھ لیکر ہال میں آ گئے۔

آج کا پروگرام آرٹس کونسل کے تعاون سے پنجابی کانگریس پیش کر رہی تھی۔ پتہ چلا کہ چند سینئر فنکاروں نے آنے سے انکار کر دیا ہے۔ دراصل مفت میں تو ہر آدمی ہر وقت دستیاب نہیں ہوتا۔ ادھر ہمارے لئے یہ یقین کرنا آسان نہیں تھا کہ آرٹ کونسل کے پاس فنڈز نہیں ہیں؟ اخبارات اور چینلوں پہ خبریں تواتر سے آ رہی ہیں۔ شہر میں شور مچا ہوا ہے۔ تین دن سے جو کچھ ہو رہا ہے وہ پیسہ کے بغیر تو ممکن نہیں۔ فنکاروں کیلئے معاوضہ کیوں نہیں۔ اس کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔ اب اندر کی بات تو فخر زمان ہی جانتے ہیں۔

مہمانوں نے نشستیں سنبھالیں تو پروگرام شروع ہوا۔ اسٹیج سیکرٹری بھی تقریر کرنے کے مرض میں مبتلا تھے۔ انہوں نے مسلسل بات سے بات نکالنے طولانی تمہید باندھنے اور اپنے اصل کام کو پس پشت ڈالنے کا عمل جاری رکھا۔ لوگوں نے بھی بیزاری سے پہلو بدلنے اور احتجاج کرنے میں دیر نہ لگائی۔ اللہ اللہ کر کے پپو گروپ سامنے آیا۔ اس میں دو ڈھول والے تھے۔ ایک لحیم شحیم اور دوسرا دھان پان۔ ڈھول کی تھاپ آہستہ آہستہ تیز ہوئی پھر ایک ردھم میں تبدیل ہو گئی۔ اب اس گروپ میں تیسرا رکن شامل ہو گیا۔ یہ ملنگ کے روپ میں تھا۔ اس نے جم کر رقص کیا یا دھمال ڈالی۔ اس کی دھمال ختم ہوئی تو بڑے پپو نے بڑے ڈھول کے ساتھ گھومنا شروع کیا۔ اس کا رقص تیز ہوا تو گردش کے ساتھ ڈھول منہ کے برابر آ گیا لیکن ردھم میں بال برابر فرق نہ آیا۔ یقیناً یہ اس کا فنی کمال تھا کیونکہ ہر ڈھول بجانے والا اس طرح گردش میں رہتے ہوئے ایک ہی آہنگ میں ڈھول نہیں بجا سکتا جبکہ ڈھول بھی فضا میں بلند ہوتا چلا جائے۔ ابھی اس پر داد دے ہی رہا تھا کہ میرے پاس بیٹھی دوسری جماعت کی طالبہ میری پوتی انوش نے پوچھا "بابا جانی کیا یہ لوگ (پپو گروپ) پاگل خانے

سے آئے ہیں؟" اس کے بعد دو نہایت واہیات آئٹم پیش کئے گئے۔ اس پر ہال میں سے آواز آئی۔ سٹیج سیکرٹری صاحب یہ پاکستانی کلچر ہے جو آپ پیش کر رہے ہیں۔ آپ کو شرم آنی چاہیے۔

ثریا خانم نے پروگرام کو کچھ سنبھالا دیا لیکن محسوس ہو رہا تھا کہ وہ پنڈت جسراج کی موجودگی کے سبب احساس کمتری کا شکار ہو کر اپنا اصل رنگ بھی بھول گئی ہے۔ اپنی کمزوری کا اعتراف اس نے فوراً ہی کر لیا۔ اب چوٹالہ صاحب نے جانے کی اجازت چاہی جو بیزاری کا کھلا اظہار تھی۔ اس دوران پنڈت جسراج اسٹیج پر آئے اور فرمایا کہ میں بڑے شوق سے گاتا لیکن یہ ماحول یہ اسٹیج میرا نہیں ہے یہ کہہ کر وہ واپس آ گئے لیکن چوٹالہ جی نے انہیں دوبارہ اسٹیج پر بھیج دیا۔ اب پنڈت جی نے کہا کہ یہ تو سرسوتی کی اسٹیج ہے۔ میں کیسے انکار کر سکتا ہوں۔ پھر انہوں نے اپنی بیٹی برکھا کو بھی بلا لیا اور پہلے بھجن اور پھر اللہ اوم سنایا۔ اب سٹیج سیکرٹری نے پھر اپنا لچ تلا اور ہیر رانجھا پہ نور جہاں کے گیت پر رقص کروا دیا۔ انہیں بلا کر سمجھایا گیا کہ وقت کم ہے اس لئے استاد حامد علی خاں کو بلا لو۔

حامد علی خان اپنے بیٹے کے ساتھ سٹیج پر آئے۔ اتنا خوبصورت پرفارم کیا کہ شری چوٹالہ بے اختیار خود اُٹھ کر سٹیج پر گئے۔ پھول پیش کئے اور مبارک باد دی۔ پھر وہاں سے پنڈت جسراج اور ان کی بیٹی کو بلوایا اور حامد علی خان سے ملوایا۔ یہ کام خود پنڈت جی کو کرنا چاہیے تھا لیکن وہ اندھوں میں کانا راجہ بنے ہوئے تھے۔ جب ایک پاکستانی استاد نے کلاسیکی جھلک پیش کی تو وہ شائد سکتے میں آ گئے تھے۔ چوٹالہ صاحب کو یہ اعزاز حاصل ہوا اور انہوں نے بڑائی کا ثبوت دیا۔ لوگوں نے بھی دل کھول کر داد دی۔

میرے ساتھ ان کے ایک وزیر بیٹھے تھے۔ وہ بڑے انہماک سے پروگرام دیکھ رہے تھے۔ مجھے کہنے لگے یہاں آ کر اندازہ ہوا ہے کہ آپ زندگی کے تمام شعبوں میں ہمارے ساتھ ساتھ ہیں۔ بعض معاملات میں تو ہم سے بھی آگے ہیں۔ میں نے کہا۔ یہ بات آپ ہمیں خوش کرنے کیلئے کہہ رہے ہیں۔ ہم تو آپ کی جمہوریت کے راگ سن سن کر جب ایمان لانے لگتے ہیں تو آپ کے ہاں کوئی نہ کوئی گجرات ہو جاتا ہے وہ صاحب جھینپ گئے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رات ایک بجے کلچرل پروگرام ختم ہوا۔ اب شیڈول کے مطابق صبح آواری میں پریس کانفرنس تھی۔ گھر پہنچتے تک نیند نے بے دم کر دیا۔

تیرہ ستمبر کو صبح نو بجے میں پھر آواری ہوٹل میں تھا۔ یہاں عالمی پنجابی کانگریس کے کچھ اور عہدیداران بھی موجود تھے۔ لیکن پریس کانفرنس میں سٹیج پر صرف دو کرسیاں رکھی گئی تھیں۔ عہدیداران بھی اخبار نویس حضرات کے ساتھ بیٹھنے پر مجبور تھے۔ ایسے مواقع پر اگر ایک طرف عہدیداران کیلئے کرسیاں لگا دی جاتیں تو اس کا مجموعی تاثر بہتر نتائج کا حامل ہوتا۔ ان معاملات پہ فخر زمان صاحب کو غور کرنا چاہیے۔

ٹھیک دس بجے چوٹالہ صاحب تشریف لے آئے۔ فخر زمان صاحب نے اپنی دو کتابیں پیش کیں اور ابتدائی گفتگو فرمائی۔ چوٹالہ صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ جواب میں چوٹالہ صاحب نے اپنی تقریر میں پاکستان کے چھ ضلعوں کی سیاحت، لوگوں کی مہمان نوازی اور سڑکوں وغیرہ کی بہت تعریف کی لیکن انہوں نے ایک شکوہ بھی کیا کہ ہمارے ہاں (بھارت) گندم گوداموں میں پڑی سڑ رہی ہے لیکن آپ روس اور نہ جانے دُنیا کے کس کس کونے سے اپنے لئے گندم منگوا رہے ہیں۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ان کے وفد میں موہن سنگھ بینس جیسے افراد موجود ہیں۔ یہ ان کے فارن انویسٹمنٹ کے ایڈوائزر ہیں۔ مجھے ملنے کیلئے میرے دفتر میں بھی آئے۔ حیرت ہے کہ ایسے لوگوں کے ہوتے ہوئے چوٹالہ صاحب کو علم نہیں کہ پاکستان بیرون ملک سے گندم کی خریداری اوپن ٹینڈر کے ذریعے کرتا ہے۔ ظاہر ہے جس کے ریٹس سب سے کم ہوں گے آرڈر اسی کو ملے گا۔ ہماری اطلاع یہ ہے کہ بھارت نے بھی ٹینڈر دیا لیکن اس کے ریٹس سب سے زیادہ تھے، کاروباری اصول ہے کہ چیز وافر ہو تو دام گرا دیئے جاتے ہیں۔ بھارت کو چاہیے تھا کہ وہ سب سے کم کوٹیشن دیتا۔ اس کی گندم سڑنے سے بچ جاتی اور ہمیں بھی معلوم ہو جاتا کہ بھارت صرف یک طرفہ تجارت نہیں چاہتا۔ ہمارا پڑوسی ہونے کی وجہ سے ہمارے لئے نرم گوشہ رکھتا ہے۔ بھارت سے آنے والوں کی میٹھی میٹھی باتوں پہ توجہ دی جائے یا ان کاموں پہ جو بغل میں چھری رکھنے کے مترادف ہیں۔

اکتوبر 2004ء

پاک بھارت تعلقات اور پرنٹ میڈیا کا کردار

ادارہ سپوتنک اور ورلڈ پنجابی کانگریس، پرنٹ میڈیا ونگ کے زیر اہتمام 31/اکتوبر 2004ء کو شیزان ریسٹورنٹ میں ایک سیمینار "پاک بھارت تعلقات اور پرنٹ میڈیا کا کردار" کے موضوع پر منعقد ہوا اس کی صدارت جناب شاہد حامد سابق گورنر پنجاب نے کی جبکہ مہمان خصوصی ورلڈ پنجابی کانگریس کے چیئرمین فخر زمان تھے۔ مقررین میں امتیاز راشد، عزیز مظہر اور حمید اختر شامل تھے۔ ڈاکٹر مبشر حسن اور ایس ایم ظفر نے اس سیمینار کیلئے اپنے پیغامات بھجوائے۔

ادارہ سپوتنک اور پرنٹ میڈیا ونگ ورلڈ پنجابی کانگریس کی طرف سے میں آپ سب کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ ماہنامہ سپوتنک پرنٹ میڈیا کا ایک حصہ ہونے کے ناطے اپنے ملک کے ارباب فہم و دانش سے رہنمائی لینا چاہتا ہے کہ نئی بین الاقوامی صورتحال میں پاک بھارت تعلقات کس نہج پر ہونے چاہئیں اور پرنٹ میڈیا کا کیا کردار ہونا چاہیے۔ چنانچہ ہمارے اس سیمینار کا موضوع "پاک بھارت تعلقات اور پرنٹ میڈیا کا کردار" ہے۔

عصر حاضر الیکٹرانک میڈیا کا دور ہے۔ اطلاعات و معلومات کی تیز تر ترسیل اور حالات و واقعات پر ماہرین کے فوری تبصرے اور تجزیئے لوگوں کا ردعمل تیزی سے تشکیل دینے میں مدد دیتے ہیں۔ لیکن پرنٹ میڈیا کا مقام اور کردار آج بھی انتہائی موثر اور مسلم ہے۔ اس کا ایک اپنا دائرہ اثر ہے جو طاقتور الیکٹرانک میڈیا کے سامنے سکڑ نہیں پایا۔

سرد جنگ کے خاتمہ کے بعد محض ایک عشرہ کے دوران عالمی حالات اتنی تیزی سے تبدیل ہوئے ہیں کہ کرۂ ارض کے تقریباً تمام ممالک کو اپنی اقتصادی اور خارجہ پالیسیوں پر نظر ثانی کرنا پڑی ہے۔ براعظم ایشیا تو شدت سے متاثر ہوا ہے۔ پاکستان کو افغانستان کا ہمسایہ ہونے اور عراق کے قریب واقع ہونے کی وجہ سے ایسی صورت حال درپیش ہے کہ اسے اپنے عالمی اور ایشیائی کردار میں نمایاں قسم کی تبدیلی کرنا پڑی ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دُنیا کی اکلوتی سپر پاور امریکہ اپنے مفادات کیلئے جس طرح ایشیا میں طویل عرصہ تک رہنے کیلئے آیا ہے۔ اس نے ایشیاء کا منظرنامہ تبدیل کر دیا ہے۔ نئے حالات میں بھارت اور پاکستان اپنے اپنے کردار کو نئی سمت اور نیا مزاج دینے پر مجبور ہیں۔ نئی صورت حال میں داخلی اور خارجی عوامل نے دونوں ملکوں کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ باہمی تعلقات کو نئی صورت دیں۔ چنانچہ دونوں ملکوں کے ارباب بست وکشاد ممکنہ نئی صورتحال کے خدوخال ترتیب دینے میں مصروف ہیں۔

ماضی میں پاک بھارت تعلقات کو ایک مخصوص صورت دینے میں دونوں ملکوں کی سرکاری پالیسیوں کے ساتھ ساتھ دونوں ملکوں کے پرنٹ میڈیا نے بھی اپنا کردار ادا کیا ہے۔ دُنیا بھر میں پرنٹ میڈیا ایک طرف عوامی اُمنگوں کا عکاس ہوتا ہے تو دوسری طرف رائے عامہ تشکیل دینے میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ جب بھی پاک بھارت تعلقات اور پرنٹ میڈیا کی بات ہوگی تو دونوں ملکوں کا پرنٹ میڈیا زیر بحث آئے گا۔ ماضی میں دونوں ملکوں کا پرنٹ میڈیا دو مختلف انتہاؤں پر کھڑا نظر آتا ہے۔ پاکستان میں بھارت دشمنی اور بھارت میں پاکستان دشمنی کا۔ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ ''برصغیر کی آزادی کی جدوجہد'' بھارت کی نصابی اور غیر نصابی کتابوں میں کچھ اور جبکہ پاکستان میں کچھ اور ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ دونوں طرف دشمنی کی نفسیات کا غلبہ تاریخ میں جڑیں رکھتا ہے۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ اس نفسیات کو عوام کے لاشعور میں دھکیلنے کا کام پرنٹ میڈیا نے کیا۔

پرنٹ میڈیا کا کردار ماضی میں بوجوہ، جو بھی رہا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کا گہری نظر سے جائزہ لیا جائے۔ دیکھا جائے کہ ماضی میں یہ کردار کیسا رہا؟ اب یہ کردار کیسا ہے اور آئندہ کیسا ہونا چاہیے؟ کیا یہ ہمارے قومی مفادات کا ترجمان رہا ہے۔ کیا اب یہ عوامی امنگوں کا عکاس ہے۔ کیا یہ سطحی جذباتیت بیدار کر رہا ہے یا بالغ نظری کا ثبوت دے رہا ہے۔

ہمارے فاضل مقررین اس موضوع پر اپنی فکر ودانش کے در وا کریں گے اور ان کی فہم وبصیرت ہماری رہنمائی کرے گی۔ اس موضوع پر مختلف آراہوں گی اور یقیناً ہونی چاہئیں۔ ہم آزادی رائے کے حامی ہیں اور ان کے اختلاف کے حق کو بسر وچشم تسلیم کرتے ہیں۔

دسمبر 2004ء

بھارت کیا چاہتا ہے؟

آغا امیر حسین

پاک بھارت مذاکرات ایک بار پھر تعطل کا شکار ہیں اور اس تعطل کا سبب بمبئی بم دھماکے بنے ہیں۔ بھارت کا الزام ہے کہ اس دہشت گردی میں پاکستان کے کچھ شہری ملوث ہیں۔ پاکستان نے کہا تھا کہ اگر اس میں کوئی ہمارا شہری ملوث ہے تو ثبوت پیش کئے جائیں ہم اس کے خلاف ضروری کارروائی کریں گے۔ بھارت کا اصرار تھا کہ ملوث افراد اس کے حوالے کئے جائیں اور یہ کہ اس نے متعلقہ ثبوت فراہم کر دیئے ہیں۔

مذاکرات سے پیچھا چھڑانے یا خود ہی انہیں سبوتاژ کرنے کی عادت بھارت کو ابتدا ہی سے ہے۔ گزشتہ چند برسوں سے اس نے داخلی اور خارجی دباؤ میں آکر پاکستان سے مذاکرات تو شروع کر لئے تھے لیکن پھر پیچھے ہٹ جانے کی پرانی عادت برقرار رکھی۔ گذشتہ ساٹھ سال سے یہی کچھ ہوتا آرہا ہے۔ کشمیر کے مسئلہ پر وہ دوڑا دوڑا سلامتی کونسل میں گیا۔ وہاں سے جنگ بندی کا اہتمام کرا کے اور ریاست جموں وکشمیر میں رائے شماری کا دعویٰ کر کے واپس آیا اور پھر ہمیشہ کے لئے اینٹھ گیا۔ کبھی مطالبہ کیا کہ آزاد کشمیر سے پاکستان اپنی فوجیں ہٹالے تو پھر رائے شماری کے بارے میں سوچیں گے۔ کبھی منہ بسور لیا کہ پاکستان بغداد پیکٹ میں شامل ہو گیا ہے۔ اس لیے رائے شماری ممکن نہیں۔ تاشقند میں کشمیر کا مسئلہ باہمی گفت وشنید سے طے کرنے کے بعد منہ پھیر کر بیٹھ گیا اور پھر شملہ سمجھوتے میں اس مسئلہ کو دو طرفہ مذاکرات سے حل کرنے پر رضامندی کے بعد میں نہ مانوں کا انداز اپنالیا۔

آگرہ مذاکرات ابھی کل کی بات ہے۔ سب کچھ طے ہو جانے کے بعد عین آخری لمحات میں بیک آؤٹ کر گیا۔ صدر مشرف نے کھٹمنڈو میں سارک کانفرنس کے دوران اٹل بہاری واجپائی سے مصافحہ کر کے برف پگھلانے کی کوشش کی۔ لیکن پیش رفت آپ کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سامنے ہے۔ خدا خدا کر کے مذاکرات کا سلسلہ بحال کیا گیا جیسے تیسے یہ آگے بڑھ رہا تھا کہ بمبئی دھماکوں کو بہانہ بنا لیا گیا۔ سوال یہ ہے کہ تالی ایک ہاتھ سے کیسے بجے گی۔ پاکستان پورے اخلاص کے ساتھ کشمیر سمیت سبھی تنازعات حل کرنا چاہتا ہے۔ لیکن بھارت کا اصرار رہا ہے کہ کشمیر کو چھوڑو باقی معاملات طے کرو۔ پاکستان اس پر بھی اتر آیا۔ خشکی کے راستے بس اور ریل کی آمد و رفت بحال کی گئی۔ ویزہ میں نرمی برتی گئی۔ بھارت کا مطالبہ ہے کہ اسے پسندیدہ ملک قرار دیکر تجارت کو وسعت دی جائے۔

بھارت اب جو چاہتا ہے اس کی بات ساٹھ سال پہلے گاندھی جی نے کی تھی لیکن بھارتی نیتاؤں کو ان کی یہ بات بری لگی۔ بھارت نے جب آزادی کے بعد پاکستان کے اثاثے روک لئے تو گاندھی جی نے مرن برت رکھ لیا۔ ان کا کہنا تھا کہ پاکستان کے ساتھ بڑے بھائی جیسا سلوک کرو۔ اس کو طے شدہ اثاثے ہی نہیں اس سے بڑھ کر کچھ دے دو۔ تجارتی رابطے بحال رکھو۔ اچھے ہمسایوں کی طرح رہو۔ اسی میں بھارت کا فائدہ ہے۔ لیکن اس وقت کی بھارتی قیادت کی سمجھ میں یہ بات نہ آسکی۔ دراصل گاندھی جی نے بھانپ لیا تھا کہ پاکستان کا الگ وجود تو عمل میں آچکا ہے۔ اب سختی اور شدید ردعمل کے نتیجہ میں وہ مزید دور ہو جائے گا۔ اسے قریب رکھنے اور واپس بھارت ماتا کی گود میں لانے کیلئے پیار کی مار مارنے کی ضرورت ہے۔ گاندھی جی اس مسئلہ کو بھی اپنے مخصوص فلسفہ اہنسا کے تحت حل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن غصے اور نفرت سے ابلتے ہوئے کانگریسی نیتاؤں کیلئے یہ طویل مدت منصوبہ قابل قبول نہیں تھا۔ وہ دو چار برسوں میں پاکستان کو اپاہج کر کے واپس بھارت میں شامل کرنے کی عجلت میں تھے۔ گاندھی جی کی تجویز کو سختی سے مسترد کر دیا گیا۔ اور انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اگر ابتدا سے ہی تجارتی رابطے بحال رہتے تو پاکستان کی واپسی تو خیر ممکن نہیں تھی لیکن بہت سے مسائل اور ناگواریاں نہ پیدا ہوتیں۔ پاکستان کی منڈیوں میں بھارتی تاجروں کا عمل دخل رہتا اور آج بھارت کو یہ مطالبہ نہ کرنا پڑتا کہ اسے Most Favourit

Nation قرار دیا جائے۔ خیر یہ تو مقطع میں سخن گسترانہ بات آگئی۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ بھارت کے ساتھ تنازعات حل کرنے کی بنیاد آخر کیسے میسّر آئے گی۔ وہ آج بھی گاندھی جی کی خواہش کے مطابق بڑے بھائی کا کردار ادا کرنے پر تیار نہیں۔ وہ خطے میں امن و سکون چاہتا ہے لیکن عدل و انصاف اور مساوات کی بنیاد پر نہیں بلکہ بالاتری اور من مانی کے ساتھ، وہ علاقے میں اپنی حاکمیت چاہتا ہے۔ اپنے موقف بلکہ اپنی خواہش پہ عملدرآمد چاہتا ہے۔

دونوں ملکوں کے درمیان جنوری 2006ء میں نئی دہلی میں خارجہ سیکرٹریوں کی سطح پر مذاکرات کا تیسرا دور ہوا۔ اعلامیہ جاری ہوا کہ دونوں ملک مسئلہ کشمیر حل کرنے کیلئے اعتماد سازی کے مزید اقدامات کریں گے۔ ان اقدامات میں لائن آف کنٹرول کے قریب نئی دفاعی چوکیاں نہ بنانے اور ماہانہ فلیگ میٹنگ کا فیصلہ کیا گیا۔ لائن آف کنٹرول پر پانچ مقامات کو کشمیریوں کی آمد و رفت کیلئے کھولنے پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے مذاکرات کے عمل میں پیش رفت کو قابل قدر قرار دیا گیا۔ 2004ء میں "اعلان اسلام آباد" کے تحت دونوں ملکوں کے درمیان مذاکرات بحال ہوئے تو پاکستان کا دعوی تھا کہ ان مذاکرات میں مسئلہ کشمیر کو "کور ایشو" کی حیثیت حاصل ہوگی۔ لیکن دو سال کے دوران اس موضوع پر سرسری گفتگو بھی نہ ہوئی۔ بھارت کا سارا زور ماضی کی طرح مسئلہ کشمیر کو نظر انداز کر کے تعلقات کو بہتر بنانے پر رہا۔ یہ درست ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان زمینی اور فضائی رابطے بحال ہوئے ہیں۔ فنکاروں اور عوامی وفود کا سلسلہ شروع ہوا۔ دوطرفہ تجارت بڑھانے پر توجہ دی گئی۔ پاکستان تو مذاکرات کی ابتدا ہی سے کنٹرول لائن اور سیاہ چن پر رضا کارانہ جنگ بندی کا اعلان کر چکا ہے۔ اس جنگ بندی کے بعد بھارت نے کنٹرول لائن پر خاردار باڑ کی تنصیب شروع کر دی۔ پاکستان نے دبے لفظوں میں احتجاج کیا لیکن عملاً کوئی رکاوٹ نہ پیدا کی۔ پاکستان کی تمام تر کوشش یہ رہی ہے کہ بھارت کے ساتھ دوستی بڑھائی جائے۔ جبکہ بھارت کی حکمت عملی یہ تھی کہ پاکستان کے ساتھ اس قدر قربت بڑھائی جائے کہ مسئلہ کشمیر کا نام و نشان نہ رہے۔ کیا اس بنیاد پر دوستی کا سفر شروع ہو سکتا ہے؟

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بھارت عالمی سطح پر ایک بڑی قوت بن کر ابھر رہا ہے۔ امریکہ بھی ایشیا میں اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے تیزی سے بھارت کی طرف لپک رہا ہے اس خواہش میں وہ اپنے پرانے حلیف پاکستان کو محض نظر انداز ہی نہیں روندنے پر بھی تیار نظر آتا ہے۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اسے بھارت کا تعاون اس لئے میسر ہے کہ اس جنگ کا رخ عام اسلام کی طرف ہے اور بھارت عالم اسلام کے ایک اہم ملک پاکستان کو دبانا چاہتا ہے۔ پھر امریکہ کی ملٹی نیشنل کمپنیوں کیلئے بھارت ایک بہت بڑی تجارتی منڈی ہے۔ یہ سب چیزیں امریکہ کے نزدیک بھارت کو اس کا قدرتی حلیف بناتی ہیں۔ کیا پاکستان اس صورت حال میں کبوتر کی طرح آنکھیں بند کئے بیٹھا رہے گا؟

آگرہ مذاکرات کے بعد پاک بھارت تعلقات میں کئی نشیب و فراز آئے ہیں۔ ایک موقع پر تو پاکستان کی سرحدوں پر بھارتی فوج کا سیلاب امنڈ آیا۔ ایسا لگتا تھا کہ دونوں ممالک میں ہولناک جنگ چھڑنے والی ہے اور نوبت ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال تک پہنچ جائے گی۔ مگر اس موقع پر حکومت پاکستان کی ہوشمندی، افواج پاکستان کی مستعدی اور امریکہ کی مداخلت کے باعث بھارت اپنی تمام تر طاقت کے باوجود سرحدیں عبور کرنے کی جرأت نہ کرسکا۔ اور افواج کی واپسی کا عمل شروع ہوگیا۔

بھارت نے کشمیر کو اٹوٹ انگ قرار دینے اور سرحد پار دہشت گردی کا واویلا جاری رکھا جس کے نتیجہ میں پاکستان پر عالمی دباؤ بڑھتا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ پاکستان نے امریکہ کے دباؤ پر جہاد کشمیر میں فعال تنظیموں کی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی۔ اقوام متحدہ کی قرار دادوں کے خلاف کنٹرول لائن پر بھارت نے باڑ کی تنصیب کا کام جاری رکھا۔ پاکستان خاموش رہا۔ بگلیہار ڈیم کی تعمیر آخری مرحلے میں داخل ہونے سے پاکستان کی زراعت تباہ ہونے کا خطرہ پیدا ہوا۔ پاکستان نے عالمی بنک سے رجوع کیا لیکن بھارت کے ساتھ رویہ دوستانہ رکھا۔ پاکستان نے دو طرفہ تعلقات کی بحالی کے لئے اب تک جو قیمت ادا کی ہے وہ معمولی نہیں ہے۔ اب تک دوستانہ تعلقات کا سارا بوجھ پاکستان ہی کے سر پر ہے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ پاک بھارت دوستی میں دونوں ممالک کے عوام کا مفاد ہے۔ خوشگوار تعلقات دونوں ملکوں کے لئے معاشرتی تجارتی اور اقتصادی فوائد کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ لیکن عقل سلیم رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ تنازعہ کشمیر کی موجودگی میں یہ بیل منڈھے نہیں چڑھ سکتی۔ مسئلہ کشمیر کا پائیدار اور منصفانہ حل پاک بھارت تعلقات کا پہلا قدم ہے۔ جب تک یہ نہیں اٹھایا جاتا ساری کوشش بے معنی رہیں گی۔ بھارت نے تو اتنا بھی نہیں کیا کہ پاکستان کے اقدامات کے جواب میں کشمیری عوام پر جبر و تشدد کا سلسلہ بند کردے اور وہاں سے اپنی فوجیں نکال لے یا ان میں کمی کردے۔

کیا ہم خود فریبی میں مبتلا رہیں گے۔ حقائق سے آنکھیں چراتے اور تاریخ کا حلیہ بگاڑتے رہیں گے۔ بھارت نہ تو کل قابل اعتماد تھا اور نہ آج۔ وہ جس قیمت پر ہم سے دوستی چاہتا ہے وہ کسی بھی پاکستانی کے لئے قابلِ قبول نہیں۔ ہم اپنے پالیسی سازوں سے مسلسل کہتے آرہے ہیں کہ موجودہ بین الاقوامی صورت حال اور بالخصوص امریکہ اور بھارت کی قربت کے تناظر میں عقل و دانش سے کام لیا جائے۔ نئے سرے سے خارجہ حکمت عملی مرتب کی جائے اور بدلتی ہوئی عالمی صورت حال میں اپنی ترجیحات کا تعین از سر نو کیا جائے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

امریکہ

ہوئے تم دوست جس کے......

امریکن لابی کی پاکستان دشمنی

پچھلے تین ماہ سے پاکستان میں ایک مہم جاری ہے۔ پہلے یہ کہا جاتا تھا کہ کلنٹن نے ہندوستان اور بنگلہ دیش کے دورے کا تو اعلان کر دیا ہے اور پاکستان نہ آنے کا فیصلہ کیا ہے۔ کیونکہ پاکستان سے جمہوریت ختم ہو چکی ہے۔ اور امریکی صدر غیر جمہوری حکمران سے ہاتھ ملانے کے لئے تیار نہیں۔ اور یہ کہ امریکہ ہندوستان کے ساتھ مل گیا ہے اور پاکستان کے لئے شدید مشکلات پیدا ہو گئی ہیں اور اس کی سلامتی اور بقا خطرے میں پڑ گئی ہے۔ پھر کلنٹن صاحب نے چند گھنٹے کیلئے پاکستان آنے کا اعلان کیا تو کہا گیا کہ یہ پاکستان کی بے عزتی ہے کہ امریکی صدر ہندوستان تو 5 دن تک رکے اور پاکستان میں صرف 5 گھنٹے! امریکن لابی یہ تاثر پیدا کرتی رہی کہ امریکی صدر نے چند گھنٹے کیلئے ہی سہی پاکستان آنے کا اعلان کر کے پاکستان کی وہ عزت افزائی کی ہے کہ پاکستان کو کلنٹن کی اس ''کرم فرمائی'' پر قربان ہو جانا چاہئے۔ کلنٹن صاحب ہندوستان آئے اور ان کے اس دورے کی کامیابیوں کا شور پوری دنیا میں مچتا رہا۔ کلنٹن صاحب نے ہندوستان میں جو بیانات بھی دیئے وہ کسی نہ کسی طور پر پاکستان کے خلاف تھے۔ لہٰذا اس بات کو لے کر یہاں ہنگامہ شروع ہو گیا کہ امریکہ نے ہندوستان کو اپنا لیا اور پاکستان کو چھوڑ دیا۔ اب پاکستان کا کیا بنے گا؟ پھر کلنٹن صاحب پاکستان آئے۔ یہاں انہوں نے پاکستان اور پاکستانی قوانین کی دل کھول کر خلاف ورزی کی۔ سیکورٹی کے انتظام کا ذکر تو چھوڑ یئے انہوں نے ٹریفک قوانین کی بھی خلاف ورزی کی اور پاکستان میں امریکن ٹریفک قوانین کی پابندی کرتے ہوئے رائٹ ہینڈ ڈرائیو کا اصول اپنایا۔ پاکستان میں رائج لیفٹ ہینڈ ڈرائیو کے قوانین کی دھجیاں بکھیر دیں۔ پھر پاکستانی عوام سے براہ راست ٹیلی ویژن پر خطاب کیا۔ دو تین جگہ پر منافقانہ طور پر چند الفاظ پاکستانیوں کو بے وقوف بنانے کیلئے کہنے کے علاوہ سامعین کو خوب سنائیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پاکستان کو پیش آنے والی بے کسی اور بے بسی کی "نویدیں" سنائیں اور کلنٹن صاحب واپس چلے گئے۔

کلنٹن صاحب کے واپس تشریف لے جانے کے بعد بھی ایک مہم مسلسل جاری ہے کہ امریکہ نے ہندوستان کو اپنا دوست اور حلیف ملک تسلیم کر لیا ہے اور پاکستان کی اہمیت اس کے نزدیک کم ہوگئی ہے بلکہ رہی ہی نہیں۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ اگر پاکستان کو اپنی خیریت عزیز ہے تو وہ امریکہ کے پاؤں پکڑ لے اور جیسا امریکہ کہتا ہے ویسا کرے ورنہ سالمیت خطرے میں ہے۔ یہ مہم کچھ اس طور پر جاری رکھی جا رہی ہے اور حکومت کا اپنے وزراء کی فوج اور ISI کے جنرل صاحب ایک کے بعد ایک امریکہ بھیجنے کا عمل اس مہم کو مزید تقویت فراہم کر رہا ہے عام پاکستانی فی الحقیقت پریشان ہوگیا ہے کہ پاکستان کا کیا بنے گا؟ کیا ہمارا 52 سال کا آقا امریکہ اس حد تک ہم سے متنفر ہو چکا ہے کہ ہماری سلامتی داؤ پر لگ چکی ہے۔ یقین جانئے عام آدمی اس حد تک پریشان ہے کہ اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا۔ پڑھے لکھے بے حس ہیں اور ان پڑھ جو دراصل حقیقی پاکستانی ہیں اب صرف معجزوں کی امید میں وقت گذار رہے ہیں۔ اصل صورت حال کیا ہے اور ملک دشمن مہم کیوں جاری رکھی جا رہی ہے۔ ہم ذیل میں اس کا تجزیہ کرنے کی کوشش کریں گے۔

امریکہ کو حقیقتاً پاکستان کی سالمیت سے کبھی بھی دلچسپی نہیں رہی۔ سوائے ان ادوار کے جب اسے اپنے مفاد میں ہماری ضرورت پڑتی تھی کیونکہ ہندوستان امریکی سیاست کا مہرہ بننے کے لئے تیار نہیں ہوتا تھا۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہندوستان کی قیادت نے کبھی بھی ہندوستان کے مفاد کے خلاف کسی ملک کا ساتھ نہیں دیا چاہے وہ امریکہ ہو یا روس۔ اس کے برعکس الا ماشاء اللہ پاکستانی قیادت نے امریکہ کا ساتھ دیتے وقت پاکستان کے مفاد کا کبھی خیال نہیں رکھا۔ پاکستانی قیادت مراعات یافتہ طبقہ پر مشتمل رہی ہے اور اس طبقے نے ہمیشہ وہ کام کیا ہے جو اس طبقے کے مفاد میں تھا پاکستان کے مفاد میں نہیں۔ اس طبقے کا مفاد امریکہ کی غلامی میں مضمر ہے یہ طبقہ سمجھتا ہے کہ اگر اس کو امریکی حمایت حاصل نہ رہی تو یہ

پاکستان میں ختم ہو جائے گا۔ چنانچہ اسے یہ صورت منظور نہیں۔ اسے پاکستان بھی اسی وقت تک منظور ہے جب تک اس کی مراعات قائم رہیں۔ اس لئے اب جب امریکہ نے کھل کر ہندوستان کی اہمیت اور حمایت کا اعلان کر دیا ہے اور یہ بتا دیا ہے کہ امریکہ کے نزدیک ہندوستان ایک بڑی طاقت ہے اور اسے دنیا اور خاص طور پر اس علاقے میں بھرپور اور موثر کردار ادا کرنا ہے تو ظاہر ہے عام پاکستانی امریکہ کے اس عمل کی مخالفت کرے گا۔ انہوں نے پاکستان ہندوستان کی غلامی کیلئے نہیں بنایا تھا۔ مراعات یافتہ طبقہ اب یہ سمجھ چکا ہے کہ پاکستان کے عامتہ الناس عوام ہندوستان کی غلامی قبول نہیں کریں گے اور اس سلسلہ میں مراعات یافتہ طبقہ کی ہر کوشش کی بھرپور مخالفت کریں گے تو اسے فکر لاحق ہوگئی ہے کہ کہیں اس کی مقتدر حیثیت خطرے میں نہ پڑ جائے۔ اس لئے مراعات یافتہ طبقہ اور امریکی لابی پاکستان میں خوف و ہراس کی مہم چلائے جا رہے ہیں تاکہ عام پاکستانی ڈر کر ذہنی طور پر تیار ہو جائے کہ وہ ویسے پاکستان کو بھی قبول کر لے جو حقیقت میں ہندوستان کا غلام ہو اور جس کی حیثیت بھوٹان سے زیادہ نہ ہو۔ لیکن قارئین کرام! یقین جانئے کہ اصل صورت حال ایسی نہیں ہے پاکستان کے پاس اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس وقت بھی ایسے مواقع موجود ہیں جن سے فائدہ اٹھا کر ہم ہندوستان کی غلامی سے بچ سکتے ہیں۔ امریکہ کی سازشیں بھی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں اور ہم دنیا کی قوموں میں ایک باوقار' باعزت' طاقتور اور اقتصادی طور پر ایک مستحکم قوم کی حیثیت میں زندہ رہ سکتے ہیں۔ یہ مواقع کیا ہیں اور ہم ان سے کیسے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور امریکہ کی ان کوششوں سے جو وہ ہمیں یہ فائدہ اٹھانے سے محروم رکھنے کے لئے کر رہا ہے۔ کیسے بچ سکتے ہیں اور امریکہ کے حقیقی عزائم کیا ہیں۔ اس پر تفصیل سے بات کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ بات ہر کس و ناکس جانتا ہے کہ اقتصادیات میں تیل کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ مڈل ایسٹ کے عرب ممالک تیل کی دولت سے مالا مال ہیں۔ اس تیل کے بغیر امریکہ' یورپ اور جاپان وغیرہ کی معیشت تباہ ہو جاتی ہے۔ جنگ عظیم دوم کے بعد امریکہ ایک فاتح قوم کی صورت میں سامنے آیا۔ لیکن وہ ابھی اتنا طاقتور نہیں تھا کہ وہ دنیا میں جو چاہتا کر سکتا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پھر اس کے مقابلے میں روس بھی آ گیا تھا۔ نظام سرمایہ داری اور کیمونزم کے درمیان کشمکش شروع ہوگئی۔ امریکہ کسی صورت گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ روس کو تیل پیدا کرنے والے مسلمان ملک پر کوئی اثر ورسوخ حاصل ہو جائے۔ یورپ کے ممالک خاص طور پر برطانیہ جنگ عظیم دوم کے نتیجے میں اتنے کمزور ہو چکے تھے کہ وہ تیل کی دولت کو مغرب کیلئے محفوظ بنانے میں کوئی کلیدی کردار ادا نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا امریکہ اور ان کے حواریوں کو اسرائیل قائم کرنا پڑا تا کہ وہ مڈل ایسٹ میں مغرب کے غنڈے کا کردار ادا کر سکے۔ اور تیل پیدا کرنے والے ممالک کو سراسیمہ بنائے رکھنے میں آسانی رہے۔ کئی ممالک میں لڑائیاں شروع کروا کر روس کو مصروف رکھا گیا تا کہ وہ مڈل ایسٹ میں کوئی موثر کردار ادا نہ کر سکے۔ مڈل ایسٹ میں کئی لڑائیاں کروائی گئیں اور عربوں کو شکستیں دلوائی گئیں تا کہ امریکہ اور مغرب کے لئے تیل کے وسائل دستیاب رہیں۔ اسرائیل کو اتنا طاقتور بنا دیا گیا کہ سب عرب ممالک مل کر بھی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ حتیٰ کہ ایسا وقت آیا کہ سوویٹ یونین ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ امریکہ اب بھی مطمئن نہیں تھا۔ کیونکہ اب اسے اسرائیل پر انحصار کرنا پڑ رہا تھا۔ اور اسرائیل اس کی بھاری قیمت وصول کرتا تھا۔ اس مشکل سے نکلنے کیلئے امریکہ نے اپنے ایجنٹوں کے ذریعے ایسے حالات پیدا کئے کہ عراق نے کویت پر قبضہ کیا اور پھر امریکہ اور یورپ کویت کو آزاد کروانے کے نام پر عراق سے لڑنے کے لئے بے تحاشا فوجیں لے آئے۔ عراق کو شکست ہوئی لیکن صدام آج بھی حکمران ہے یہ اسی لڑائی کا نتیجہ ہے کہ تیل پیدا کرنے والے عرب ملکوں میں اب امریکہ کے تیس سے زیادہ بری' بحری اور فضائی اڈے ہیں۔ اب امریکہ براہ راست عرب کے تیل کے ذخائر کو اپنے قبضے میں لے چکا ہے اور اب اسرائیل پر انحصار کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ نہ کسی عرب ملک کی چاپلوسی کرنے کی۔ یوں امریکہ اب بغیر کسی شراکت کے تیل کے مڈل ایسٹ والے وسائل پر قابض ہے۔ لیکن یہ وسائل ہمیشہ ساتھ نہیں دیں گے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کے ذخائر کم ہوتے چلے جائیں گے۔ اس کے باوجود تیل اپنی کثیر الجہتی خصوصیات کی وجہ سے اہم رہے گا۔ امریکہ نے اس صورت حال سے عہدہ براہ ہونے کا بندوبست بھی ابھی سے کرنا شروع کر دیا ہے۔

وسطی ایشیاء کی ریاستیں قازقستان' ازبکستان' ترکمانستان' آذربائیجان وغیرہ تیل کی دولت سے مالا مال ہیں۔ مڈل ایسٹ کی عرب ریاستوں کے بعد تیل کے وسیع ذخائر ان ممالک میں ہی پائے جاتے ہیں۔ اب امریکہ کی نظریں ان ممالک کو کنٹرول کرنے پر لگی ہوئی ہیں۔ جب تک امریکہ ان ملکوں پر کنٹرول حاصل نہیں کر لیتا۔ افغانستان میں لڑائی بند نہیں ہوگی۔ تا کہ کہیں یہ ممالک تیل نکالنے اور تیل کو دنیا تک افغانستان کے راستے پہنچانے میں کامیاب نہ ہو جائیں۔ افغانستان میں جب ربانی اور حکمت یار مشترکہ حکومت بن گئی تھی تو اسے ناکام بنانے کا کام امریکہ نے کروایا تا کہ کہیں افغانستان میں حالات معمول پر نہ آ جائیں۔ پھر جب طالبان آئے تب فوراً امریکہ شمالی اتحاد کو مدد دینے لگا تا کہ افغانستان کی خانہ جنگی جاری رہے۔ یہ خانہ جنگی اور اس خطے میں دوسری لڑائیاں اس وقت تک ختم نہیں ہوں گی جب تک امریکہ وسطی ایشیاء کی تیل کی دولت سے مالا مال ریاستوں پر اپنے فوجی اڈے مسلط نہیں کر لیتا۔ یہ امریکی پالیسی ہے جس پر وہ کاربند ہے۔ اس پر کامیابی اور ناکامی کا انحصار امریکی خواہش پر نہیں اس علاقے پر اثر انداز ہونے والی دوسری طاقتوں اور اس علاقے کے اپنے ممالک کی تگ و دو پر بھی منحصر ہے۔

امریکہ اس وقت دنیا کی واحد موثر طاقت ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ اس کی معیشت کو کوئی خطرہ لاحق ہو لہٰذا اس کی خواہش ہے کہ دنیا میں کوئی ملک ایسا نہ رہے جو اس کی رضا کے سامنے اپنا سر خم نہ کرتا ہو۔ سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد روس میں وہ دم خم نہیں کہ وہ امریکہ کیلئے خطرہ بن سکے۔ اب اگر کوئی ملک اقتصادی اور فوجی لحاظ سے امریکہ کے لئے مستقبل میں خطرہ بن سکتا ہے تو وہ چین ہے۔ اس لئے امریکہ نے چین کے اردگرد ممالک میں چین مخالف مسائل کھڑے کر دیئے ہیں اور ان کو اس شدت تک لے گیا ہے کہ چین اب ان مسائل کی حرارت محسوس کرنے لگا ہے بلکہ سمجھ گیا ہے کہ ان مسائل کو اگر بڑھنے دیا گیا تو پھر نقصان زیادہ ہوگا۔ وہ کوشش کر رہا ہے کہ اسے اتنا وقت مل جائے جب وہ ان مسائل کو اپنی شرائط کے مطابق حل کرنے کا اہل ہو جائے۔ لیکن یہ بات یاد رہے کہ چین اس وقت بھی اتنا کمزور نہیں کہ امریکہ چین کے خلاف جو چاہے کر گزرے۔ امریکی پالیسی چین کو اس

www.iqbalkalmati.blogspot.com

طرح تکلیں ڈال کر رکھنے کی ہے۔ تا کہ چین اپنے اقتصادی اور فوجی ہدف پورے نہ کر سکے۔ امریکی چین کے ساتھ دوبدو لڑائی کے لئے اب بھی تیار نہیں وہ پراکسی لڑائیوں کی ایک مسلسل لڑی بنانے کی کوشش میں مصروف ہے تا کہ مختلف ایجنٹوں کا استعمال کر کے چین کو اہداف حاصل نہ کرنے دیئے جائیں۔

امریکی بنیا قوم ہے۔ اس کی سب کوششوں کا مقصد اقتصادی ترقی ہے۔ اس موقع پر آپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ 1973ء کی عرب اسرائیل لڑائی کے بعد عربوں نے تیل کی سپلائی پر جزوی طور پر بندش لگا دی تھی اور کچھ آزاد پالیسیوں پر چل پڑے تھے۔ تیل کی قیمت فی بیرل 40 ڈالر تک چلی گئی تھی۔ جس کے نتیجے میں امریکہ، یورپ اور جاپان کی اقتصادیات بیٹھ گئی تھیں۔ اس وقت تیل پیدا کرنے والے ملکوں اور تیل استعمال کرنے والے بڑے ملکوں یعنی امریکہ، یورپ اور جاپان کے متحدہ وفدوں کے درمیان تیل کے کے حوالے سے مذاکرات ہوئے تھے۔ جس میں تیل پیدا کرنے والے ملکوں نے شرط رکھی کہ وہ تیل کی قیمتیں کم کرنے پر تیار ہیں۔ بشرطیکہ صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک اس بات پر راضی ہو جائیں کہ تیل کی قیمتوں میں کمی بیشی صنعتی ملکوں سے درآمد شدہ مصنوعات کی قیمتوں سے منسلک کر دی جائے۔ یعنی کہ اگر ان صنعتی اشیاء کی قیمتیں بڑھیں گی تو اسی تناسب سے تیل کی قیمت بھی بڑھ جائے گی لیکن نہ امریکہ اور نہ یورپی ممالک اور جاپان اس پر راضی ہوئے یہ معاملہ اس وقت تک لٹکائے رکھا گیا جب تک امریکہ نے تیل کے ان وسائل پر کسی نہ کسی طرح تسلط نہ جما لیا اور اس کے بعد تیل کی قیمتیں 10/12 ڈالر فی بیرل تک بھی نیچے آئیں اور اس کے مقابلے میں صنعتی ممالک کی برآمد شدہ اشیاء کی قیمتیں کم از کم پانچ گنا بڑھ گئیں۔ آج اگر تیل پیدا کرنے والے عرب ممالک قرضوں میں جکڑے ہوئے ہیں اور امریکہ اور یورپ کے ممالک فاضل بجٹ دے رہے ہیں تو اس کی وجہ تیل کی یہی کساد بازاری ہے جو امریکہ نے اپنے قبضے کے بعد پیدا کی ہے۔ امریکہ اور صنعتی ممالک اقتصادی ترقی کے فوائد سمیٹ رہے ہیں اور تیل کی دولت سے مالا مال ممالک قرضوں کے جال میں جکڑے پڑے ہیں۔ یہ ہے امریکی اور یورپ کی اقتصادی ترقی کا راز! کلنٹن یا کسی اور کا اس میں کمال

نہیں۔ جب تک امریکہ تیل کے وسائل پر قابض رہے گا۔ تیل پیدا کرنے والے اور دوسرے غریب ممالک کی اقتصادی حالت اور پتلی ہوتی چلی جائے گی۔

یہ اقتصادیات کا بنیادی اصول ہے کہ اقتصادی ترقی کسی بھی جگہ رک نہیں سکتی۔ اس ترقی کو قائم رکھنے کیلئے ضروری ہے کہ اس میں ہر سال کم از کم اتنا اضافہ تو ہو جتنا کم از کم انفلیشن کی وجہ سے ضروری ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ امریکہ اور مغرب کی اقتصادیات میں ترقی ہوتی رہے۔ اس وجہ سے ان ممالک نے سوچا ہے کہ اب دنیا میں کون سے ممالک بچے ہیں جہاں سرمایہ کاری کر کے یہ ترقی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس حوالے سے چین اور ہندوستان کا کوئی اور ملک مقابلہ نہیں کر سکتا۔ چین میں یہ ممالک پہلے ہی سرمایہ کاری کر کے جس حد تک منافع کما سکتے ہیں کما رہے ہیں اب صرف ہندوستان بچا ہے۔ کسی بھی ملک میں عام استعمال کی صنعتی اشیاء کی کھپت درمیانے اور نچلے درمیانے طبقہ میں ہوتی ہے۔ ہندوستان میں یہ طبقہ اب 30 کروڑ افراد پر مشتمل ہے۔ اس وجہ سے ترقی یافتہ ممالک کو سرمایہ کاری اور منڈی کے لحاظ سے ہندوستان اب سونے کی کان نظر آتا ہے۔ اس لئے کہ امریکہ اور یورپی ممالک ہر قیمت پر ہندوستان سے اپنے تعلق بڑھائیں گے۔ اب یہ علیحدہ بات ہے کہ ہندوستان ان ممالک کو اس وقت تک فائدہ نہیں اٹھانے دے گا۔ جب تک ہندوستان کی مخصوص شرائط کو مان نہیں لیا جاتا۔ اور ہمیں کسی خوش فہمی میں رہنے کی بجائے صاف صاف سمجھ لینا چاہئے کہ ہندوستان کی شرائط جو امریکہ نے مانی ہیں۔ وہ حسب ذیل ہیں۔

1- پاکستان کا ایٹمی پروگرام مکمل طور پر بند کر دیا جائے۔
2- پاکستان کے (خدانخواستہ) حصے بخرے کر دیئے جائیں۔
3- ہندوستان کو ایٹمی طاقت مان لیا جائے اور اس علاقے کا چودھری ہونے کا اعلان کر دیا جائے۔
4- ہندوستان میں سرمایہ کاری کرتے وقت ہندوستان کی ترجیحات کو اولیت دی جائے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

5- ہندوستان کو چین کے برابر حیثیت کا ملک مانا جائے۔

یہ شرائط پڑھ کر پریشان نہ ہو جایئے گا۔ اللہ تبارک تعالیٰ نے ہمارے لئے بچاؤ کے راستے بھی پیدا کر دیئے ہیں۔ ملک دشمن نواز شریف گورنمنٹ سے چھٹکارا کسی معجزے سے کم نہیں۔ چین امریکہ کے عزائم سے پوری طرح واقف ہے وہ ہماری ضروریات کو بھی سمجھتا ہے۔ ہمارا دوست ہے اور ثابت کر چکا ہے کہ وہ سچا دوست ہے چین کو بھی دوستوں کی اشد ضرورت ہے۔ ہم اگر مندرجہ ذیل کام کر لیں جو مشکل نہیں تو دنیا ہماری ترقی اور استحکام دیکھ کر ششدر رہ جائے گی۔

1- پاکستان، ایران اور افغانستان کسی نہ کسی طرح متحدہ دفاع کا کوئی معاہدہ کر لیں۔

2- اس معاہدے کے بعد اس بلاک کا چین کے ساتھ معاہدے کا امکان روشن ہو جائے گا۔

3- مراعات یافتہ طبقات کا ایران اور افغانستان کی طرح پاکستان میں مکمل خاتمہ کر دیا جائے۔

4- امریکی اور دوسرے غیر ملکی ایجنٹوں کا فی الفور خاتمہ کر دیا جائے۔ انہیں کہا جائے کہ اگر وہ محبِ وطن پاکستانی نہیں بن سکتے۔ تو پاکستان چھوڑ دیں۔

5- ہندوستان سے دب کر بات نہ کی جائے۔ یہ ذلت کی بات ہے کہ ہم بات چیت کا کہتے ہیں اور ہندوستان Snub کرتا رہتا ہے۔

6- جو سیاسی پارٹیاں اور سیاست دان اپنی شیطانی کارروائیوں کو چھپانے کیلئے جمہوریت کی بحالی کا نام لے کر شور ڈال رہی ہیں ان کا موثر طور پر بندوبست کر دیا جائے۔

7- موجودہ حکمران English Speaking یونین سے باہر نکل کر تجربہ کار اور عملی اقتصادیات کے ماہر اشخاص کا انتخاب کریں اور یہ بات یاد رکھیں کہ ہمارے دانشوروں اور بیوروکریٹس کا طبقہ فن خوشامد، فن چاپلوسی اور Hippocracy میں اتارو ہے اور بڑے بڑے دماغوں کو زیر اثر لانے کا ماہر ہے ان طبقات سے بچیں۔

ہمارے حکمرانوں کے موجودہ بیانات سے واضح طور پر یہ تاثر ملتا ہے کہ وہ اس طبقے کے زیر اثر آنا شروع ہو گئے ہیں۔ اللہ خیر کرے۔

ہم آخر میں اس بات کا اعادہ کرنا چاہتے ہیں کہ اس خطے میں امریکی عزائم اس وقت تک پورے نہیں ہو سکتے جب تک پاکستان کو ہندوستان کا غلام نہ بنا دیا جائے۔ اگر پاکستان غلامی قبول نہیں کرتا تو پھر امریکہ کے لئے ہندوستان میں سرمایہ کاری کیلئے مناسب اور موزوں حالات میسر نہیں آتے اور نہ ہی وہ اتنی بڑی منڈی کے فوائد حاصل کر سکتا ہے۔ اس لئے یہ بات ذہن میں رکھیئے کہ امریکہ کے ایجنٹ خوف و ہراس پھیلانے اور ڈرانے کی کارروائیاں دن بدن تیز کرتے جائیں گے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم مضبوط قدموں پر کھڑے رہیں۔ اوپر دی ہوئی تجاویز کے مطابق ہر قسم کی سازشوں کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہیں۔ آیئے قیام پاکستان کے جذبے اور پھر اسے بناتے وقت جو کروڑوں افراد کی جانیں اور عصمتیں قربان ہوئیں، انہیں یاد رکھیں اور عہد کریں کہ ہم جئیں گے تو آزاد اور باوقار قوم کے طور پر۔ ہندوستان کے غلام بن کر نہیں۔ یقین رکھیئے کہ اگر ہم یہ عہد کر لیں اور اس پر کاربند ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ کی نصرت ہمارے ساتھ ہو گی۔ امریکہ سے ڈرنے والے امریکہ سے ڈرتے رہیں۔ پاکستان کے عوام قادرِ مطلق کے علاوہ کسی سے نہیں ڈرتے۔

مئی 2000ء

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پاکستان توڑنے کا امریکی منصوبہ
پاکستانی عوام کیلئے چیلنج

''امریکی وزارت دفاع (پالیسی) کے زیر اہتمام امریکی تھینک ٹینک کی مطالعاتی رپورٹ ایک بھارتی جریدے آؤٹ لک میں شائع کی گئی ہے۔اس کے اقتباسات پیشِ خدمت ہیں۔

اگر امریکی تھینک ٹینک کے تصوراتی اندازے درست ہیں تو بھارت کا سپر پاور بننے کا دیرینہ خواب ایک دن حقیقت میں بدل جائے گا۔

بھارتی جریدے ''آؤٹ لک'' میں شائع ہونے والی اس امریکی مطالعاتی رپورٹ کے اقتباسات تین انتہائی صورتوں کے حامل خیالی منظر ناموں کی پیش گوئی کرتے ہیں۔

1- پاکستان امریکی حمایت یافتہ ''بھارتی کنفیڈریشن'' میں ضم ہو جائے گا۔

2- چین اور بھارت کا علاقے پر تسلط ہو جائے گا۔

3- چین پاکستان پر قبضہ کر لے گا۔

ایک منظر نامہ یہ ہے کہ:

2012ء میں بھارت پاکستان کی ایٹمی تنصیبات پر روایتی ہتھیاروں سے حملہ کرتا ہے جو ناکام رہتا ہے۔جس کے بعد پاکستان بھارتی افواج پر ایٹمی ہتھیاروں سے جوابی حملہ کرتا ہے۔تب امریکہ B-2 بمبار طیاروں کے ذریعہ پاکستان کی ایٹمی تنصیبات اور ہتھیاروں کو تباہ کر دیتا ہے تاکہ وہ غلط ہاتھوں میں نہ جاسکیں۔یہیں سے پاکستان کے خاتمہ کا آغاز ہوتا ہے جس کے نتیجے میں ایک وسیع بھارتی کنفیڈریشن یا سپر اسٹیٹ کا جنم ہوتا ہے۔

رپورٹ کے مطابق یہ ناسٹرا ڈیمس کی الہامی پیش گوئیاں نہیں بلکہ مستقبل کے ان خیالی منظر ناموں کی ایک جھلک ہے جو ''ایشیا............2025ء'' نامی ایک مطالعاتی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رپورٹ میں پیش کیے گئے ہیں۔ 147 صفحات پر مشتمل اس رپورٹ کو امریکی وزارت دفاع کے انڈر سیکریٹری برائے پالیسی کے زیر نگرانی نیول وار کالج' نیو پورٹ' رہوڈز آئی لینڈ میں 25 جولائی اور 4 اگست 1999ء کے درمیانی عرصے میں تیار کیا گیا تھا۔ اس رپورٹ کو چند مخصوص حلقوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ اس خیالی اور فرضی رپورٹ کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ امریکی دفاعی ماہرین اپنی توجہ یورپ سے ہٹا کر اب ایشیا پر مرکوز کر رہے ہیں جہاں انہیں ایشیا کی ابھرتی ہوئی معاشی قوت یعنی چین کے خطرے کا سامنا ہے جس کے پیش نظر مستقبل میں امریکہ اور بھارت کے مابین انتہائی قریبی تعلقات قائم ہو سکتے ہیں۔

اس مطالعاتی رپورٹ کی تیاری کا بنیادی مقصد یہ جاننا تھا کہ 2025ء تک ایشیا کی صورت حال کیا ہوگی اور اس سے امریکی دفاع اور قومی سلامتی کے منصوبہ سازوں کو کس قسم کے چیلنج کا سامنا ہوگا۔ تاہم رپورٹ کی تیاری میں حصہ لینے والے افراد کا کہنا ہے کہ یہ تمام منظر نامے محض فرضی اور خیالی ہیں۔ جن کی بنیاد انسانی تخیلات پر رکھی گئی ہے۔

رینڈ کارپوریشن کے مسٹر ایشلے ٹیلس کا شمار امریکی پالیسی وضع کرنے والے پندرہ ممتاز ترین افراد میں ہوتا ہے جو اس رپورٹ کی تیاری میں شریک تھے ان کا کہنا ہے۔

"یہ طویل المدتی تصوراتی جائزہ ہے جس کا بنیادی مقصد پالیسی سازوں کو یہ سوچنے میں مدد دینا ہے کہ وہ مستقبل میں پیش آنے والے متبادل امکانات پر غور کر سکیں جو روزمرہ پڑنے والے دباؤ کے سبب ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو سکتے ہیں۔"

بنکاک میں مقیم ایک ایشیائی سفارت کار کی رائے میں:۔

"قابل ذکر بات یہ ہے کہ بھارت کو امریکہ کی دفاعی پالیسیوں میں ایک اہم اور مرکزی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ اپنے ایٹمی تجربات اور انفارمیشن ٹیکنالوجی میں عالمی اہمیت نے بھارت کو قائدانہ کردار ادا کرنے کے قابل بنا دیا ہے۔ جلد یا بدیر وہ امریکہ کا دفاعی حلیف بن جائے گا جس کا مطلب ہے بھارت امریکہ فوجی اتحاد۔

پہلا منظر نامہ' نئے جنوبی ایشیا کے اس فرضی منظر نامے کا آغاز 2010ء میں پاکستان کے ممکنہ خاتمے سے ہوتا ہے جہاں روز افزوں معاشی بحران' لسانی تنازعات اور امن عامہ کی

بے قابو صورت حال کو سنبھالنے میں حکومت کی ناکامی نے عدم استحکام کو جنم دیا ہے۔

"سندھی' بلوچی اور پٹھان جو طویل عرصے سے پنجاب کے زیر تسلط پاکستان کے مخالف چلے آرہے ہیں۔ بغاوت کر دیتے ہیں۔ مہاجر سڑکوں پر نکل آتے ہیں' اسلامی انتہا پسندی اس عدم استحکام میں دو طرفہ اضافے کا باعث بنتی ہے یعنی "طالبان" کی جانب سے ملک کو کمزور کرنے کی کوششیں اور "جماعت اسلامی" کی بڑھتی ہوئی طاقت' اس کے برعکس بھارت نے بڑی کامیابی کے ساتھ سیاسی عدم مرکزیت اور معاشی اصلاحات کے ذریعے آبادی کی شرح میں تیزی سے کمی کی ہے۔ علاوہ ازیں اس نے اپنی قومی پیداوار میں نمایاں اضافہ کیا ہے اور یوں براہ راست بڑے پیمانے پر غیر ملکی سرمایہ کاری کے مواقع پیدا کر دیئے ہیں۔ دوسری طرف چین کی اقتصادی ترقی اور جنگ آزادی کا جذبہ مشرقی ایشیا میں امریکہ کو بھارت سے قریب لے آتا ہے۔ پاکستان میں انارکی کا فروغ ہو رہا ہے جبکہ امریکہ کی توجہ بدستور شمالی ایشیا پر ہے جہاں جاپان اور جنوبی کوریا میں اس کی افواج تعینات ہیں۔

2012ء تک پاکستان مکمل طور پر مفلوج ہو چکا ہے اور کشمیر میں انتہا پسند مسلم مداخلت کاروں پر اسے کوئی کنٹرول حاصل نہیں رہا۔ بھارت پاکستان سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ کشمیر میں انتہا پسندوں کی جانب سے کی جانے والی مداخلت کو بند کر دے۔ پاکستان کی ناکامی کی صورت میں بھارت اپنی افواج کو آزاد کشمیر میں داخل کر دیتا ہے۔ پاکستان بھارت کو خبردار کرتا ہے کہ اگر اس نے اپنی افواج کو آزاد کشمیر سے واپس نہیں بلایا تو وہ بھارت پر ایٹمی حملہ کر دے گا۔ پاکستان کے اس الٹی میٹم کا ساتھ دینے کی غرض سے چین اپنی فوجوں کو بھارت کی مشرقی سرحدوں پر نیپال اور بھوٹان کے درمیان نقل و حرکت کا حکم دیتا ہے تا کہ میزورام' ناگالینڈ' آسام اور سکم کی بھارتی فوجی چوکیوں پر قبضہ کر سکے۔ چین دھمکی دیتا ہے کہ وہ بھارتی جارحیت کو روکنے کیلئے تمام ممکنہ ذرائع استعمال کرے گا۔ امریکہ چین کو خبردار کرتا ہے اور دیگر فلیش پوائنٹس کے باوجود اپنی بحری افواج کو خلیج بنگال روانہ کر دیتا ہے اور چین سے کہتا ہے کہ وہ اس تمام قضیئے سے باہر رہے۔

پاکستان کی جانب سے ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال کی دھمکی سے خوف زدہ ہو کر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بھارت روایتی ہتھیاروں کی مدد سے پاکستان کی ایٹمی تنصیبات کو تباہ کرنے کی غرض سے حملہ کر دیتا ہے' جو ناکام ثابت ہوتا ہے۔ تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق پاکستان بھارت سے ملنے والی سرحدوں پر موجود بھارتی افواج پر ایٹمی حملہ کر دیتا ہے۔ دریں اثناء امریکی انٹیلی جنس پتہ لگاتی ہے کہ اسلامی انتہا پسند عناصر پاکستان کے باقی ماندہ ایٹمی ہتھیاروں پر قبضہ کر رہے ہیں۔ اس خبر سے' اکسا کر امریکہ روایتی ہتھیاروں کی مدد سے پاکستان کے ایٹمی مراکز پر حملہ کر دیتا ہے۔

اس غیر معمولی امریکی اقدام کے پیچھے اس کی یہ خواہش بھی موجود ہے کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان بڑے پیمانے پر ایٹمی جنگ نہ چھڑنے پائے۔ امریکہ اپنے B-2 بمبار طیاروں کی مدد سے گہرائی تک پہنچنے والے ''وار ہیڈز'' کے ذریعے پاکستان کی باقی ماندہ ایٹمی قوت کو تباہ کر دیتا ہے۔ بھارت.........امریکی باہمی اشتراک کی حقیقت کو دیکھتے ہوئے چین شمال مشرق سرحدوں سے اپنی فوجوں کو واپس بلا لیتا ہے۔

پاکستان میں مکمل انارکی کا دور دورہ ہے۔ بھارتی افواج امن و امان بحال کرنے کی غرض سے پاکستان میں داخل ہو جاتی ہیں۔ ملک کا شیرازہ منتشر ہونے کے ساتھ ہی پاکستانی علاقے بھارت سے الحاق کر لیتے ہیں۔ سندھ' بلوچستان اور سرحد کی پارلیمنٹس بھارتی کنفیڈریشن میں شمولیت کی منظوری دیتی ہیں۔ ایک وسیع بھارتی کنفیڈریشن وجود میں آ جاتی ہے۔ الگ تھلگ پنجاب بھی بالآخر مجبور ہو کر اس کنفیڈریشن میں شامل ہو جاتا ہے تا کہ بھارتی مشرقی پنجاب میں ضم ہو کر ''عظیم تر پنجاب'' کی تشکیل ممکن ہو سکے۔

منظر نامہ اسی طرح آگے بڑھتا ہے.........

بھارت کی مرکزی حکومت دفاع اور خارجہ پالیسی پر کنٹرول کے بدلے ان کنفیڈرل یونٹس کو وسیع تر داخلی خود مختاری دیتی ہے۔ معاشی طور پر ابھرتی ہوئی اس کنفیڈریشن کو علاقے کی ایک اہم طاقت کا درجہ حاصل ہو رہا ہے۔ دنیا بھر کے سرمایہ کاروں کی نگاہیں اس پر لگی ہوئی ہیں۔ پاکستان کے خاتمے اور وسیع تر بھارتی کنفیڈریشن کے وسط ایشیا پر دوررس اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ افغانستان کو اس کے ہمسایہ ممالک ایران' تاجکستان اور ازبکستان نے حصے بخرے کر کے لسانی بنیادوں پر آپس میں تقسیم کر لیا ہے۔

یہ سن 2020 ہے۔ پاکستان دنیا کے نقشے سے غائب ہو چکا ہے اور بھارتی کنفیڈریشن اس علاقے کی سپر اسٹیٹ کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔ وسط ایشیا سے براستہ ایران بھارت کو تیل کی ترسیل کیلئے پائپ لائن تعمیر کی جا رہی ہے۔ ایران کو ایک اہم ٹرانزٹ ملک کی حیثیت حاصل ہے اور کراچی کی بندرگاہ' مشرقی ایشیائی منڈیوں تک رسائی کا اہم ذریعہ بن چکی ہے۔

بھارت ایشیا کی ایک اہم علاقائی طاقت بن چکا ہے۔ امریکی منصوبہ ساز امریکی محکمہ دفاع پر زور دے رہے ہیں کہ وہ علاقے میں بھارت کی بڑھتی ہوئی اقتصادی اور جنگی اہمیت اور کردار کا پیشگی ادراک کریں۔

آخر میں امریکہ کو غیر متوقع طور پر پتہ چلتا ہے کہ بھارت اور ایران ایک دوسرے کے شراکت دار ہیں جن پر یہ مشترکہ ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ تیل کی سمندری گزرگاہوں کے تحفظ کو یقینی بناتے ہوئے خلیج اور بحر ہند میں امریکی ذمے داریوں میں تخفیف کر دیں۔ چین بھارت کو براہ راست چیلنج نہیں کرتا۔ اس کی بجائے وہ مشرق بعید اور انڈوچائنا میں اپنی سرگرمیوں کو تیز کر دیتا ہے۔ اسطرح وہ مشرقی ایشیا میں امریکی مفادات کو چیلنج کر سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انڈوچائنا اور خلیج بنگال میں اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کے بعد چین جنوب مشرقی ایشیا کو مستقبل کے میدان جنگ میں تبدیل کر دے۔ اگر بھارت مستقبل میں امریکہ کا قریبی اتحادی بن جائے تو علاقائی اور عالمی سطح پر ان تعلقات کو کس طرح مزید مضبوط بنایا جا سکتا ہے؟ ایشلی ٹیلس کا جواب یہ ہے۔

''ٹوٹتا ہوا پاکستان' جارح چین' مشرقی وسطیٰ سے برآمد ہونے والے تیل کو لاحق خطرات' بڑھتے ہوئے بھارتی امریکی اقتصادی روابط۔ بھارت کی اونچی شرح پیداوار اور امریکہ کے ساتھ مشترکہ امن کاوشوں میں شمولیت ایسے واقعات ہیں جو دونوں ممالک کے تعلقات کو مزید مستحکم کریں گے۔''

''ہندی' چینی بھائی' بھائی''

دوسرا منظر نامہ ایک نئے ''چینی...... بھارتی مشترکہ حاکمیت'' کی تخلیق ہے۔ اس واقعے کے پیش نظر امریکہ بھارت سے فوجی اتحاد قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر 2010ء

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تک اس میں ناکام رہتا ہے۔ بھارت ان امریکی کوششوں کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتا ہے کیونکہ بھارت کی قومی نفسیات اسے اپنے عظیم طاقت بننے کی راہ میں رکاوٹ تصور کرتی ہے۔ اپنی اہمیت منوانے کے جذبے سے مجبور ہو کر بھارت 2008ء میں ایٹمی تجربات کا ایک نیا سلسلہ شروع کرتا ہے کیونکہ وہ امریکہ سے کسی قسم کے فوجی تعلقات قائم نہیں کرنا چاہتا۔ اپنے تسلط کے خلاف بڑھتے ہوئے جذبات کے مدنظر بھارت اپنی فوجی طاقت میں اضافہ کرتا ہے اور خاص طور پر اپنی بحری طاقت کو مزید بڑھانے کی طرف توجہ دیتا ہے۔

بھارت کے ان ایٹمی تجربات کے نتیجے میں بھارت سے فوجی اتحاد کیلئے امریکہ کی تمام کوششیں ناکام ثابت ہوتی ہیں۔ چونکہ انڈونیشیا کے منتشر ہونے کا عمل بھی ایک خطرہ بن چکا ہے لہٰذا بھارت اور چین علاقائی فوجی تعاون پر غور کرتے ہیں تاکہ تیل کی سمندری گزرگاہیں محفوظ رہیں علاقائی بے چینی پر قابو پایا جاسکے اور دیگر مشترکہ مفادات کا تحفظ ہوسکے۔

بہرحال دونوں اس امر پر متفق ہوتے ہیں کہ امریکہ کو ان خطوں سے بے دخل کردیا جائے جہاں وہ خود حکمرانی کے خواہش مند ہیں۔

دفاعی معاملات میں چین پر امریکا کا عدم اعتماد کتنا گہرا ہے؟ ایشلی ٹیلس کا کہنا ہے کہ ''یہ بڑھتا ہی جارہا ہے۔'' چین میں امریکی مفادات سے اس کا کیا تعلق بنتا ہے؟ ''تنازعہ ابھی حل نہیں ہوا اور آئندہ کافی عرصے تک حل ہوگا بھی نہیں! کیونکہ ابھی تک امریکہ کو یا امریکی مفادات کو چین سے براہ راست کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔''

2014ء میں انڈونیشیا کا شیرازہ بکھر چکا ہے! جس کے نتیجے میں مالدار چینیوں کا قتل عام ہوا ہے۔ علیحدگی پسند باغیوں نے گیس اور تیل کی تنصیبات پر قبضہ کرلیا ہے۔ ''چین اور بھارت کو چھوڑ کر ہر کوئی چاہتا ہے کہ امریکہ آگے بڑھے اور امن و امان کو بحال کردے۔''

2016ء میں امریکی صدارتی انتخابات کے دوران اسلامی عسکریت پسندوں کا ایک چھوٹا گروہ انڈونیشیا کے نزدیک تنگنائے لومبوک سے گزرنے والے امریکی تباہ کن جہاز اور فریگیٹ پر طاقتور میزائلوں کے پے در پے حملوں کے ذریعے امریکہ کو ضرب لگانے پر تلا ہوا ہے۔ 200 سے زائد جہازراں ہلاک ہوجاتے ہیں۔ تمام صدارتی امیدوار امریکی دستوں کو

وطن واپس لانے کا عہد کرتے ہیں اور امریکہ فوری طور پر آپریشنز روکنے کا اعلان کرتا ہے اور امریکی بحری جہازوں کی واپسی کے احکامات جاری کرتا ہے۔

2017ء میں چینی اور بھارتی رہنما بحر جنوبی چین سے امریکی موجودگی کے اخراج کیلئے اپنے مذاکرات میں تیزی پیدا کرتے ہیں جہاں چین اپنا غلبہ مستحکم کرنا چاہتا ہے جہاں بھارت اپنی بالادستی قائم کرنا چاہتا ہے۔ وہ بھارت سے تعاون پر راضی ہوجاتے ہیں اور مشترکہ عمل کا فیصلہ کرتے ہیں۔

تنگنائے ملاکا کی جانب بھارت تیزی کے ساتھ حرکت کرتا ہے اور چین لومبوک اور سنڈا تنگنائے کا کنٹرول سنبھال لیتا ہے اور ان دونوں علاقوں کو بین الاقوامی ٹریفک کے لئے دوبارہ کھول دیتا ہے اور متنازعہ سپریٹلی جزائر اور ناتونا گیس کے ذخائر پر بھی قبضہ کرلیتا ہے۔ بھارتی بحریہ قزاقوں پر سختی کرکے ملاکا تنگنائے کی کمان سنبھال لیتی ہے۔

بشمول جاپان زیادہ تر ممالک چین اور بھارت کی ان کے مشترکہ عمل پر توصیف کرتے ہیں۔ 2017ء اور 2025ء کے درمیان بحرالکاہل اور بحر ہند میں امریکی موجودگی کی واپسی کا عمل ہوتا ہے اور امریکی اتحادی چین اور بھارت کے ساتھ ایک نئی مصالحت پر پہنچتے ہیں۔

''ایشیا کے زیادہ تر حصے کو غالبانہ دائروں میں تقسیم کرلینے کے باوجود چین اور بھارت کے مابین کشیدگی کا خاتمہ ممکن نہیں ہوسکا لیکن وقتی طور پر دونوں کیلئے تعاون مناسب ہے...... نئے چین بھارت آرڈر کا آغاز ہوتا ہے۔''

غور وفکر کا تقاضا ہے کہ اگر امریکا کسی فریق کے ساتھ حکمت عملی پر مبنی اور مشترک ارضی سیاسی مقاصد کیلئے مذاکرات قائم کرتا ہے تو چین بھارت تعاون راہ میں مزاحم ہوسکتا ہے۔ مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ''منطقی طور پر بھارت زیادہ موزوں انتخاب ہوسکتا ہے۔''

مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ امریکہ کو اپنی سخت غیر ثمر بار پالیسی پر نظرثانی کرنے کی ضرورت ہوسکتی ہے کیونکہ چند ریاستیں مثلاً بھارت جو کہ ایٹمی ہتھیاروں کی مالک ہے امریکی قومی سلامتی کے اہداف میں معاون ہوسکتی ہیں۔ مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ''منتخبہ ثمر آور مقاصد اور علاقائی موجودگی کے درمیان امریکہ کو نقصان کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے۔''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ان کا چیئرمین ہمارا چیئرمین ہے۔

یہ خیالی منظرنامہ اس حقیقت سے پردہ اٹھاتا ہے کہ چین کا بنیادی مقصد آخر کار ایشیا پر اپنا تسلط قائم کرنا ہے۔ چین خواہ طاقتور ہو یا اپنے اندرونی معاشی اور سیاسی مسائل کے سبب نسبتاً کمزور ہو جائے' اس کے بنیادی مقصد پر اس کا مطلق اثر نہیں ہوتا۔ چنانچہ بیجنگ نے تہیہ کر رکھا ہے کہ وہ تائیوان' ساؤتھ چائنا سی اور سینکا کو جزائر پر اپنا کنٹرول قائم رکھے گا۔ 2025ء سے بہت پہلے' چین مشرقی ایشیا پر اپنا موثر کنٹرول قائم کرلے گا اور جنوب مشرقی ایشیا بھی اس کا حلقہ بگوش بن چکا ہوگا۔ 2000 سے 2015ء تک چین ساؤتھ چائنا سی میں اپنی فوجی موجودگی میں اضافہ کرنے کی غرض سے وہاں متعدد بحری اڈے قائم کرلے گا۔ ''آسیان'' چینی توسیع پسندی کے خلاف کسی اجتماعی اقدام میں ناکام رہے گی۔ یہ رپورٹ واضح طور پر کہتی ہے کہ اس کے بعد چین عارضی طور پر' بڑی چالاکی کے ساتھ بحر ہند اور جنوبی ایشیا پر بھارتی حکمرانی کو تسلیم کرلے گا۔ ایک اور منظرنامہ' جس کا عنوان ہے ''چین حرکت میں آتا ہے'' چین اور امریکہ کے مابین ایک بھرپور بحری جنگ کا نظارہ پیش کرتا ہے جس میں امریکہ کو بھاری جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ یہ بحری جنگ 2015ء میں جاپان اور کوریا میں انتہا پسند قوم پرستوں کی جانب سے امریکہ کی موجودگی کے خلاف کئے جانے والے احتجاجی مظاہروں اور دہشت گردی کے نتیجے میں امریکہ کی دست برداری کے بعد ہوتی ہے۔ امریکی بحری افواج کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے اور امریکی عوام' مشرقی ایشیا سے اپنی افواج کی واپسی کی حمایت کرتے ہیں' چین ایشیا میں امریکی عدم موجودگی کے باعث فائدہ اٹھاتے ہوئے کئی اقدامات کرتا ہے۔

بھارت' امریکی دست برداری کو ایشیا میں اپنی روایتی حیثیت اور مقام کو بلند کرنے کا ایک موقع گردانتا ہے۔ وہ تیز رفتاری کے ساتھ اپنی بحریہ کی طاقت اور استعداد میں اضافہ کرتا ہے۔ جاپانیوں کی طرح بھارت بھی نئے دفاعی تعلقات کیلئے ہر وقت تیار ہے تا کہ علاقے کی سلامتی کے معاملات پر اپنے سفارتی کردار میں اضافہ کرسکے۔ بالخصوص خلیج

فارس میں یہاں بھارت کا کردار ضرور بڑھا ہے تاہم وہ چین کے دفاعی اور فوجی مفادات کے ماتحت ہے۔

ان منظرناموں سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ بھارت امریکہ کی فوجی حکمت عملی کے حوالے سے بے حد اہم کردار کا حامل ہے اور علاقے کی ایک بڑی طاقت کی حیثیت سے ابھر سکتا ہے۔

اس رپورٹ کی تیاری میں مندرجہ ذیل افراد اور اداروں نے حصہ لیا۔

* چیئرمین: ایس اینڈرز ومبش' ہکس اینڈ ایسوسی ایٹس
* لیفٹیننٹ کرنل (یو ایس ایم سی) سی شیل' بروکر ایچ کیو ایم سی' پی پی اینڈ او
* وکٹر چا' جارج ٹاؤن یونیورسٹی
* نکولس ایبر اسٹیٹ' امریکن انٹرپرائز انسٹی ٹیوٹ
* ایرن فرائڈ برگ۔ پرنسٹن یونیورسٹی
* گراہم فلر: رینڈ کارپوریشن
* اسٹیورٹ گولڈ: سائنس ایپلیکیشن انٹرنیشنل کارپوریشن'
* کیپٹن (یو ایس این) کارل ہسلنگر او ایس ڈی/نیٹ۔ اسسمنٹ
* جولی اے میکڈونلڈ: ہکس اینڈ ایسوسی ایشن
* راجن مینن: لی ہائی یونیورسٹی
* میجر (یو ایس اے) تھامس جے موفیٹ' نیشنل گراؤنڈ انٹیلی جنس سینٹر
* راس ایچ منرو۔ سینٹر فار سیکورٹی اسٹڈیز
* ابرام شلسکی: کنسلٹنٹ
* جارج کے ٹینہم: رینڈ کارپوریشن
* ایشلی ٹیلس: رینڈ کارپوریشن

اکتوبر 2000ء

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پس چہ باید کرد

اقوامِ متحدہ کی سیکورٹی کونسل نے لازمی دفعہ کے تحت افغانستان کی طالبان حکومت کے خلاف شدید پابندیوں کا ریزولیوشن پاس کیا اور اُس پر عمل درآمد شروع ہو گیا ہے۔ ان پابندیوں کا اطلاق ناردرن الائنس (احمد مسعود اور اُس کے ساتھیوں) پر نہیں کیا گیا۔ ان پابندیوں کے تحت کھانے پینے کی اشیاء اور دواؤں وغیرہ کے علاوہ اقوامِ متحدہ کا کوئی ممبر ملک طالبان حکومت سے کسی اور قسم کے سامان کی تجارت سے متعلقہ لین دین نہیں کر سکتا' اسلحہ وغیرہ مہیا نہیں کر سکتا۔ یہ پابندی ناردرن الائنس کو اسلحہ پہنچانے پر نہیں ہے۔ اب یوں ہو گا کہ امریکہ' روس' ہندوستان اور دوسرے ممالک ناردرن الائنس کو ڈھیروں اسلحہ پہنچائیں گے اور طالبان اس قسم کے اسلحہ کے حصول سے محروم رہیں گے۔ عام آدمی شاید یہ سمجھ رہا ہو کہ یہ کارروائی صرف طالبان کے خلاف ہے اور امریکہ کی زیرِ سرپرستی طاغوتی طاقتیں افغانستان سے ان کی حکومت ختم کرنا چاہتی ہیں۔ یہ بات بھی ہے لیکن ان پابندیوں کا اصل ہدف پاکستان ہے۔ مغربی دنیا اپنے اور یہودی مفادات کی وجہ سے پاکستان کا ایٹمی طاقت بنے رہنا برداشت نہیں کر سکتی۔ ہماری بات نوٹ کر لیجئے کہ اب استعماری طاقتوں کا اگلا قدم یہ ہو گا کہ وہ زیادہ سے زیادہ 3/4 ماہ کے بعد پاکستان سے کہیں گے کہ طالبان کو پاکستان سے اسلحہ سپلائی ہو رہا ہے اور پاکستان کی حکومت اسلحے کی اس سمگلنگ کو روکنے میں ناکام ہوئی ہے۔ اس لئے اقوامِ متحدہ مجبور ہو گئی ہے کہ وہ بین الاقوامی فوج پاکستان اور افغانستان کی سرحد پر تعینات کرے۔ سلامتی کونسل لازمی دفعہ کے تحت ریزولیوشن پاس کرے گی اور یوں ایک بین الاقوامی فوج پاکستان اور افغانستان کی سرحد پر تعینات کر دی جائے گی۔ یقین کیجئے اس فوج کا اصل مقصد پاکستان کی ایٹمی صلاحیت کو ختم کرنے کی کارروائیاں کرنا ہو گا۔ طالبان کی حکومت کا خاتمہ ایک ثانوی ایجنڈا ہے۔ یہ طالبان وہی تو ہیں جن کو امریکہ مجاہدین

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے لقب سے پکارتا رہا' امداد کرتا رہا اور طالبان حکومت بنوانے میں ظاہراً نہیں تو در پردہ امریکی کوششیں مددگار رہیں۔ ہم پاکستانی قوم تصورات میں زندہ رہنے کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ایسا ہمیں ملک کے حکمرانوں نے بنایا ہے۔ حقائق سے گریز اور ناممکن الحصول کامرانیوں کی بشارتیں ہماری من بھاتی خوراک رہی ہیں۔ ہمیں طفل تسلیوں میں رکھا جائے گا اور کہا جائے گا کہ گھبرانے کی بات نہیں اور عوام الناس کو پروپیگنڈے کے زور پر یقین دلا دیا جائے گا کہ چین پاکستان مخالف ایسے ریزولیوشن کو ویٹو کردے گا اور قوم کو پھر خواب خرگوش میں مگن کردیا جائیگا۔ لیکن محترم قارئین اب شاید ایسا نہ ہوسکے۔ اگر ایسا ہونا یقینی ہوتا تو چین طالبان مخالف ریزولیوشن کو بھی ویٹو کرسکتا تھا۔ چینی ہم سے زیادہ سمجھدار اور دُوربین لوگ ہیں وہ ہم سے زیادہ بہتر جانتے تھے کہ یہ ریزولیوشن دراصل پاکستان کے خلاف ہے۔ علاوہ ازیں ایک ایسے ریزولیوشن کو جو ایک فریق کے خلاف ہو اور دوسرے کو مدد دیتا ہو ویسے ہی ہر اخلاقی اور انسانی پہلو سے ظلم سمجھا جاتا ہے اور طرفہ تماشا یہ کہ یہ ریزولیوشن اس فریق کے خلاف ہے جو افغانستان کے 95 فیصد رقبے پر حکومت کررہا ہے اور دنیا کے ہر قانون کے مطابق اسے جائز حکومت تسلیم کیا جانا چاہیے۔

اس قسم کے ناانصافی پر مبنی ریزولیوشن کو اگر چین ویٹو نہیں کرتا تو یہ یقین کرنا زیادتی اور شاید بے وقوفی ہو کہ چین بین الاقوامی فوج ڈپلائے کرنے والے ریزولیوشن کو ویٹو کردے گا۔ محترم قارئین یقین کرلیجئے کہ آنے والے چند ماہ پاکستان کیلئے اتنے اہم ہیں کہ اُن کی گھمبیر صورت حال کو بیان کرنے کیلئے ہمیں الفاظ بھی نہیں مل رہے۔ پاکستان پر پڑنے والے دباؤ اور کسے جانے والے شکنجے کا سوچ کر ہی ہول آتا ہے۔ اس طرح کے حالات کا مقابلہ وہ قومیں جو زندہ رہنا چاہتی ہوں' کرتی ہیں لیکن یہ مقابلہ خالی خولی تقریروں سے نہیں ہوسکتا۔ یہ کہہ دینے سے کہ کوئی ہماری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا نہ تو تسلی بخش بات ہے اور نہ ہی اس طرح مستقبل میں ہونے والے ناقابلِ تلافی نقصان سے بچا سکتا ہے۔

اس موقع پر پاکستان کیلئے دو آپشن ہیں یا تو جیسا کہ ہم امریکہ کی پاکستان سے ڈیمانڈ کے متعلق قارئین کو مسلسل بتاتے چلے آرہے ہیں۔ پاکستان اپنی ایٹمی صلاحیت ختم

کردے' فوج کم کردے۔ افغانستان میں ظاہر شاہ کو بادشاہ بنوادے۔ لائن آف کنٹرول کو بین الاقوامی سرحد تسلیم کرے۔ ہندوستان کی غلامی قبول کرلے اور ہندوستان اور پاکستان کے درمیان سرحد کھول دے یا پھر پاکستان ان شرائط کو ماننے سے انکار کردے اور استعماری طاقتوں کا مقابلہ کرنے کیلئے تیار ہوجائے۔ یاد رہے کہ استعماری طاقتوں سے مقابلہ کوئی آسان کام نہیں۔ مقابلہ کرنے کیلئے

1- ملک و قوم کو اقتصادی طور پر اس قابل ہونا چاہیے کہ وہ شدید ترین پابندیوں کے باوجود اپنے لئے کم از کم ضروری اشیاء مہیا کرنے کے اہل ہو۔

2- بیرونی حملوں کی صورت میں پوری قوم کٹ مرنے کیلئے تیار ہو۔

3- قوم ایک سیسہ پلائی دیوار کی طرح متحد ہو۔ سیاسی' مذہبی' علاقائی اور لسانی اختلافات پس پشت ڈال دیئے جائیں۔

ہمیں یقین ہے کہ پاکستانی قوم چند مغرب زدہ' دانشوروں اور لبرل ازم کے مارے ہوئے افراد کو چھوڑ کر' یہ شرائط ماننے کیلئے ہرگز تیار نہیں اور یہ شرائط کسی صورت مانی بھی نہیں جانی چاہئیں۔ ہمیں مقابلہ کرنا ہوگا لیکن آیئے دیکھیں کہ اس مقابلے کیلئے جو بنیادی لوازمات اوپر بیان کئے گئے ہیں انہیں ہم کس حد تک پورا کرسکتے ہیں۔ کیونکہ مقابلہ حقائق کو سامنے رکھ کر کیا جاتا ہے۔ آیئے دیکھیں کہ ہم میں کون سی خامیاں ہیں یا کمی ہے جس کو دور کرنا ضروری ہے۔ یہ مقابلہ کتنے عرصے جاری رہ سکتا ہے یہ سمجھنا بھی ضروری ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنا ہوگا کہ مقابلے نعروں اور تقریروں سے نہیں ہوسکتے۔ ٹھوس' جامع اور سوچے سمجھے اقدامات ہی کسی تسلی بخش نتیجہ کا باعث بن سکتے ہیں۔ آیئے دیکھیں کہ ان چند ضروری مبادیات کے سلسلے میں ہم کہاں کھڑے ہیں جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

1- اقتصادی طور پر ملک تباہی کے کنارے پر کھڑا ہے۔ کم از کم 40 فیصد لوگ غربت کی کم از کم سطح سے بھی نیچے ہیں۔ غربت کے ہاتھوں تنگ آئے ہوئے بے شمار ماں باپ مع اپنے بچوں کے خودکشیاں کررہے ہیں۔ لوئر مڈل کلاس اور مڈل کلاس طبقہ تقریباً آخری سانسوں پر ہے۔ دوسری طرف چند لاکھ افراد اور خاندان ہیں' جن

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے پاس دولت حد وشمار سے بھی زیادہ ہے۔ سڑکیں بڑی بڑی گاڑیوں سے بھری ہوئی ہیں۔ خدا خوفی اور حب الوطنی سے عاری یہ چند لاکھ گھرانے کروڑوں سسکتی آہوں کو سنی ان سنی کرتے عیش وعشرت میں مصروف ہیں۔ لوٹ مار کا بازار گرم ہے۔ بے گناہ معصوموں کو پولیس مقابلوں کے نام پر قتل کر دیا جاتا ہے اور اربوں کھربوں لوٹنے والے اژدھوں کو قانونی ثبوت نہ ملنے کے بہانے بنا کر رعائتیں دے دی جاتی ہیں اور آخر کار سزا یافتہ بھی چھوڑ دئے جاتے ہیں۔ بدقماش بدکردار اور کرپٹ حکمرانوں نے قوم کا بال بال بیرونی اور اندرونی قرضوں میں جکڑ دیا ہے۔ جہاں اکثریت کو ایک وقت کی روٹی کے بھی لالے پڑے ہوں وہاں غیر ملکی یورشوں کا مقابلہ کرنے کی اہلیت کہاں سے آئے گی؟

2- صرف یہ حقیقت حوصلہ دیتی ہے کہ استعماری ایجنڈوں' کرپشن کے استادوں' ذہنی غلامی میں مبتلا دانش وروں اور لبرل ازم کے شیدائی چند بے غیرتوں کے سوا پوری پاکستانی قوم امریکی شرائط ماننے کیلئے تیار نہیں ہے۔ قوم کٹ مرنے پر تیار ہے لیکن ہندو کی غلامی اُسے کسی صورت قبول نہیں۔ قوم کی یہ اجتماعی کیفیت پاکستان کا مایہ ناز اثاثہ ہے۔

3- پاکستانی قوم ہر آڑے وقت میں ایک سیسہ پلائی دیوار کی طرح متحد ہونے کا ثبوت دیتی آئی ہے لیکن اب سیاسی' مذہبی' علاقائی اور لسانی تعصبات خودغرض حکمرانوں اور غلامی پسند دانش وروں نے پورے ملک میں اس طرح پھیلا دیئے ہیں کہ بیک وقت عوام پاکستان پر کٹ مرنے کیلئے بھی تیار ہیں اور ساتھ ہی سیاسی' مذہبی' علاقائی اور لسانی گروپوں میں بھی بٹ چکے ہیں۔ یہ صورت حال ایک لمحہ فکریہ ہے۔ ان حالات میں پوری قوم چاہتے ہوئے بھی شاید اُس حد تک قربانیاں دینے کیلئے متحد نہ ہو سکے' جس کی ضرورت ہے۔ سیاسی پارٹیوں کی بھرمار ہے' جن کو بڑی سیاسی پارٹیاں کہا جا رہا ہے ان کے پاس قربانی دینے والے ورکرز نہیں۔ بہت سی پارٹیاں چھوٹی تو ہیں لیکن ان کے پاس قربانی دینے والے ورکرز موجود ہیں۔ لاتعداد

پارٹیاں ایسی ہیں جو صرف اپنے عہدیداروں پر ہی مشتمل ہیں۔ ہر پارٹی کا اپنا ڈھول' اپنے نعرے' اپنی چیخیں' کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی۔ افواج ملک کیلئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے سیاسی مسخرے اُسے بھی متنازعہ بنانے میں جتے ہوئے ہیں۔ ہر پارٹی کہتی ہے کہ اُسے حکومت دے دی جائے۔ ناممکن الحصول دعوے کرتے ہوئے کسی کو شرم نہیں آتی۔ ان حالات میں یہ سوچنا کہ قوم بیرونی دباؤ اور بندشوں اور حملوں کا مقابلہ کر سکے گی۔ ہمارے نزدیک خام خیالی ہے۔

ان حالات میں کیا کرنا چاہیے۔ کیا کچھ تیاریاں ہونی چاہئیں۔ قوم کو کیا اقدامات کرنے چاہئیں۔ ان معاملات پر غور و فکر بے حد ضروری ہے۔ ہم اپنی گزارشات یہ سمجھتے ہوئے پیش کرنے کی جسارت کر رہے ہیں کہ ملک دشمن اور حُب الوطنی سے عاری چند لوگوں کو چھوڑ کر سیاسی لوگ' بیوروکریٹس' مذہبی علماء' علاقائی اور لسانی مسائل کا ذکر کرنے والے محبت وطن ہیں اور وہ تحفظِ پاکستان کیلئے اُتنی ہی قربانیاں دینے کیلئے تیار ہیں۔ جتنی دوسرے عام پاکستانی' استعماری طاقتیں آئندہ چند مہینوں میں پاکستان کو زبردست شکنجے میں جکڑنے کا فیصلہ کئے بیٹھی ہیں۔ زبردست تیاریاں ہو رہی ہیں۔ شترمرغ کی طرح آنکھیں بند کر لینے سے پاکستان کو لاحق شدید خطرات ختم نہیں ہو جائیں گے۔ ہمیں عام طریقوں سے ہٹ کر انقلابی اقدامات کرنے ہوں گے۔ وقت تھوڑا ہے اور کام زیادہ۔ ہمیں فی الفور درج ذیل تیاریاں شروع کر دینی چاہئیں۔

1- دس سال یا کم از کم پانچ سال کیلئے تمام سیاسی پارٹیوں پر پابندی لگا دی جائے اور ملک وقوم کو تباہ کن پارٹی پالیٹکس سے بچا لیا جائے۔ ہمیں یقین ہے کہ سیاسی پارٹیوں کے ذمہ دار ملک وقوم کو درپیش گمبھیر مسائل سے آگاہ ہیں اور ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ہر اُس لیڈر یا کارکن جس میں رتی بھر حُب الوطنی موجود ہوگی۔ وہ ملک وقوم کو درپیش ان نازک حالات میں پارٹی سیاست چھوڑ کر فلاحی اور تعمیری کارروائیوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں مصروف ہو جانے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرے گا۔ ملک وقوم کو محفوظ بنا لینے کے بعد ہی پارٹی پالیٹکس کی گنجائش نکل سکتی ہے۔

-2 چیف ایگزیکٹو کی قیادت میں فوجی حکمران خود غرض بیوروکریٹس اور کتابی مشیروں کی گرفت سے باہر نکلیں اور باصلاحیت افراد پر مشتمل مرکزی اور صوبائی حکومتیں تشکیل دیں۔ ایسا کرتے وقت معیار صرف اور صرف اہلیت ہو۔ یہ نہ دیکھا جائے کہ کس کا تعلق کس پارٹی سے ہے۔ بیوروکریٹس کا عمل دخل پالیسی بنانے کے معاملات سے بالکل نکال دیا جائے۔ یہ لوگ اگر کوئی اچھا کام کرنے کے اہل ہوتے تو ملک آج اِس حال میں نہ ہوتا۔ پچھلے 53 سال سے یہی لوگ پالیسیاں بنا رہے ہیں۔ اصل میں یہ کام ان کا ہے ہی نہیں۔ ان کا کام تو پالیسیوں پر عمل درآمد کروانا ہے۔ پالیسیاں بنانا نہیں۔ وزراء مشیر اور گورنر وہ لوگ لئے جائیں جو اپنے اپنے فیلڈ میں ماہر ہوں۔ قابلِ عمل منصوبوں کا ادراک رکھتے ہوں اور اس قابل ہوں کہ اپنی ماتحت بیوروکریسی کو درست سمت میں متحرک کر سکیں۔ یہ کام حقیقی ماہرین کر سکتے ہیں۔ جو حکمران' گورنر، وزراء اور مشیر بیوروکریٹس سے رہنمائی لے کر بیان دیتے ہوں۔ وہ تباہی اور بربادی کے سوا کسی اچھے نتیجے کا باعث نہیں بن سکتے۔ فوج کے لوگوں کو سول معاملات سے فی الفور نکال لیا جائے۔ آنے والے وقت میں اُن کی ضرورت اُن کے پیشہ وارانہ فرائض کیلئے درکار ہوگی۔

-3 سیاسی جماعتوں کی طرح تمام مذہبی جماعتوں پر بھی دس یا پانچ سال کیلئے پابندی لگا دی جائے۔ علماء کرام کو اتحادِ اُمت کے کام میں لگا دیا جائے۔ فرقہ وارانہ تقاریر روک دی جائیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے ملک کی مذہبی قیادتیں ملک وقوم کو درپیش ان نازک حالات میں ہماری ان گزارشات کو خوشی سے قبول کر لیں گی۔

-4 ریونیو بورڈ، وزارت خزانہ اور اقتصادی امور کے آزمائے ہوئے گرگوں کو فی الفور فارغ کر دیا جائے۔ یہ لوگ 53 سال سے سلائیڈز اور چارٹ دکھا دکھا کر حکمرانوں اور عوام کو الو بناتے آ رہے ہیں۔ کیا ان میں کوئی ایک بھی ایسا ہے جس نے آج تک کوئی معمولی سا کارنامہ انجام دیا ہو۔ علاوہ ازیں ریٹائرڈ بیوروکریٹس کو کسی حالت

میں بھی ملازمت میں نہ رکھا جائے۔ ان میں سے کسی کو بھی وزیر مشیر اور گورنر نہ بنایا جائے۔ یہ لوگ چاپلوسی اور فنِ خوشامد میں اتارو ہیں۔ ریٹائر ہو کر دوبارہ ملازمت ان کیلئے صرف ایک ہابی ہوتی ہے اور کچھ نہیں۔ یہ صرف پوزیشن سے حاصل ہونے والی آسائشوں پر مرتے ہیں اور کسی کام کے نہیں ہوتے۔

-5 اوپر بتائے گئے اقدامات کیلئے ملک میں ایک Consensus ڈویلپ کرنا ہوگا اور اس کیلئے سیاست دانوں کی ایک گول میز کانفرنس بلائی جائے اور تمام سیاست دانوں کو حقیقی صورت حال سے واقف کر کے اُن کی رضامندی حاصل کی جائے اور اُن پر مشتمل ایک قومی کونسل اور صوبائی سطح پر صوبائی کونسلیں بنا دی جائیں اور ملک کو درپیش مسائل خصوصاً اقتصادی امور کیلئے سیاست دانوں کو ٹاسک دے دیئے جائیں کہ وہ عوام کو اپنی انفرادی حیثیتوں میں ان سے آگاہ کریں۔ مذہبی ہم آہنگی اور امن کیلئے بھی مذہبی علماء کی قومی اور صوبائی کونسلیں ہوں۔ علاقائی اور لسانی قیادتوں کی بھی قومی کانفرنسیں ہوں اور مسائل کو افہام وتفہیم سے حل کر لیا جائے۔

جہاں تک ملک وقوم کو درپیش اقتصادی مسئلے کا تعلق ہے ہم مسلسل لکھتے آ رہے ہیں اور تفصیلاً ان کا حل بھی پیش کرتے رہے ہیں۔ خواہش مند حضرات میری کتاب "حکمرانوں کے کرتوت" یا سپوتنک کے سابقہ شماروں میں یہ گزارشات پڑھ سکتے ہیں۔

خدا کرے کہ مری ارض پاک پر اُترے
وہ فصل گل جسے اندیشۂ زوال نہ ہو
(احمد ندیم قاسمی)

ایک دفعہ ملک کو سیاسی اور معاشی طور پر مستحکم کر لیں' پھر سیاست دانوں کو سیاست کرنے کیلئے کھلا میدان حاصل ہوگا۔ جانکنی کے عالم میں آپس کی لڑائیاں مہلک ہوتی ہیں۔

فروری 2001ء

www.iqbalkalmati.blogspot.com

امریکی پلان پر عملدرآمد کی مہم

جیسا کہ ہم مسلسل لکھتے چلے آ رہے ہیں کہ ایک بہت ہی سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق مہم چلائی جا رہی ہے اور عملی اقدامات کیے جا رہے ہیں تا کہ امریکی پلان پر عمل درآمد کی راہ ہموار کی جا سکے۔ امریکی پلان کیا ہے۔ ہم تفصیلاً لکھ چکے ہیں۔ مختصراً یہ کہ پاکستان کشمیر کو بھول جائے' فوج کم کر دے' افغانستان میں ظاہر شاہ کو بادشاہت واپس دلائے' ہندوستان کے ساتھ پاکستان کی سرحد آزادانہ تجارت کیلئے کھول دی جائے۔ پاکستانیوں کو ہندوستان میں اور ہندوستانیوں کو پاکستان میں صنعتی اور تجارتی کاروبار کرنے کی مکمل آزادی ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پاکستان ہندوستان کو اس علاقے کی ایک بڑی طاقت مان کر اُس کی غلامی میں چلا جائے اور ایٹمی صلاحیت کو مکمل طور پر ختم کر دیا جائے۔ اس پلان پر عمل درآمد کیلئے عرصے سے کوششیں ہو رہی ہیں لیکن پاکستان کے محبِ وطن عوام لا متناہی قربانیوں اور اللہ پاک کی رحمت و برکت کے نتیجے میں قائم ہونے والے ملک کو ہندو کی غلامی میں دینے پر تیار نہیں ہیں۔ کوششیں تو پہلے سے جاری تھیں لیکن 1988ء کے بعد قائم ہونے والی اور خاص طور پر نام نہاد سیاسی حکومتیں اسی امریکی مقصد کے حصول کی کچھ زیادہ ہی خواہش مند رہی ہیں۔ چونکہ عوام اِس سازش کی کامیابی میں رکاوٹ تھے اِس لئے مسلسل کوششیں کی گئیں کہ ملک کے اقتصادی' سیاسی اور معاشرتی حالات اِس قدر ابتر کر دیئے جائیں کہ لوگوں کو روٹی اور جان کے لالے پڑ جائیں اور لوگوں کی اِس کس مپرسی کے حالات میں امریکی پلان پر عمل درآمد کر لیا جائے۔

اقتصادیات کے ضمن میں یہ بات یاد رکھئے کہ 1988ء میں پاکستان پر کل غیر ملکی قرضے حکومتی ارشاد کے مطابق 12 ارب ڈالر کے تھے جو بڑھ کر 1999ء میں 38 ارب ڈالر ہو گئے۔ یہ اعداد و شمار حکومتی ہیں' اصل میں اگر اُن قرضوں کو بھی شامل کر لیا جائے جو نیم سرکاری اداروں کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

طرف سے اور کیش گرانٹوں کی شکل میں حکومت کی طرف سے واجب الادا ہیں تو قرض 60 ارب ڈالر سے زیادہ ہو جاتا ہے۔ یہ قرضے کیوں لئے گئے؟ اور تھوڑے بہت غیر پیداواری منصوبوں پر خرچ کر کے باقی تمام کے تمام کیوں خرد برد کر لئے گئے۔ اگر یہ بات پاکستان کے محب وطن عوام سمجھ جائیں تو ایک ایک امریکن ایجنٹ کھل کر سامنے آجائے اور وہ سازش بھی پوری طرح عیاں ہو جائے جو امریکی پلان پر عمل درآمد کیلئے کی گئی ہے۔

اصل میں سازش کی بنیاد اس محاورے پر رکھی گئی ہے کہ "بھوک کی مار سب سے بڑی مار ہوتی ہے۔" اگر پیٹ میں ضروری غذا پہنچ رہی ہو تو آدمی کوئی غلط کام نہیں ہونے دیتا۔ ایسا آدمی ملک دشمن اقدامات پر کیسے خاموش رہے گا۔ لیکن اگر وہی آدمی بھوک کا شکار ہو اور نیم مردہ حالت میں پڑا سسک رہا ہو تو وہ چاہتے ہوئے بھی غلط کاموں اور ملک دشمن کارروائیوں کے راستے میں رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ یہی سازش پاکستان کے خلاف کی گئی ہے اور اس پر عمل بھی بڑی سرعت سے کیا گیا ہے۔ ملک پر اتنے بھاری قرضوں کا بوجھ ڈال دیا گیا ہے کہ جس کا سود بھی ملک ادا کرنے کے قابل نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ملک کی پوری آمدنی قرضوں کا سود بھی ادا نہیں کر سکتی۔ حکومت چلانے اور قومی مصارف کیلئے رقوم کہاں سے آئیں گی۔ ظاہر ہے اور قرض لینا پڑے گا۔ بین الاقوامی مالیاتی اداروں اور استعماری طاقتوں کی اور شرائط ماننی پڑیں گی' جن کا مقصد عوام الناس کے ہاتھ سے روٹی چھین لینے کے سوا کچھ نہیں۔ یہ مالیاتی ادارے امریکن پلان پر عمل درآمد کرانے میں جتے ہوئے ہیں تا کہ لوگ بھوک اور غربت کے عذاب میں اِس حد تک جکڑ دیئے جائیں کہ وہ خود خواہش کرنے لگیں کہ امریکی پلان پر عمل جلد از جلد مکمل ہو تا کہ اُن کے پیٹ میں کچھ جا سکے۔ دُنیا میں اور ممالک بھی قرضے لیتے ہیں لیکن اِن قرضوں کو ایسے منصوبوں پر خرچ کرتے ہیں جو مکمل ہو کر لوگوں کو روزگار دلانے کا باعث بنتے ہیں اور جن سے اتنا منافع بھی ہوتا ہے' جس سے قرضہ بھی ادا ہوتا رہتا ہے اور ملک کو منافع رہتا ہے۔ جو دوسری حکومتی ضروریات کے کام آتا ہے۔ لئے گئے قرضوں میں سے ایک بھی ایسا بتا دیجئے جو کسی پیداواری منصوبے پر خرچ کیا گیا ہو اور جس سے کوئی آمدنی ہوتی ہو' اُلٹا اِن منصوبوں کو

آپریٹ کرنے کیلئے حکومتی خزانے سے پیسے ادا کرنے پڑتے ہیں' جو نئے ٹیکس لگا کر اکٹھے کئے جاتے ہیں۔ وہ لوگ جو اس طرح کے قرضے لینے کے ذمہ دار ہیں اور تھوڑا بہت قرضہ غیر پیداواری منصوبوں پر خرچ کرنے کے ساتھ ساتھ باقی سارا خرد برد کر چکے ہیں' کیا وہ کسی معافی کے مستحق ہیں؟ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ وہ آج بھی بڑے بڑے عہدوں پر موجود ہیں اور کسی کی مجال نہیں کہ اُن سے جواب طلبی بھی کر سکے۔ یہ اِس لئے کہ وہ سب امریکی پلان کو کامیاب بنانے کی سازش میں شریک ہیں اور امریکہ اپنے ایجنٹوں کی حفاظت کرنا جانتا ہے۔

بہت سے لوگ ہم سے پوچھتے ہیں کہ جب حکومت کو پتہ ہے کہ غربت انتہا کو پہنچ چکی ہے' لوگ دانے دانے کے محتاج بن چکے ہیں' خودکشیاں ہو رہی ہیں' لوگ پورے پورے خاندان کو مار کر مر رہے ہیں' تو حکومت ضروریات زندگی کی قیمتوں میں اضافے پر اضافہ کیوں کئے جا رہی ہے اور ٹیکسوں میں مسلسل اضافہ کیوں کر رہی ہے۔ کاش کہ ہمارا پرنٹ میڈیا جو مکمل آزاد ہونے کے نعرے لگا رہا ہے' لوگوں کو حکومتی کاموں کے پس منظر اور پیش منظر سے آگاہ کرتا تا کہ لوگوں کو ان سوالوں کا جواب مل جاتا۔ لیکن ایسا نہیں ہو رہا۔ اصل میں معاملہ یوں ہے کہ پاکستان کو جیسا کہ اُوپر بتایا گیا ہے اس قدر بھاری قرضوں میں جکڑ دیا گیا ہے کہ ملک فی الحقیقت دیوالیہ ہونے کے دہانہ پر ہے۔ ہمیں قرضوں کی ادائیگی کیلئے ہی نہیں حکومتی معاملات چلانے حتیٰ کہ تنخواہیں دینے کیلئے بھی قرضے لینے پڑتے ہیں۔ چونکہ امریکی پلان کو کامیاب بنانے کیلئے ابھی ہمارا گلا اور دبانے کی ضرورت ہے اس لئے ظالمانہ شرائط عائد کی جاتی ہیں۔ ہمارے پالیسی ساز چونکہ استعماری ایجنٹ اور اس سازش میں شریک ہیں وہ ان شرائط کو ماننا مجبوری بتا کر عوام کو گمراہ کرتے چلے آ رہے ہیں لیکن مثال کے طور پر دیکھئے کہ بین الاقوامی مالیاتی اداروں نے نیا قرض دینے اور پچھلے قرضوں کی قلیل المدتی Re-Scheduling کیلئے اور شرائط کے علاوہ یہ شرط بھی عائد کی کہ بجٹ میں خسارہ 5 فیصد سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے ورنہ قرضہ نہیں ملے گا۔ بجٹ خسارے کو 5 فیصد تک رکھنے کیلئے ضروری تھا کہ آمدن کا تخمینہ کم از کم 450 ارب روپے ہو۔ لہٰذا بجٹ میں 450 ارب روپے آمدنی رکھ دی گئی جو پچھلے سال کی آمدنی' پاکستان میں کاروبار کی زبوں حال اور نئے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کاروباری اداروں کے قائم ہونے کی عدم موجودگی کی وجہ سے ناممکن الحصول ٹارگٹ تھا' پھر نالائق اور امریکی سازش میں شامل نام نہاد "معاشی اور ٹیکس ماہرین" نے بے فائدہ سرووں کا طویل چکر چلا کر کاروباری لوگوں کو اس قدر خوف زدہ کر دیا کہ بے شمار لوگ اپنے اثاثے لیکر بیرون ملک نقل مکان کر گئے۔ بے شمار کاروبار بند ہو گئے' صنعتیں بند ہو گئیں' اب تھوڑی سی عقل رکھنے والا آدمی بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ جب پچھلے سال آمدنی 350 ارب کے قریب تھی تو اس سال کاروباری زبوں حالی اور سرمائے کے فرار کے بعد 450 ارب روپے کیسے ہو سکتی ہے' لیکن ہمارے ذمہ دار "ماہرین" بجٹ خسارہ مقررہ شرح پر رکھنے کی شرط مان کر آمدنی 450 ارب بتا چکے ہیں اور اسی بنیاد پر پاکستان کو ورلڈ بینک اور IMF سے کچھ "سہولتیں" ملتی ہیں۔ اس لئے پاکستان کو ہر حال میں آمدنی کا ٹارگٹ پورا کرنا ہے۔ اب ہر تین ماہ بعد پتہ چلتا ہے کہ 450 ارب روپوں کا ٹارگٹ پورا کرنے کیلئے ان تین ماہ میں جو آمدنی ہونی چاہیے تھی اُس آمدنی سے مثلاً 20 ارب روپے کی ہوئی ہے اور اس سے طے شدہ بجٹ میں خسارے کی شرح بڑھ جائے گی تو ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف دباؤ ڈالتی ہے کہ 20 ارب روپے کی آمدنی کے نئے ذرائع تلاش کرو' ورنہ پاکستان کو دی گئی "سہولتیں" ختم کر دی جائیں گی۔ پاکستان کے پالیسی ساز "ماہرین" جو دراصل امریکی ایجنٹ کا کردار ادا کرنے کیلئے پاکستان میں متعین کئے گئے ہیں' مجبوری اور لاچاری کا بہانہ بنا کر اس دباؤ کو مان لیتے ہیں۔ یہ سب "ماہرین" اسلام آباد میں ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں میٹنگ کرتے ہیں تا کہ 20 ارب روپے کی اضافی آمدنی کے ذرائع پیدا کئے جائیں۔ میٹنگ میں انواع واقسام کے کھانے کی چیزیں' سافٹ ڈرنکو' کافی' چائے وغیرہ وافر مقدار میں موجود ہوتی ہے اور "ماہرین" شوق فرما رہے ہوتے ہیں۔ مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ 20 ارب روپے کہاں سے حاصل کئے جائیں۔ اس حوالہ سے کارروائی کچھ یوں ہوتی ہے کہ ایک "ماہر" کہتا ہے کہ اگر بجلی کے بل میں سرکاری ٹیکسوں میں 30 پیسے فی یونٹ اضافہ کر دیا جائے تو 5 ارب کی اضافی آمدنی ہو جائے گی۔ "ماہرین" بیک آواز نعرہ لگاتے ہیں کہ Wonderful ہم تائید کرتے ہیں۔ دوسرا "ماہر" تجویز پیش کرتا ہے کہ اگر گیس کے بلوں میں 50 فیصد اضافہ کر دیا جائے تو حکومت کو حاصل ہونے والے محصولات میں 8 ارب کا اضافہ ہو جائے گا۔ تمام

ماہرین نعرہ لگاتے ہیں کہ یہ ایک اعلیٰ تجویز ہے۔ ہم اس پر صاد کرتے ہیں۔ تیسرا "ماہر" کافی کا گھونٹ بھر کر تجویز پیش کرتا ہے کہ اگر پیٹرول کی قیمت میں فی لیٹر 2 روپے' ڈیزل کی قیمت میں 3 روپے اور مٹی کے تیل کی قیمت میں بھی 3 روپے کا اضافہ کر دیا جائے تو حکومت کو وصول ہونے والے محصولات میں 9 ارب روپے کا اضافہ ہو گا۔ "ماہرین" تالیاں بجانے لگتے ہیں اور تازہ اور گرم گرم کافی لانے کا حکم جاری کر دیتے ہیں۔ 20 ارب کی بجائے 22 ارب کے اضافی محصولات کا بندوبست ہو جاتا ہے۔ زیر بحث مسئلے کا تسلی بخش حل نکل آتا ہے۔ کوئی شریک ماہر کہتا ہے ابھی تو بہت سی مدیں ایسی باقی ہیں جن سے اضافی آمدنی حاصل کی جا سکتی ہے۔ تو دوسرے بول اٹھتے ہیں کہ وہ اگلی میٹنگ میں کریں گے جو تین ماہ بعد بجٹ میں تعین شدہ آمدنی میں کمی کو پورا کرنے کیلئے بلائی جائے گی۔ ان میٹنگوں میں ایک اور طریقہ بھی اختیار کیا جاتا ہے' مثلاً یوں ہو سکتا ہے کہ سوئی گیس پر اُٹھنے والے اخراجات اور کمپنی کا منافع جمع کر کے جتنی رقم بنتی ہے اُتنے ہی اُس پر سرکاری محصول لگے ہوتے ہیں۔ مثلاً فرض کریں اخراجات اور منافع 50 فیصد بنتے ہیں اور محصولات باقی 50 فیصد۔ اب ہوتا یوں ہے کہ ارادہ تو 40 فیصد محصول لگانے کا تھا لیکن لوگوں کو بے وقوف بنانے کیلئے اور یہ شو کرنے کیلئے کہ حکومت کو عوام کا بہت خیال ہے محصول 50 فیصد لگا کر ساتھ ہی اعلان کر دیا جاتا ہے کہ 10 فیصد سبسڈی دی جائے گی۔ لہٰذا عوام کو صرف 40 محصولات دینے ہوں گے۔ اب اگلے سال یا جس وقت چاہا اعلان کر دیا کہ ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کے دباؤ پر سبسڈی ختم کی جاتی ہے یوں آمدنی بڑھا لی جاتی ہے۔

بہت سے لوگ سوچتے ہیں کہ کیا فیصلہ کرنے والوں کو عوام اور ملک پر رحم نہیں آتا۔ لیکن وہ نہیں جانتے کہ یہ لوگ چند استثنائی صورتوں کے سوا استعماری ایجنٹ اور اربوں کروڑوں روپے کے مالک بن چکے ہیں۔ بچے ترقی یافتہ ممالک میں بسے ہوئے ہیں۔ قیمتوں میں اضافے کا اُن پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ انہیں یہ سہولتیں مفت حاصل ہیں۔ حقیقت میں ان پوسٹوں پر اُن کا تقرر بھی اسی وجہ سے ہے کہ بین الاقوامی اداروں اور استعماری ممالک کو امریکی پلان پر کامیابی سے عملدرآمد کیلئے ان کی خدمات کی ضرورت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے۔محترم قارئین! یہ بات نوٹ کر لیجئے کہ ہر تین ماہ بعد قیمتیں بڑھتی رہیں گی۔قوم پر عائد کردہ عذاب بڑھتا رہے گا۔لوگ خودکشیاں کرتے رہیں گے۔عوام بھوک سے مرتے رہیں گے اور دوسری طرف جشن منائے جاتے رہیں گے اور امریکی پلان کو کامیابی تک لے جانے کا عمل جاری رہے گا۔پاکستان کے "دانشور" اور پاکستان کا پرنٹ میڈیا لوگوں تک یہ بات پہنچاتا رہے گا کہ پاکستان کو فوری طور پر امریکی پلان مان لینا چاہیے' ورنہ قوم پر عذاب شدید نازل ہو جائے گا۔(مثلاً حبیب الرحمٰن صاحب کی اسلام آباد کی تازہ ڈائری کی) یہ بات صحیح ہے کہ مہنگائی ہر تین ماہ بعد بڑھے گی۔عوام الناس کی زندگی اور اذیت ناک ہو گی لیکن اس کا حل کیا امریکی پلان پر عملدر آمد ہی ہے؟......نہیں! پاکستان کو اقتصادی اور سیاسی طور پر ایک مستحکم ملک بنانے کا راستہ ابھی کھلا ہے۔ایک آزاد ملک کے طور پر زندہ رہنے کا چانس موجود ہے۔بین الاقوامی برادری میں سر اُٹھا کر چلنے کے قابل بننے کیلئے ابھی مہلت باقی ہے۔ لیکن اس کیلئے بنیادی اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔ہم اپنی گزارشات پیش کرتے ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ

1- پاکستان کی قیادت بہادر لوگوں پر مشتمل ہو جو غلامی اور درباری پن سے نفرت کرتے ہوں' ایماندار ہوں' ملک وقوم کا درد رکھتے ہوں اور ایسے ہوں جو بین الاقوامی مالیاتی اداروں اور استعماری حکمرانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انہیں بتا سکیں کہ ہر وہ تجویز جو پاکستان کے حقیقی فائدے میں نہیں ہو گی' ہم نہیں مانیں گے۔ہم سمجھتے ہیں کہ موجودہ فوجی حکمران اس بہادری کا مظاہرہ کر سکتے ہیں لیکن اگر وہ ایسا نہ کر سکتے ہوں تو انہیں اقتدار اپنے اُن ساتھیوں کے حوالے کر دینا چاہیے' جن میں مطلوبہ صلاحیتیں موجود ہوں۔

2- 1988ء کے بعد حکمران رہنے والوں بشمول تمام M.N.A.s، M.P.A.s، Senators اور ان کے خاندان کے افراد کے ملکی سیاست میں ہر لیول پر حصہ لینے پر پابندی لگا دینی چاہیے۔ملک کو تباہی کے موجودہ دہانے تک پہنچانے میں ان کا

عمداً یا غیر عمداً ہاتھ ہے۔ذمہ دار حضرات کو کڑی سزائیں دی جائیں۔

3- بڑے بڑے سرکاری افسران کی نہ صرف چھٹی کر دی جائے بلکہ ان کی وہ تمام آمدنی اور اثاثے جو ناجائز ذریعے سے حاصل کئے گئے ہیں' ضبط کر لئے جائیں اور انہیں سخت سزائیں سنائی جائیں۔یہی وہ شیطان ہیں جو خودساختہ اور جعلی چارٹوں اور سلائڈز کی مدد سے ہر حکمران کو بے وقوف بناتے چلے آ رہے ہیں۔ان کا کوئی چارٹ اور کوئی سلائڈ حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔

4- گورنرز' وزراء اور مشیر وہ رکھے جائیں جو اہل' محب وطن ہوں اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ غیر ملکی ایجنڈوں کی تکمیل کرنے والے نہ ہوں۔ایماندار ہوں اور اس قابل ہوں کہ اپنے اپنے محکموں اور وزارتوں کے اہل کاروں کے مشوروں کے مرہون منت نہ ہوں بلکہ اُن کیلئے ٹارگٹ قائم کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور پھر ان ٹارگٹس کے حصول کو یقینی بنانے کی لیاقت بھی رکھتے ہوں۔

5- معاشی معاملات چلانے کیلئے بہت سوچ سمجھ کر ٹیم کا چناؤ کیا جائے۔یہ ٹیم ایسے ماہرین پر مشتمل ہو جو منجمد اقتصادیات کو رواں کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو' ہر وہ منصوبہ وقتی طور پر بند کر دیا جائے' جس سے آمدنی نہ ہوتی ہو خواہ اس کے نتیجے میں عوام کو کسی دشواری کا سامنا ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔یہ ماہرین اس قابل ہوں کہ بہت ضروری' ضروری' کم ضروری اور غیر ضروری منصوبوں میں امتیاز کر سکیں اور اس حوالے سے پروگرام بنائیں۔

6- حکومت پاکستان کھل کر اور بغیر لگی لپٹی رکھے بین الاقوامی مالیاتی اداروں اور اُن ملکوں کو جن سے قرضے لئے ہوئے ہیں' بتادے کہ پاکستان آئندہ پندرہ سال تک کوئی قرض ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔لہٰذا اُنہیں قرضوں کی واپسی کیلئے انتظار کرنا ہو گا۔اُنہیں بتا دینا چاہیے کہ لیا گیا قرضہ پاکستان میں تو کہیں لگا نظر نہیں آتا کیونکہ یہ قرضہ غیر ملکی ایجنٹ حکمرانوں اور سرکاری افسران نے سازش کے تحت انتہائی نامناسب شرائط پر لیا اور انہی ملکوں کے بینکوں میں جمع کرا دیا یا وہاں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اثاثے خرید لئے۔ لہٰذا اگر یہ ممالک قرض کی واپسی پہلے چاہتے ہیں۔ تو وہ ان پاکستانیوں کی رقوم اور اثاثے ضبط کرلیں' ورنہ پندرہ سال انتظار کریں۔ پاکستان یہ قرضے ضرور واپس کرے گا لیکن آج کے بعد ان پر مزید سود نہیں دے گا۔ تین تین' چھ چھ ماہ کی ری شیڈولنگ بے فائدہ اور سخت نقصان دہ ہے۔

-7 کرپشن کی سزا پھانسی مقرر کردی جائے' کیا دولت جائز ذرائع سے آئی' یہ ثابت کرنا دولت رکھنے والوں کی ذمہ داری قرار دی جائے۔

-8 پاکستان ایک ایٹمی ملک ہے۔ اسے ڈرانے کی ضرورت نہیں۔ اگر استعماری طاقتیں پاکستان پر دباؤ ڈالیں اور اس کیلئے مشکلات پیدا کریں۔ تو یہ یقین رکھنا چاہیے کہ عام پاکستانی اس دباؤ کا مقابلہ کرنے اور مشکلات کو جھیلنے کیلئے تیار ہے۔ یہ صرف امیر طبقہ ہے جو لوٹ مار سے امیر بنا ہے اور مشکلات کا سامنا کرنے کیلئے تیار نہیں۔

-9 صرف وہ صنعتی اور دوسرے منصوبے شروع کئے جائیں جو پیداواری ہوں' جن سے آمدنی ہوتی ہو اور روزگار کے مواقع پیدا ہوتے ہوں اور وہ ایسے ہوں جو ملک کو اقتصادی طور پر مستحکم کرنے والے ہوں۔

-10 حساب کیا جائے کہ کوکا کولا' پیپسی کولا' میکڈونلڈ' کے ایف سی' اور پیزا ہٹ وغیرہ جو پاکستان میں آکاس بیل کی طرح پھیل رہے ہیں۔ یہ کتنا سرمایہ پاکستان لائے اور اب تک کتنا سرمایہ پاکستان سے باہر لے جاچکے ہیں۔ اب تک کل کتنا منافع کما چکے ہیں۔ حساب کے بعد ظاہر ہوجائے گا کہ یہ جونکیں ہیں جو قوم کا خون چوس رہی تھیں۔ ان پر جائز پابندیاں لگانی ہوں گی۔

-11 سب سے ضروری بات یہ ہے کہ ہم اپنی پچھلی کوتاہیوں کی اللہ پاک سے معافی مانگیں اور عہد کریں کہ آئندہ ہم اللہ تبارک کے احکامات پر چلیں گے اور کوئی ایسا کام نہ تو خود کریں گے اور نہ کسی کو کرنے دیں گے' جو ملک وقوم کے مفاد میں نہ ہو۔

مارچ 2001ء

نیشنل میزائل ڈیفنس پلان

نیا جال، پرانے شکاری

وہائٹ ہاؤس کے سفارتی نمائندے آجکل دنیا بھر میں اپنے حلیف اور اتحادی ملکوں کے دارالحکومتوں میں نیشنل میزائل ڈیفنس پروگرام NMD کی وضاحت اور اس کیلئے عالمی حمایت حاصل کرنے کیلئے اڑانیں بھر رہے ہیں۔ صدر ڈبلیو بش کی انتظامیہ کرہ ارض میں امن وسلامتی کی صورت حال یقینی بنانے کے نام نہاد پلان کی افادیت اور اہمیت کے گن گانے میں مصروف ہے۔ اسکے نمائندے بھارت میں بھی پہنچے ہیں اور جواب میں بھارتی قیادت کی طرف سے حوصلہ افزا اشارے اور پاکستانی حکمرانوں کی طرف سے ناپسندیدگی کا ردعمل دیکھنے میں آیا ہے۔

آیئے دیکھتے ہیں کہ نیشنل میزائل ڈیفنس پلان کیا ہے اور اس پر بھارتی اور پاکستانی ردعمل مختلف کیوں ہے؟ سرد جنگ کے ابتدائی برسوں میں امریکہ کی بھاگ دوڑ سوویت یونین کے ایٹمی حملے سے تحفظ کیلئے تھی۔ وہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر کمیونسٹ بلاک سے تحفظ کیلئے گروہ بندی اور اسلحہ کی تیاری کے ساتھ ساتھ اپنے اور اپنے حلیفوں کے دفاع کیلئے سیٹو' سینٹو اور نیٹو جیسے بین الاقوامی دفاعی معاہدوں سے گزرتا ہوا 1972ء میں اینٹی بلاسٹک میزائل ٹریٹی تک پہنچا تھا۔ پھر صدر رونالڈ ریگن کے دور اقتدار میں سٹار وار پروگرام کے خدوخال سامنے آئے جسے ماہرین کی اکثریت نے تضحیک کا نشانہ بنایا۔ سائنسدانوں کی ایک بڑی مقدار نے اسے ایسی فضول خرچی کا نام دیا جو کسی طرح بھی قابل عمل نہیں تھی۔ اس ٹیکنالوجی کے چند تجربات کئے گئے جن کی ناکامی نے ماہرین کے خدشات کی تصدیق کردی۔

رونالڈ ریگن کے سیاسی وارث اسی منصوبے اور اسی ٹیکنالوجی کو ایک نئی صورت میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سامنے لائے ہیں اور اپنے منصوبے کو اتحادیوں میں مہنگے داموں بیچنا چاہتے ہیں۔ اپنے اتحادیوں کو حفاظتی حصار میں لانے کا خواہشمند امریکہ اب اپنے ذہن میں ایک نئی قسم کا ''شیلٹر'' وضع کئے ہوئے ہے جو حملہ آور میزائل کو نہ صرف روکے گی بلکہ اسے تباہ کردے گی۔ ماہرین کے اندازوں کے مطابق نیشنل میزائل ڈیفنس پروگرام پہ 100 بلین امریکی ڈالرز سے زیادہ کا زرکثیر صرف ہوگا۔ امریکہ اگرچہ دنیا کا امیر ترین ملک ہے لیکن وہ یہ بوجھ اکیلا نہیں اٹھا سکتا۔ خصوصاً بش انتظامیہ کی طرف سے ٹیکسوں میں چھوٹ کے بعد وہ اس پوزیشن میں نہیں کہ امریکہ انفرادی طور پر ایسا کر گزرے۔ واشنگٹن کی نئی انتظامیہ ابتدائی طور پر سماجی بہبود اور تعلیم کے شعبوں میں کٹوتیوں کے ذریعے میزائل ڈیفنس پلان کی بنیادیں رکھے گی۔ لیکن اس عمارت کے درودیوار بلند کرنے کیلئے اسے اپنے حلیفوں کی مالی اعانت بھی درکار ہوگی۔ چنانچہ دنیا بھر میں امریکی نمائندے اپنے اتحادیوں اور نئے اور پرانے حلیفوں کو اس پلان کی افادیت سے آگاہ کرکے اورانہیں معاونت کیلئے قائل کررہے ہیں۔

بین الاقوامی مبصرین کا سب سے پہلا سوال یہی ہے کہ امریکہ کس کے خلاف خود کو محفوظ و مستحکم کرنا چاہتا ہے اور اس عظیم ترین تحفظ و استحکام میں اپنے حلیفوں کو بھی شامل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ سوویت یونین کا انہدام ہو چکا' سرد جنگ ختم ہو چکی ہے۔ سرکاری سطح پر تسلیم کیا جا چکا ہے کہ ''روس'' دشمن نہیں ہے۔ اس سے امریکہ کو کوئی خطرہ نہیں۔ چین سے بھی اس قسم کا خطرہ پیدا نہیں ہوا۔ حالیہ جاسوس طیارے کے ناخوشگوار واقعہ کے باوجود چین کے بارے میں معاندانہ رویہ اور تندو تیز لہجہ کبھی اختیار نہیں کیا گیا تو پھر دشمن کون ہے؟ مزے کی بات یہ ہے کہ واشنگٹن میں بیجنگ اور ماسکو کیلئے ذہنی تحفظات موجود ہونے کے باوجود نیشنل ڈیفنس میزائل پروگرام کی تشہیر کرتے ہوئے انہیں جواز نہیں بنایا گیا۔ تو پھر امریکہ خود کو یا اپنے حلیفوں کو کس دشمن کے میزائلوں سے تحفظ دلانے کیلئے یہ دیو ہیکل پراجیکٹ شروع کرنا چاہتا ہے؟

امریکی نائب وزیر خارجہ رچرڈ آرمٹیج نے بھارتی روزنامہ ''انڈین ایکسپریس'' کو

انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ امریکی میزائل نظام کے وجود میں آنے کے بعد ان ممالک کو اپنے میزائل تباہ کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی جنھیں اپنے پڑوسیوں سے خطرات لاحق ہیں کیونکہ امریکا میزائلوں سے حملہ نہیں کرے گا بلکہ ان سے دفاع کا کام لے گا۔ انہوں نے کہا کہ امریکی میزائل نظام چین کے خلاف نہیں بلکہ بعض غیر ذمہ دار ممالک سے مقابلہ کیلئے ہے۔ امریکہ کی نظر میں غیر ذمہ دار یا اسکی زبان میں ''بدمعاش ریاستیں'' عراق' شمالی کوریا' ایران اور لیبیا ہیں۔ امریکہ کا کہنا ہے کہ اسکا میزائل ڈیفنس پروگرام ایٹمی ہتھیار اور میزائل رکھنے والے ملکوں کے خلاف ہے۔ اس نے روس' مغربی یورپ کے ممالک 'بھارت' چین' حتیٰ کہ جاپان جیسے غیر ایٹمی ملک سے بھی خصوصی نمائندوں کے ذریعے رابطے قائم کرکے اپنا موقف واضح کیا ہے صرف ان چار ممالک کو یہ موقع نہیں دیا گیا جنھیں بدمعاش ریاستیں قرار دیکر پروگرام کا جواز پیش کیا جارہا ہے۔

خلیجی جنگ شروع کرنے کیلئے صدام حسین کی ریپبلکن گارڈز کی طاقت کا ہوا کھڑا کیا گیا تھا اور جان بوجھ کر مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا۔ یہ روّیہ اب بھی جاری ہے بقیہ تمام دنیا کے ممالک سے مراسم استوار کرنے کے باوجود شمالی کوریا کو پراسرار بنا کر رکھا گیا ہے۔ اسکے بارے میں شور مچایا جاتا ہے کہ یہ میزائل تیار کرنے والا ایسا ملک ہے جو چوری چھپے انہیں برآمد کرتا ہے۔ صدر صدام حسین اور کرنل قذافی ناقابل اعتبار قرار دیئے جاتے ہیں کیونکہ یہ دونوں امریکہ کی خواہش اور کوششوں کے باوجود اپنے ملکوں کے سربراہ ہیں اور عوام کو اس گناہ کی پاداش میں بین الاقوامی پابندیوں کا سامنا ہے' معصوم اور بے گناہ لوگ موت کا شکار ہو رہے ہیں۔

ان ریاستوں کے بارے میں تشویش کے باوجود یہ تصور کرنا انتہائی مشکل ہے کہ صدام حسین' کرنل قذافی یا کم ال جونگ کے پاس اتنی صلاحیت ہے کہ وہ میزائلوں کا ایک غول براہ راست امریکہ یا اسکے کسی اتحادی مثلاً اسرائیل پہ داغ سکیں۔ یہ تو اپنی موت کو آواز دینے والی بات ہوگی۔ کیونکہ امریکہ کی روایت تو شدید تر' وسیع تر اور سنگین تر ردعمل پیش کرنا ہے۔ خلیج کی جنگ میں عراق کا حشر سب کے سامنے ہے۔ امریکہ کی موجودہ عسکری

www.iqbalkalmati.blogspot.com

قوت اور ھلاکت خیزی کی صلاحیت تو اب بھی کچھ کم نہیں خود امریکی عوام جس قدر آج محفوظ ہیں اس سے پہلے کبھی نہ تھے۔ یاد رہے کہ آخری مرتبہ امریکہ کو اپنی سرزمین پر کسی بیرونی جارحیت کا نشانہ 90 سال پہلے بننا پڑا تھا جب جاپانیوں نے پرل ہاربر پر بمباری کی تھی۔ اسکے بعد ایک صدی گزر جانے کے باوجود امریکی تحفظ و دفاع میں کبھی ضعف نہیں آیا۔ امریکہ کے حوالے سے تو کہنا پڑے گا کہ نیشنل میزائل ڈیفنس پروگرام ایک ضمنی اقدام ہے موجودہ ''سیف گارڈ'' کا متبادل نہیں۔ چنانچہ بش انتظامیہ کچھ بھی کہتی رہے یہ ایک ایسے دشمن کے خلاف دفاعی اقدام ہوگا جس کا کوئی وجود ہی نہیں۔

نیشنل میزائل ڈیفنس پلان محض عسکری پہلو نہیں رکھتا۔ یہ ایک مکمل طور پر صنعتی میزائل ٹیکنالوجی ہے جسے امریکہ اپنے حلیفوں کو بیچ کر آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام حاصل کرنا چاہے گا۔ اسے پتہ ہے کہ اس خرید و فروخت میں کوئی آڑے نہیں آئے گا۔ آجکل وہ دنیا کی اکلوتی سپر پاور ہے۔ سبھی اسکی ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور ہیں۔ اور پھر اسے اپنی بات منوانا بھی آتی ہے۔ وہ اپنی مرضی منوانے کی مضبوط پوزیشن میں ہے۔ لیکن بات یہیں تک نہیں رکے گی۔ وہ اپنے حلیفوں کے وسائل تک رسائی پانے کی کوشش کرے گا اور خلیج میں اس نے ایسا کر دکھایا ہے۔

امریکہ کے نیشنل مزائل ڈیفنس پروگرام کے اغراض و مقاصد کو معروضی حالات میں دیکھیں تو صاف طور پر دکھائی دیتا ہے کہ پرانے شکاری نیا جال لائے ہیں۔ امریکہ اس پروگرام کے ذریعے اپنی اقتصادیات کو استحکام دینا چاہتا ہے۔ بین الاقوامی سطح پر نئے گٹھ جوڑ کر کے اپنی عالمی گرفت کو مزید مضبوط کرنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس پلان کی مخالفت محض چین پاکستان اور یورپی ممالک ہی کی طرف سے نہیں خود امریکہ کے ایوان نمائندگان میں بھی زور و شور سے جاری ہے۔ سینیٹر ڈک ڈربن نے اس پلان کی مخالفت کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''صدر بش کا پروگرام تو اسلحہ کی نئی دوڑ شروع کرنے کیلئے کھلی دعوت ہے۔ یہ موجودہ تخفیف اسلحہ کے معاہدوں کی صریح خلاف ورزی ہوگی اور پھر ہمیں ایک ایسی ٹیکنالوجی کا دفاع

کرنے کیلئے کہا جائے گا جو ہمارے بہترین سائنسدانوں کے نزدیک قابل اعتماد نہیں۔''

اب آیئے نیشنل میزائل ڈیفنس پلان کے حوالے سے برصغیر کا منظر نامہ دیکھتے ہیں۔ امریکہ نے بھارت کو اعتماد میں لینے کیلئے اپنے نائب وزیر خارجہ رچرڈ آرمٹیج کو تو نئی دہلی بھجوا دیا لیکن اپنے پرانے حلیف پاکستان، جس کے پاس ایٹمی ہتھیار اور میزائل دونوں موجود ہیں اس کو کسی بھی سطح کے افسر یا نمائندے کے ذریعے اعتماد میں لینے کے قابل نہیں سمجھا گیا۔ اس کے برعکس یہ ہوا کہ امریکی نائب وزیر خارجہ نے نئی دہلی میں بیٹھ کر پاکستان کو بھی ''بدمعاش ریاستوں'' میں شامل کرتے ہوئے تشویش کا اظہار کیا۔ انہوں نے عراق شمالی کوریا، ایران اور لیبیا کا نام لیکر اور بھارت کے پڑوسی کا نام لئے بغیر اپنی تشویش ظاہر کی۔ انہوں نے پریس کانفرنس میں کہا کہ آپ کے پڑوس میں بھی ایک غیر ذمہ دار ملک ہے جس کے بارے میں ہمیں تشویش ہے۔ ایک رپورٹر نے پوچھا کہ آپ نے پاکستان کا نام نہیں لیا تو جواب میں امریکی عہدیدار کا جواب تھا..........ہم اپنی تشویش کا اظہار کر چکے ہیں۔

جس وقت نئی دہلی میں امریکی نمائندے مسٹر آرمٹیج، واجپائی اور جسونت سنگھ سے نیشنل میزائل ڈیفنس پلان پر بات چیت کر رہے تھے اور گفتگو کے بعد یہ اشارہ دینا مناسب سمجھا گیا تھا کہ پاکستان بھی ان غیر ذمہ دار ریاستوں میں شمار کیا جا رہا ہے، جن کے میزائیلوں کے حملے سے بچاؤ کیلئے نیشنل میزائل ڈیفنس تیار کیا جا رہا ہے اور بھارت کو اس کے غیر ذمہ دار پڑسیوں سے تحفظ کی یقین دہانی کرائی جا رہی تھی۔ ٹھیک اسی وقت اسلام آباد میں جنرل پرویز مشرف نے کھل کر موقف اختیار کیا کہ پاکستان ڈیفنس میزائل ٹیکنالوجی کی کوئی نئی دوڑ شروع کئے جانے کا مخالف ہے پھر گارڈین کو انٹرویو دیتے ہوئے جنرل مشرف نے میزائل ڈیفنس پلان کے حوالے سے بھارت اور امریکہ کی مفاہمت کے بارے میں کہا کہ ''اس خطے میں ایک دفاعی توازن پایا جاتا ہے۔ دنیا میں اور ہر علاقے میں دفاعی توازن قائم رہنا چاہیے۔ ہمارے خطے میں بھی یہ توازن موجود ہے۔ اب اگر یہ توازن درہم برہم ہوا تو یقیناً پاکستان متفکر ہوگا۔ امریکہ کے ساتھ ہمارے بہت پرانے تعلقات ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پچھلے 53 برسوں میں امریکہ سے دفاعی تعلقات بھی رہے ہیں۔ یہ تعلقات قائم رہنا چاہئیں اور انہیں درہم برہم نہیں ہونا چاہیے۔ اگر یہ توازن بگڑا اور اس کا جھکاؤ بھارت کی طرف ہو گیا تو یہ مناسب نہیں ہوگا۔

جنرل مشرف کے موقف سے پاکستان کے امریکہ مخالف کیمپ میں (کم از کم نیشنل میزائل ڈیفنس پلان کی حد تک) جانے کی بات واضح ہو جاتی ہے۔ اس کے اثرات کیا اور کس طرح مرتب ہوں گے۔ یہ ہم اپنے آئندہ کسی مضمون میں پیش کریں گے۔ فی الحال میزائل ڈیفنس پلان کے بارے میں بھارت کے ردعمل کی طرف ایک نظر ڈالئے۔ بھارت کے بڑے بڑے اخبارات میں رپورٹیں شائع ہوئی ہیں کہ وزیراعظم واجپائی صدر بش کے میزائل ڈیفنس پروگرام کی حمایت کا ارادہ رکھتے ہیں۔ بھارت کی گرم جوشی چھپائے نہیں چھپ رہی۔ سرکاری سطح پر برملا کہا جا رہا ہے کہ اس اقدام سے نئی دہلی اور واشنگٹن کے درمیان نئے تعلقات کا آغاز ہوگا اور ایشیا کے حوالے سے خاص طور پر دور رس سیاسی اور عسکری اثرات مرتب ہوں گے۔

بھارت کی شاطر قیادت اس موقعہ سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتی ہے۔ عالمی طاقت بننے اور خطے میں بالادستی حاصل کرنے کا بھارتی جنون اس کی قیادت کو میزائل ڈیفنس پلان کی حمایت کرنے پر اکسا رہا ہے۔ امریکہ کا حلیف بن کر بھارت وہ سب کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے جو امریکی مخالفت کے سبب آج تک حاصل نہیں کر سکا۔ اگرچہ میزائل ڈیفنس پلان کی پوری تصویر واضح نہیں ہوئی لیکن پاکستان کو امریکہ سے دور کرنے اور سلامتی کونسل میں بھارت کیلئے مستقل نشست حاصل کرنے کا مسحور کن تصور بھارت کو پرجوش بنا رہا ہے۔ میزائل ڈیفنس اشتراک میں شامل ہونے پر بھارت پہ امریکہ اور یورپ کا یہ دباؤ بھی ختم ہو جائے گا کہ وہ خود ایٹمی ہتھیاروں کے انبار کیوں لگا رہا ہے' یہ بات بھارت کو ایٹمی حوالے سے پاکستان پہ ایک برتری دلا دے گی۔

امریکہ' بھارت' روس اور ان کے حواری پاکستان پر دہشت گردی کی پشت پناہی کا

الزام عائد کرتے ہیں۔ امریکہ بھارت کو چین کے خلاف استعمال کرنا چاہتا ہے۔ پاکستان چین کے دوستوں میں ہے۔ چنانچہ ایک تیر سے دوشکار کرنے کیلئے بھارت تیار بیٹھا ہے۔ امریکہ کے بھارت کی طرف جھکاؤ اور بھارت اور امریکہ کے چین کے خلاف محاذ قائم کرنے سے پاکستان کے ساتھ امریکہ کے رویے میں سردمہری آ سکتی ہے۔ پاکستان کے خلاف مزید پابندیاں اور دنیا میں اسے تنہا کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ لیبیا' عراق' ایران اور سوڈان کی طرح بائیکاٹ کیا جا سکتا ہے۔ پاکستان کیلئے معاشی الجھنیں پیدا کی جا سکتی ہیں۔ ان حالات میں پاکستان کو اپنی خارجہ پالیسی اور حکمت عملی کو نئے سرے سے مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ بین الاقوامی سطح پر جاپان' چین اور یورپی یونین کا قرب پاکستان کو توانا رکھ سکتا ہے۔ داخلی استحکام بھی بیرونی خطرات کم کر دے گا۔ جنرل مشرف نے حالیہ دنوں میں جس طرح امریکہ کی ڈکٹیشن لینے سے انکار کیا ہے وہ یقیناً لائق تحسین ہے۔ پاکستان اپنی تمام تر اقتصادی مشکلات کے باوجود اپنے قومی وقار کا سودا نہیں کرے گا۔ لیکن قومی وقار بحال رکھنے کیلئے ٹھوس حکمت عملی کی ضرورت ہے جو داخلی اور خارجی سطح پر بیک وقت اپنائی جائے۔ دونوں میں سے کسی ایک کو نظرانداز کرنا ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ داخلی سطح پر عوام دوست پالیسیوں کی ضرورت ہے۔ قومی یک جہتی کو مزید استحکام دینے کی ضرورت ہے اور بین الاقوامی سطح پر اپنے اردگرد ہونے والے واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جنوبی ایشیا کے چھوٹے ممالک کو بالخصوص متحرک کر کے امریکہ کی مدد سے قائم کی جانے والی بھارتی بالادستی کی مزاحمت تخلیق کرنے کے اقدامات کی ضرورت ہے کیونکہ بدلتی ہوئی صورت حال میں سب سے زیادہ منفی اثرات پاکستان پر ہی پڑ سکتے ہیں۔

جون 2001ء

امریکہ کو سوچنا چاہیے

امریکہ 11 ستمبر کی ''دہشت گردی'' کا جواب دینے کیلئے کسی سمندری طوفان کی طرح گرج رہا ہے۔ وہ ایک ایسے المیے سے دوچار ہوا ہے، جو بے گناہ انسانی جانوں کے وسیع تر اتلاف کے ساتھ ساتھ اسے جگ ہنسائی اور بودے پن کا شکار کر گیا ہے۔ بے گناہ انسانی ہلاکتوں کو کوئی بھی مہذب انسان پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھ سکتا۔ اس طرح کا المیہ دنیا کے کسی بھی حصہ میں ہو افسوسناک اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ امریکہ کا اپنے انسانی اور مالی نقصان پر تلملانا ''فطری بات'' ہے۔ اپنی جوابی کارروائی کو ''شدید تر'' وسیع تر اور فوری بنانا اس کیلئے یوں بھی ضروری ہے کہ اس کے عوام کا مورال اور اس کا اپنا احساس تفاخر جو ''ایک سو دس منزلہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر ٹاور سے بھی اونچا تھا، 11 ستمبر کو نو بجے کے بعد زمین چاٹ رہا ہے۔ اربوں ڈالر کے اسراف سے قائم جدید ترین ٹیکنالوجی سے مزین سیکورٹی سسٹم اور فول پروف حفاظتی اقدامات کا بھرم کھل گیا ہے۔ دنیا کی اکلوتی سپر پاور حیران و ششدر رہنے کے بعد اب غیض و غضب کا مظاہرہ کرنے پر تیار ہے کہ ایسا نہ کیا گیا تو عوام کا عدم تحفظ کا احساس برقرار رہے گا اور دنیا بھر میں جو سبکی ہوئی ہے اس کا ازالہ ممکن نہیں ہوگا۔

ماضی میں بھی امریکہ کا رویہ یہی رہا ہے کہ ساری دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے، ہوتا رہے۔ اس کے مفادات محفوظ ہیں تو پھر بے گناہ لوگ مارے جائیں۔ نسل کشی ہو، بوسینیا میں اجتماعی قبریں بنیں، کشمیر کے چنار راکھ ہو جائیں، فلسطین آہ و بکا کی سرزمین بنا رہے۔ افریقہ میں لوگ فاقوں سے مر جائیں۔ خانہ جنگی اور تصادم ہوتے رہیں اسے کوئی سروکار نہیں۔ البتہ کہیں بھی امریکی شہریوں کی جان خطرے میں ہو تو اسے فوراً انسانی زندگی کی حرمت اور بنیادی حقوق یاد آ جاتے ہیں۔ اس کی سریع الحرکت فوجیں چوکس ہو جاتی ہیں۔ بحری بیڑوں کا رخ تبدیل ہو جاتا ہے۔ اپنے شہریوں کے جان و مال کا تحفظ یقیناً ہر حکومت اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مملکت کا اولین فرض ہے۔ لیکن کیا امریکی ارباب اختیار اور امریکی دانشمند اپنی جھلاہٹ اور خجالت کی تند و تیز لہروں کے شور میں دنیا کے مختلف حصوں سے اٹھنے والی معقول آوازوں پہ کان دھر سکیں گے......؟

اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ اپنے شہریوں کی بے گناہ ہلاکت پر خاموش نہیں رہا جا سکتا۔ ایسے مراکز اور ایسی قوتوں کا خاتمہ ضروری ہوتا ہے جو دہشت گردی پہ اتر آئیں بے گناہ لوگوں کے جان و مال اور پر امن زندگی کو خطرے سے دوچار کر دیں۔ ایسے واقعات کو دوبارہ جنم لینے سے روکنے کیلئے موثر اقدامات کرنا ضروری ہوتے ہیں۔ لیکن ابلتے ہوئے کھولتے ہوئے پانی میں برف ڈال دینا مستقل حل نہیں ہوتا۔ پانی کو ابالنے اور جوش دینے والی آگ کو سرد کرنا ضروری ہوتا ہے۔ آگ بجھ جائے تو اس پہ رکھا پانی از خود اپنا درجہ حرارت کھو دیتا ہے۔ اس میں عارضی ٹھہراؤ نہیں بلکہ مستقل سکون آ جاتا ہے۔

سوال یہی ہے کہ کوئی فرد، کوئی تنظیم یا کوئی ملک امریکی مفادات کو نقصان پہنچانے کے درپے ہے تو آخر کیوں؟ امریکی قیادت اپنی دھونس اور بالادستی تو ہر قیمت پر برقرار رکھنا چاہتی ہے۔ لیکن کبھی اس نے سوچا ہے کہ دھونس اور بالادستی حدود سے تجاوز کر جائے تو پھر کیا ہوا کرتا ہے؟ کبھی کسی امریکی دانشور نے یا سینٹ یا کانگریس کے رکن نے اس بات پہ احتجاج کیا ہے کہ امریکی طرز عمل امتیازی رنگ و روپ رکھتا ہے۔ جمہوریت کے چمپئن اور انسانی حقوق کے علمبردار کو کبھی یہ توفیق ہوئی کہ کسی مظلوم کی مدد اور ظالم کا ہاتھ روکے۔ کبھی اسے بے گناہ فلسطینیوں کے اٹھتے ہوئے جنازے نظر آئے۔ اس نے بوسنیا کے مسلمانوں کی نسل کشی کا نوٹس لیا۔ اسے چیچنیا میں روس کی بربریت دکھائی دی۔ اسے حق خود ارادی کیلئے بھارتیوں کے مظالم کا نشانہ بننے والے کشمیری نظر آئے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ اس نے ان تمام علاقوں میں ظالم کا ہاتھ روکنے کی بجائے اس کی مدد کی اسے مضبوط کیا۔ اسے آشیر باد دی۔ کیا سلامتی کونسل میں اسرائیل کے خلاف وہ عالمی خبر کو قرارداد کی صورت میں منظور ہونے دیتا ہے۔ کیا اس نے کشمیر میں رائے شماری کیلئے سلامتی کونسل کی قراردادوں پہ عمل درآمد ہونے دیا۔ ہاں کویت کے معاملے میں اس نے پھرتی دکھائی۔ لیکن اس سارے

ڈرامے کے کردار اور مقاصد دنیا کو معلوم ہو چکے ہیں۔

امریکہ اور اس کے حلیفوں کیلئے سوچنے کی بات صرف یہ ہے کہ آخر امریکہ کو دنیا بھر سے جو نفرت مل رہی ہے کیا اس کی وجہ خود امریکی طرز عمل نہیں............؟

سوویت یونین کے انہدام کے بعد دنیا کی اکلوتی سپر پاور نے نیو ورلڈ آرڈر کی خواہش میں ایسے ایسے فرامین جاری کئے کہ نو آبادیاتی نظام بھی شرمندہ ہو گیا۔ نو آبادیاتی دور کے خاتمہ پر تیسری دنیا کے عوام کا خیال تھا کہ اب انہیں پھلنے پھولنے اور پننپنے کا موقع ملے گا لیکن امریکہ نے براہ راست اور بالواسطہ یعنی آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک وغیرہ کے ذریعے جس طرح تیسری دنیا کا خون نچوڑا ہے اس کے نتیجہ میں دنیا امریکہ کیلئے پھول لیکر تو کہیں بھی کھڑی نظر نہیں آتی۔ ملائیشیا جیسے ملکوں نے سنبھلنے کی کوشش کی تو وہاں اقتصادی شب خون کے ذریعے معیشت کا تیاپانچہ کر دیا گیا۔ پاکستان کا حال تو شاید سب سے خراب ہے۔ یہی حالت لاطینی امریکہ اور افریقی ممالک کی کر دی گئی ہے۔

دنیا بھر میں جہاں جہاں حق خود ارادیت کی تحریکیں موجود ہیں وہاں امریکہ استبدادی قوتوں کا ساتھ دے رہا ہے۔ ہندوستان کی بارہ ریاستوں میں علیحدگی کی تحریکیں چل رہی ہیں لیکن مجال ہے جو جمہوریت اور انسانی حقوق کے چمپئن کو وہاں ظلم و ستم نظر آیا ہو۔ چونکہ نئے امریکہ ورلڈ آرڈر میں ہندوستان امریکی مفادات کا نگہبان بننے پر آمادہ ہے۔ چنانچہ ہندوستان کی بربریت پہ امریکہ کی آنکھیں بند ہیں۔

اسرائیل فلسطینیوں کے ساتھ بہیمیت کی انتہا کئے ہوئے ہے لیکن اسے کھلی چھٹی ہے۔ تشدد کی حالیہ لہر میں اسرائیل نے طیاروں اور ٹینکوں کی مدد سے جو قیامت برپا کر رکھی ہے امریکہ کو کبھی اس پر تشویش نہیں ہوئی۔ کیا فلسطینیوں کو زندہ رہنے اور اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا حق حاصل نہیں۔ چند روز قبل اخبارات میں ایک تصویر چھپی تھی، جس میں ایک خاتون نے پلے کارڈ اٹھا رکھا تھا۔ کارڈ پہ عربی اور انگریزی تحریر تھا......ہم امریکہ سے نفرت کرتے ہیں کیونکہ امریکہ کی شہ پر اسرائیل ہمارے بچوں کو قتل کر رہا ہے۔

امریکہ کیلئے ناخوشگوار جذبات مشرق وسطیٰ یا ایشیا ہی میں نہیں افریقہ اور لاطینی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

امریکہ میں بھی پائے جاتے ہیں۔ خود امریکہ میں ایسے عناصر اور قوت کے مراکز پائے جاتے ہیں جو دہشت گردی اور سازشوں کے ذریعے اپنی موجودگی کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ اوکلے ہاما ٹریڈ سنٹر کا واقعہ اس کی واضح دلیل ہے۔ لیکن کسی اور سمت میں اپنی توانائیاں مرکوز کرنے کی بجائے ایف بی آئی کے کم و بیش آٹھ ہزار افراد اس المیہ کے ذمہ داروں کی تلاش کے نام پر اسامہ بن لادن کو مجرم قرار دینے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ آثار و قرائن بتاتے ہیں کہ امریکہ نے افغانستان پر جھپٹ پڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ لیکن امریکی دانشور فطرت کا یہ قانون کیوں بھول رہے ہیں کہ "جو جیسا بوئے گا ویسا کاٹے گا......" امریکہ نے ماضی میں جو کچھ بویا وہ کاٹ رہا ہے۔ اب جو کچھ بوئے گا مستقبل میں اسے بہرحال کاٹنا پڑے گا۔ کیا وہ مستقبل کیلئے مزید "دہشت گردی" چاہتا ہے۔

سوال یہی ہے کہ امریکہ کو نقصان پہنچانے والی سازشوں کے ڈانڈے امریکی ماہر، اسامہ بن لادن ہی سے کیوں ملا رہے ہیں۔ انہیں ہر سازش کی بو "اسلامی بنیاد پرستوں" ہی سے کیوں آتی ہے۔ امریکی اور یورپی دانشوروں کو اسلام اور مسلمانوں سے الرجی کیوں ہے۔ اس کا ایک سبب تو یورپ کے قدیم یونانی اور رومن دور کی نفسیاتی میراث ہے۔ یونانی اور رومن صرف اور صرف خود کو مہذب سمجھتے ہیں۔ باقی سب انسان بالخصوص بحر روم کے مشرق میں رہنے والے "وحشی" کے لقب سے پکارے جاتے ہیں۔ تب سے تمام یورپی اور پھر امریکی تمام مخلوق پر اپنی نسلی برتری کو ایک حقیقت سمجھتے ہیں۔ سائنسی ترقی نے ان کے فخر و مباہات کو آسمان پر پہنچا دیا ہے۔ مسلمانوں کے بارے میں یورپ اور امریکہ کے جذبات شدید تعصب پر استوار ہیں۔ وہ دوسرے مذاہب کیلئے روشن خیالی اور وسیع القلبی کا مظاہرہ کر لیتے ہیں۔ مثلاً بدھ مت اور ہندو مت بھی ان کیلئے قابل قبول نہیں لیکن ان کیلئے وہ متوازن ذہنی رویہ رکھتے ہیں، لیکن جوں ہی یہ اسلام کی طرف دیکھتے ہیں ان کا توازن درہم برہم ہو جاتا ہے اور ایک جذباتی جانبداری چھلک پڑتی ہے۔ اس کا سبب تاریخ کا وہ سب سے بڑا تصادم ہے جو صلیبی جنگوں کی صورت میں ہوا۔ یہ صلیبی جنگیں ہی تھیں جنہوں نے فیصلہ کن انداز میں اسلام کے خلاف یورپ کا رویہ متعین کیا۔ جو آنے والی صدیوں میں بھی

برقرار رہا۔ موجودہ یورپیوں اور امریکیوں کے اجداد تو وہی تھے جنہوں نے صلیبی جنگوں کے دوران مسلمانوں کے علاقوں میں اپنی فتوحات کے بعد ناقابل بیان مظالم ڈھائے، جن پر آج پاپائے اعظم کو معذرت کرنا پڑی ہے۔ تاہم جس طرح افراد میں ہوتا ہے کہ ان کے بچپن کا شوریدہ سر انداز شعوری یا غیر شعوری سطح پر بعد کی زندگی میں برقرار رہتا ہے اسی طرح اقوام کا بھی معاملہ ہے۔ یورپیوں اور امریکنوں کے ذہن میں نقش ہو چکا ہے کہ وہ اسلام کے شعوری تجربات کے ہاتھوں مشکلات سے دوچار ہو چکے ہیں اور اب پھر ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ جہاں کہیں انہیں ضرب پڑتی ہے وہ کچھ سوچے سمجھے بغیر اسلامی بنیاد پرستی کا شور مچا دیتے ہیں۔

امریکی حکام، سراغ رساں اداروں اور دانشوروں کو 11 ستمبر کے سانحہ کے پیچھے اسامہ بن لادن کا ہاتھ کارفرما دکھائی دے رہا ہے۔ ان کا مطالبہ ہے کہ طالبان اسامہ بن لادن کو اس کے حوالے کر دیں یا پھر نتائج بھگتنے کیلئے تیار ہو جائیں۔ ممکن ہے اگلے چند روز میں امریکہ کچھ کر گزرے لیکن معقول آوازیں، امریکہ کو ہوش مندی سے کام لینے کا مشورہ دے رہی ہیں۔ ابھی چند سال پہلے امریکہ نے عراق پر آتش و آہن کی برسات کی۔ بغداد کو کھنڈر بنا دیا لیکن کیا وہ اپنے "اصل دشمن" صدام حسین کا کچھ بگاڑ سکا۔ یہ درست ہے کہ فضائی حملوں سے عراق برباد ہو کر رہ گیا۔ اقتصادی پابندیوں نے وہاں کے عوام کی زندگی جہنم بنا دی ہے۔ لیکن صدام حسین تو اپنی جگہ موجود ہے۔ اب اگر اسامہ بن لادن کو "سموک آؤٹ" کرنے کیلئے افغانستان پر فضائی حملہ کیا جاتا ہے تو کہاں تک کامیابی ممکن ہے......؟ اقتصادی پابندیوں نے وہاں کے عوام کو پہلے ہی دانے دانے کا محتاج کر رکھا ہے۔ پھر وہ ملک سوویت یونین کے خلاف میدان جنگ بننے کے بعد اور پھر خانہ جنگی کی لپیٹ میں آ کر پہلے ہی کھنڈر بن چکا ہے۔ ان پہ حملے کیا دباؤ ڈالیں گے۔ اس کا ایک حل یہ ہے کہ زمینی حملہ کیا جائے وہاں کی حکومت کو تبدیل کیا جائے لیکن اپنی کٹھ پتلی حکومت کے استحکام کیلئے ایک بھاری فوج غیر معینہ مدت کیلئے رکھنا پڑے گی۔ (اس کے اخراجات کہاں سے آئیں گے) لیکن اس طرح کے تجربات ماضی میں کبھی کامیاب نہیں ہوئے۔ انگریز مورخین کے مطابق افغانستان بھڑوں کا چھتہ ہے۔ یہاں نہ تو انگریز پاؤں جما سکے اور نہ سوویت یونین......

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ویت نام کا زخم خوردہ امریکہ اپنا تجربہ کر کے دیکھ لے۔ لیکن ہوگا یہ کہ ایران اور عراق کے بعد اس خطہ میں وہ اپنا ایک اور سخت جان حریف پیدا کر لے گا۔ یہ حریف ان ملکوں کیلئے مسئلہ بن جائے گا جو امریکی حملہ آوروں کیلئے سہولتیں مہیا کریں گے۔

بڑھتی ہوئی سماجی اور معاشی بے چینی اور نامعلوم سمتوں سے ہونے والی سائنسی دہشت گردی کا تدارک افغانستان اور اسامہ بن لادن کو روند ڈالنے کی کوشش سے نہیں ہوگا۔ اس کا حل کچھ اور ہے جو طیش اور غیض وغضب میں نہیں سوجھا کرتا۔

اکتوبر 2001ء

نئی صورت حال

ہمارے ہاں قبائلی دشمنی کے اندھے جذبات میں غرق افراد اور برادریوں کا صدیوں سے وطیرہ چلا آرہا ہے کہ جب بھی کسی ایک فریق کا کوئی جانی یا مالی نقصان ہوتا ہے تو وہ حالات و واقعات پہ نظر ڈالے بغیر فوراً اسکا الزام اپنے "دشمن" پر عائد کر دیتا ہے۔ ہماری پولیس کیلئے بھی یہ ایک آسان ترین راستہ ہوتا ہے چنانچہ وہ "نامزدگیوں" کی لاٹھی لیکر تفتیش و تحقیق کے ضروری تقاضوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بے گناہ افراد کو ہانک کر اپنے عقوبت خانوں میں لے آتی ہے اور پھر جو کچھ ہوتا ہے وہ ہم سب کو معلوم ہے۔

گیارہ ستمبر کو نامعلوم سمت سے امریکی عمارتوں پہ ہونے والے حملوں کے بعد ذہین و فطین امریکی اربابِ اختیار کی ذہنی سطح بھی ہم جیسے تیسری دُنیا کے کوتاہ نظر، کم اندیش اور روایتی دشمن دار قبائلیوں اور دیہاتیوں جیسی نکلی۔ انہوں نے فوراً اپنے مفروضہ دشمن اُسامہ بن لادن کو اس کا ذمہ دار قرار دے دیا۔ ان کا انداز بالکل ہماری پولیس جیسا نکلا۔ ہماری پولیس سہل انگاری کا اچھوتا نمونہ ہے۔ مثلاً ایک زمانے میں ڈاکو محمد خان کا خوف و ہراس شمالی پنجاب میں پھیل گیا۔ وہ پولیس کے ہتھے نہیں چڑھ رہا تھا۔ پولیس کو بھی ایک آسان راستہ مل گیا۔ کوئی بھی (ذرا سا) پیچیدہ کیس جس میں قتل یا ڈکیتی کا پہلو نکلتا...... اسے فوراً ڈاکو محمد خان کے کھاتے میں ڈال کر جان چھڑالی جاتی۔ بظاہر امریکہ بہادر نے بھی ایسا ہی کیا ہے اور اپنے عوام کا غم و غصہ اپنی غفلت یا ناقص سیکورٹی سے ہٹا کر اُسامہ اور مسلمانوں کی طرف پھیر دیا ہے۔ لیکن یہ اقدام اور الزام اضطراری کیفیت کا نتیجہ نہیں۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا ہے اور امریکی کارپردازوں نے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے ملبہ سے اپنے ادھورے نیو ورلڈ آرڈر کی تعمیر کا فیصلہ کر لیا ہے۔

امریکہ اُسامہ بن لادن اور افغانستان کو سزا دینے کیلئے ہمہ جہت انتظامات کر رہا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے۔ باقاعدہ حملہ، داخلی انتشار، وسیع البنیاد حکومت سمیت سبھی پہلوؤں پہ کام ہو رہا ہے اور ممکن ہے چند روز میں اس کا عملی مظاہرہ دُنیا دیکھ لے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دُنیا بھر میں یہ سوال اُٹھ رہے ہیں کہ آخر گیارہ ستمبر کے اندوہناک واقعات کے دیگر اسباب کو زیر غور کیوں نہیں لایا جا رہا۔ دراصل جیسے جیسے دھول بیٹھ رہی ہے کچھ نئے حقائق سامنے آ رہے ہیں۔ مثلاً 19 کے قریب ایسے عرب نژاد افراد کی نشاندھی کی گئی تھی جنھوں نے امریکی ماہرین کے مطابق مبینہ طور پر ہائی جیکنگ میں حصہ لیا تھا۔ لیکن ان میں سے پانچ سات افراد اب تک زندہ نکل آئے ہیں اور ان کا دھماکوں سے کوئی تعلق ثابت نہیں ہوا۔ محمد عطا کی کہانی بار بار سنائی جا رہی ہے۔ دیکھیں اس کی حقیقت کب کھلتی ہے۔

واقعات کے تیسرے روز امریکہ ہی سے کچھ لوگوں کی آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئیں کہ آخر وہ کون لوگ تھے جو دھماکوں سے پہلے ہی اپنے کیمرے لیکر ٹاورز کے ارد گرد ایسے مناسب مقامات پر جا بیٹھے جہاں سے فلم بنانا اور مناظر کو پوری طرح فوکس کرنا ممکن تھا۔

ابھی ورلڈ ٹریڈ سنٹر کا ہزاروں ٹن ملبہ باقی تھا کہ انکشاف ہوا کہ ٹریڈ سنٹر میں کام کرنے والے چار ہزار یہودی متعلقہ روز وہاں موجود نہیں تھے۔ چھٹی پر تھے یا غیر حاضر تھے۔ مزید چونکا دینے والی بات یہ ہے کہ کچھ یہودی کمپنیوں نے واقعہ سے چند روز پہلے اپنے دفاتر ورلڈ ٹریڈ سنٹر سے منتقل کر لئے تھے۔ نیو یارک سٹاک ایکسچینج نے کام شروع کیا تو پتہ چلا کہ واقعہ سے دو تین روز قبل دو فضائی کمپنیوں کے حصص خلاف معمول بڑے پیمانے پر فروخت کئے گئے۔ واقعہ کے نتیجہ میں ڈیڑھ لاکھ ڈالرز کا سودا 24 لاکھ ڈالرز کا منافع دے چکا تھا۔ سانحہ کے بارھویں روز تحقیقاتی اداروں کو مذکورہ بالا نکات پر اپنی توجہ مرکوز کرنے سے روک دیا گیا۔

امریکہ کے صدارتی الیکشن کو گزرے چند ماہ ہوئے ہیں۔ مذکورہ الیکشن کے معاملات پر نظر ڈالیں تو کچھ باتیں سوالیہ نشان نہیں رہتیں۔ بش کا مخالف ''الگور'' واضح طور پر یہودیوں کے ساتھ معاملات طے کر چکا تھا بلکہ ایک یہودی کو اپنا وائس پریذیڈنٹ بھی مقرر یعنی نامزد کر دیا گیا تھا۔ بش کی مخالفت میں وہ سب کچھ ہوا جو امریکہ کی تاریخ میں پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ نوبت مقدمہ بازی تک پہنچی اور عدالت کے حکم پر بش صاحب کو صدارت ملی۔

درون خانہ کشمکش نے کوئی انہونی صورت تو اختیار کرنا تھی۔ صیہونیوں کی دہشت گرد تنظیم جیوش ڈیفنس لیگ کی طرف اشارے ہو رہے ہیں۔ اس تنظیم کا مقصد ہی فلسطین کو کارنر کرنا ہے۔ غور فرمایئے واقعہ سے پہلے دُنیا بھر کے ذرائع ابلاغ میں فلسطینیوں پر اسرائیلی بربریت کو اوّلیت حاصل تھی۔ چنانچہ عالمی رائے عامہ کو کسی تند و تیز لہر میں تبدیل ہونے سے پہلے ہی واقعات کا ایک نیا اور ہولناک سلسلہ چھیڑ دیا گیا۔

ورلڈ ٹریڈ سنٹر پہ حملوں کے ساتھ ہی اسرائیل نے دُنیا بھر میں اپنے سفارت خانوں کو کام کرنے سے روک دیا اور سفارت کاروں کو محفوظ مقامات پہ چلے جانے کا حکم دے دیا۔ یہ حفظ ماتقدم کیوں ......؟ کیا اسے خدشہ تھا کہ یہ کارروائی فلسطینیوں نے کی ہے اور فلسطین میں اس کی بہیمیت کا جواب اسے ملنے والا ہے یا یہودیوں کے دل کا چور انہیں حفظ ماتقدم پہ مجبور کر رہا تھا۔ تنزانیہ میں امریکی سفارت خانے کی تباہی، جس کا الزام اُسامہ بن لادن کو دیا گیا، کے فوراً بعد سب سے پہلے داخل ہونے والی ریسکیو پارٹیاں یہودیوں پر مشتمل تھیں۔ ان کا وہاں فوراً داخل ہونا امدادی کاموں کیلئے نہیں بلکہ ایسے سراغ ختم کرنا تھا جو تحقیقات کا راستہ کھولنے میں مدد دے سکتے تھے۔ جب کہ تنزانیہ میں یہودی برائے نام ہیں۔ اسی طرح اب ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں بھی یہودی اپنا کام دکھا چکے ہیں لیکن الزام اُسامہ کو دیا جا رہا ہے۔ لیکن امریکہ کیلئے اُسامہ بن لادن کے علاوہ کسی کا ذکر کرنا اس کی ایجنسیوں کی توہین سمجھا جا رہا ہے۔

امریکی ایجنسیوں کے 40 ہزار افراد امریکہ اور بیرون امریکہ تحقیقات میں مصروف ہیں۔ بظاہر یہ لگتا ہے کہ اتنے اہلکار جب جھاڑیوں کا ایک ایک پتہ کھنگال رہے ہیں تو سراغ مل کر ہی رہے گا۔ لیکن ہو گا یہ کہ صرف ان رپورٹوں کو لائق اعتنا سمجھا جائے گا جن سے اُسامہ، فلسطینیوں یا کسی بھی ملک کے مسلمانوں کا تعلق نکلتا ہو گا۔ ورنہ امریکی ایجنسیوں کی کارکردگی، معیار اور مستعدی تو جیسی ہے وہ اب سب کے سامنے آ چکی ہے۔

گیارہ ستمبر کے واقعات کے فوراً بعد عوامی ردعمل کے نتیجہ میں امریکہ، یورپ اور آسٹریلیا میں پاکستانیوں، عربوں اور مسلمانوں کو تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ مسجدوں کی بے حرمتی کی جا رہی ہے۔ یہ عوامی ردعمل خود صدر بش اور کئی مغربی لیڈروں کے بیانات کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نتیجہ میں ظاہر ہوا۔ لیکن پھر ان لیڈروں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ اس طرح دو تہذیبوں کے درمیان ایسی جنگ چھڑ جائے گی جس کا انجام کسی کو معلوم نہیں۔ چنانچہ حدت کم کرنے کیلئے مغربی لیڈروں نے بیانات دیئے کہ اسلام تو ایک امن پسند مذہب ہے۔ صدر بش نے اسلامک سنٹر کا دورہ کیا اور انہیں بار بار کہنا پڑا کہ دہشت گردی کا تعلق کسی عقیدے سے نہیں۔ دنیا میں بیسیوں دہشت گرد تنظیمیں کام کر رہی ہیں۔ امریکہ کے استحصالی ہتھکنڈوں نے بھی اس کے بہت سے دشمن پیدا کر رکھے ہیں تو پھر نفرت کا نشانہ صرف پاکستانی یا عرب ہی کیوں ہے۔ آج تو دنیا بھر میں پاکستانی پاسپورٹ رکھنے والا فرد مشکوک نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ سب کیا دھرا امریکی میڈیا کا ہے، جس پر یہودی قابض ہیں۔ یہودیوں نے اس صورت حال کو جس طرح اپنے حق میں استعمال کیا ہے وہ انہی کا کمال ہے۔

یہودیوں کے بعد بھارت ایک ایسا ملک ہے جس نے ابن الوقتی کی زبردست مثال قائم کی۔ ادھر نیویارک اور واشنگٹن میں دہشت گردی کے واقعات ہوئے ادھر بھارتی ذرائع ابلاغ اور واجپائی کابینہ کے منتریوں نے پنجے اٹھا اٹھا کر شور مچانا شروع کر دیا کہ دہشت گردی کا دنیا میں خاتمہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ پاکستان کو فکس اپ کیا جائے۔ امریکہ کی زبان پر اسامہ بن لادن کا ورد شروع ہوا تو ایل کے ایڈوانی دنیا کو باور کرانے میں مصروف ہو گئے کہ لادن، طالبان اور پاکستان ایک ہی بات ہے۔ بھارتی میڈیا اور بھارتی سرکار کی ایک ہی خواہش اور کوشش تھی کہ امریکہ فوراً پاکستان کو دبوچ لے اور اس کے ساتھ وہ کچھ کرے جو وہ خود نہیں کر سکا۔ بھارت نے اپنے سارے نقاب الٹ دیئے۔ وہ پاکستان کا تیا پانچہ کرانے کیلئے امریکہ کو تمام تر سہولتیں اور تعاون پیش کر رہا تھا۔

بھارت کے خواب چکنا چور ہو گئے ہیں۔ حالات کا اونٹ اس کروٹ نہیں بیٹھا جو بھارت کی خواہش تھی۔ امریکہ بھارت کی بجائے پاکستان کو استعمال کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ پاکستان پہ "نظر کرم" ہو رہی ہے۔ پابندیاں اٹھائی جا رہی ہیں۔ امریکہ اور اس کے حلیف امداد دینے کا اعلان کر رہے ہیں۔ پاکستان کی معیشت کو سنبھالا دینے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ افغان مہاجرین کا بوجھ اٹھانے میں پاکستان کو امریکہ، برطانیہ اور دیگر ممالک سے امداد کی

یقین دہانی کرائی جا رہی ہے۔ کچھ امدادی سامان تو پہنچ بھی چکا ہے۔ افغانستان پہ فوجی حملہ کیا جائے یا شمالی اتحاد کو ظاہر شاہ کا مردہ دیکر وسیع البنیاد حکومت بنائی جائے۔ پاکستان کیلئے بہر حال خطرے کی گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ امریکی ایجنڈا اب دہشت گردوں کی بیخ کنی کے نام پر وسعت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس پروگرام میں دہشت گردوں، ان کے حمائتیوں اور ان کے کیمپوں سے ہمدردی رکھنے والی حکومتوں کے ساتھ ساتھ یا ان کی آڑ میں ایسے ملکوں اور حکومتوں کو بھی سیدھا کیا جائے گا جو امریکہ کے نیو ورلڈ آرڈر کی راہ میں رکاوٹ بن سکتے ہیں۔

موجودہ حالات کا خاطر خواہ نتیجہ نکلتے ہی امریکہ پاکستان کو اس کے جوہری پروگرام سے محروم کرنے کے اقدامات کرے گا۔ یہ مطالبہ بھی ہو سکتا ہے اور کوئی "اتفاقی حادثہ" بھی مثلاً افغانستان کو رگڑا دیتے ہوئے "غلطی" سے کچھ میزائیل پاکستان کے حساس مقامات پہ بھی گر سکتے ہیں۔ جیسے ماضی میں جو میزائیل پاکستان کو مطلع کئے بغیر افغانستان پہ داغے گئے تھے ان میں سے متعدد بلوچستان میں جا گرے تھے۔ ان کے لئے معذرت کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔ اب چونکہ صورتحال گمبھیر ہو جائے گی چنانچہ معذرت بھی کر لی جائے گی اور تلافی کیلئے دیگر شعبوں میں مدد کی حامی بھی بھر لی جائے گی۔

حکومت پاکستان کی یہ پریشانی صدر مملکت کے قوم سے خطاب میں واضح طور پر محسوس کی گئی ہے۔ لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ صدر مملکت جنرل پرویز مشرف کو ان باتوں کا پورا پورا احساس ہے۔ وہ امریکہ کی طرف دست تعاون بڑھاتے ہوئے یہ سب کچھ نظر میں رکھے ہوئے ہیں۔ امریکی حکام بھی یقین دہانیاں کراتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس خطہ میں امریکی اہداف اور مفادات اب کسی سے پوشیدہ نہیں۔ وہ............

- سینٹرل ایشیا کے تیل کے ذخائر پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔
- چین کی معیشت کو ضعیف کرنے کے ساتھ ساتھ عملاً چین کے گرد گھیرا تنگ کرنا چاہتا ہے۔
- بڑھتے ہوئے مسلم اثر و نفوذ کو کم از کم سو سال پیچھے دھکیلنا چاہتا ہے۔
- امریکہ اپنی اور اپنے اتحادیوں کی معیشت کو اس خطہ سے نیا خون فراہم کرنا چاہتا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس پس منظر میں امریکہ افغانستان کو عالمی برادری کا "اچھا رکن" بنانے کیلئے اپنی پوری ٹیکنالوجی، سفارتکاری، لاؤلشکر اور مصاحبوں کے ساتھ یہاں اترنے کیلئے پر تول رہا ہے۔ ہمارے ارباب اختیار واقتدار کیلئے امتحان کا وقت ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا وہ "مونگ پھلی" پہ مطمئن ہو جاتے ہیں......؟ اسی کے عشرہ کی طرح چند جیبوں کو بھرنے تک محدود رہتے ہیں یا قومی تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسی حکمت عملی اپناتے ہیں جو ہمارے ماضی کے دلدر دور کردے اور مستقبل کو محفوظ کردے۔ اللہ تعالیٰ انہیں قوم پرستی کے جذبات سے معمور کردے۔ آمین

نومبر 2001ء

انتھراکس کا ڈرامہ
حقائق کی روشنی میں

ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹاگون پہ حملوں کے بعد دہشت گردی کی ایک اور صورت "انتھراکس" کا شور سننے میں آیا۔ افغانستان میں شمالی اتحاد کے غلبے تک امریکہ چونکہ ناکامی سے دوچار تھا اور اس کی بمباری بے گناہ افغانوں کو چاٹ رہی تھی اور عالمی رائے عامہ میں اس حوالے سے اضطراب نمایاں ہو رہا تھا چنانچہ اسامہ بن لادن اور القائدہ کی "شرانگیزیوں اور بربریت" کی تصویر میں رنگ بھرنے کیلئے انتھراکس کے حوالے سے خوب شور مچایا گیا۔ مختلف مقامات پہ انتھراکس کے لفافے پہنچنے اور اس کے اثرات کی لپیٹ میں آنے والے افراد کا چرچا بھی خوب رہا۔ پہلا واقعہ فلوریڈا میں ہوا۔ انتھراکس ایک لفافے میں تھی۔ جسے اخبار کے ایک کارکن نے کھولا۔ اس کے بعد دوسرا واقعہ این بی سی ٹیلیویژن نیویارک کے دفتر میں ہوا۔ میڈیا کے بعد یہ مضر مادہ امریکی کانگریس میں پہنچایا گیا۔ میڈیکل ٹیسٹ کے بعد پتہ چلا کہ کانگریس کے 30 ملازمین متاثر ہوئے ہیں۔ ایف بی آئی اس کی تحقیقات کر رہی ہے لیکن امریکی صدر جارج بش نے قیاس آرائی شروع کر دی کہ "یہ کارروائی عالمی دہشت گردوں کی ہے، جن میں آج کل تنظیم القاعدہ سرفہرست ہے۔" صورت حال مرضی کے مطابق ہو جانے پر دہشت گردی کے اس ذریعے کا تذکرہ اب چھوڑ دیا گیا ہے۔ ممکن ہے ضرورت پڑنے پر اسے پھر اچھالا جائے۔

ہمارے ہاں زیادہ تر لوگوں کو انتھراکس کے بارے میں پوری طرح معلومات میسر نہیں ہیں اور چونکہ پاکستان میں بھی ایک بڑے اخبار کے دفتر تک اس زہریلے سفوف کی ترسیل عمل میں آچکی ہے اس لئے ضروری ہے کہ انتھراکس کے بارے میں عام لوگوں کی معلومات کیلئے بات کی جائے۔ انتھراکس ایک مہلک جلدی بیماری ہے جو عام طور پر حیوانات

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں پائی جاتی ہے۔ اس مرض کا موجب ایک بیکٹیریا ہوتا ہے جسے میڈیکل کی زبان میں بیسی لس انتھراکس کہتے ہیں۔ انسانوں میں یہ مرض جانوروں کے ذریعے پہنچتا ہے اور وہ لوگ جو مویشیوں کے ساتھ رہتے ہیں، بعض اوقات وہ اس کے شکار ہو جاتے ہیں۔
انتھراکس کا بیکٹیریا انسانی جسم میں تین ذرائع سے داخل ہوتا ہے۔ یعنی جلد، سانس اور غذا......!

ایک جرمن ماہر حیاتیات رابرٹ کوش نے اپنی جرم تھیوری ثابت کرنے کیلئے 1876ء میں انتھراکس بیکٹیریا کا استعمال کیا۔ 1881ء میں لوئی پاسچر نے سب سے پہلے انتھراکس کے خلاف ویکسین تیار کی لیکن اس مرض کا تذکرہ فراعین مصر کے دور میں بھی ملتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں فرعون کی پرستش کرنے والے مصریوں کے مویشیوں پہ اس مرض کا حملہ ہوا اور ان کے مویشی ہلاک ہو گئے لیکن بنی اسرائیل کے مویشی محفوظ رہے۔
بائبل میں مذکور ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو کہا کہ اگر تم نے بنی اسرائیل کو آزاد نہ کیا تو خدا تمہارے گھوڑوں، گدھوں، اونٹوں اور بیلوں پر ایک آفت نازل کرے گا۔ فرعون کی سرکشی پر بائبل کے مطابق خدا نے بھی کیا اور مصریوں کے تمام مویشی ہلاک ہو گئے اور بنی اسرائیل کا ایک مویشی بھی نہ مرا۔
شکاگو یونیورسٹی کے ایک محقق مسٹر چیمبر ڈرم کا کہنا ہے کہ "حضرت موسیٰ نے آگ سے راکھ لیکر فضا میں بکھیری، جس سے فرعون کے مویشیوں اور سپاہیوں دونوں میں انتھراکس کا زہریلا پن پیدا ہو گیا۔" ماہرین کا کہنا ہے کہ جو جراثیم ہوا کے دوش پر چلتے ہیں، ان کا دفاع ایک مشکل بات ہوتی ہے۔
انتھراکس کا بیکٹیریا چونکہ لیبارٹری میں افزائش دے کر حیاتیاتی حملے میں استعمال ہو سکتا ہے اور حالیہ دنوں میں اس کا یہ استعمال دنیا کے سامنے آ بھی چکا ہے۔ اس لئے لوگوں میں خوف و ہراس پھیلانے کا ذریعہ بنایا جا رہا ہے۔ اگرچہ یہ ایک مہلک بیماری ہے لیکن اس سے تحفظ اور تدارک بھی موجود ہے اور اس کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے۔
جلد کے ذریعے داخل ہونے والا انتھراکس کا بیکٹیریا اس مقام پہ حملہ آور ہوتا ہے

جہاں زخم یا خراش ہو، جس جگہ یہ داخل ہوتا ہے وہاں ابتدا میں آبلہ سا پڑ جاتا ہے۔ بعد میں اردگرد کی بافتیں سخت ہو جاتی ہیں۔ لمف نوڈز میں سوزش آ جاتی ہیں۔ چنانچہ انفیکشن پھیلنے لگتی ہے اور انجام کار مریض موت کی وادی میں اتر جاتا ہے۔
سانس کے ذریعے داخل ہونے والا انتھراکس عموماً چمڑے، اون اور جانوروں کے اعضا کا کاروبار کرنے والے لوگوں پہ اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کی علامت نمونیہ ہے۔ یعنی مذکورہ لوگ اس کا شکار ہونے کے بعد سب سے پہلے نمونیہ میں مبتلا ہوتے ہیں اور پھر تفصیلی تشخیص اصل مرض کی نشاندہی کرتی ہے، بلغم اور زخم کے مواد کو کلچر کر کے اس کا سراغ لگایا جاتا ہے۔ اس مرض میں مبتلا جانور کی اون، چمڑے اور بافتوں سے بیکٹیریا قریبی افراد کے سانس میں پہنچ جاتا ہے۔
کھانے کے ذریعے اس بیکٹیریا کا معدے میں پہنچنے کا سبب یہ ہوتا ہے کہ انتھراکس میں مبتلا جانور کا گوشت کھایا جاتا ہے۔ ایسے جانور کا گوشت براہ راست نہ بھی کھایا جائے تو بھی گندگی کی وجہ سے لوگ اس کی زد میں آ جاتے ہیں۔ مثلاً انتھراکس زدہ جانور پر بیٹھنے والی مکھیاں یہ مرض پھیلانے کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ ان ذرائع سے پھیلنے والا بیکٹیریا 7 دن کے اندر نشوونما پاتا ہے اور ایک سے دوسرے آدمی تک منتقل ہو سکتا ہے تاہم اس ذریعہ سے یہ مرض بہت کم پھیلتا ہے۔ اس ذریعہ سے لاحق ہونے والے مرض میں مریض کے پیٹ میں درد شروع ہو جاتا ہے اور اسے خون کے ساتھ دست آنے لگتے ہیں۔
جلد پر حملہ صرف 20 فی صد تک خطرناک سمجھا جاتا ہے۔ معدہ پر انتھراکس کا حملہ 25 سے 60 فی صد تک اور پھیپھڑوں پہ حملہ 90 فی صد تک خطرناک قرار دیا جاتا ہے۔ جلد پر حملہ کی علامت آبلے کی طرح زخم پیدا ہونا ہے جو ایک سے دو ہفتے تک رہتا ہے۔ معدے پر حملے کی صورت میں قے، متلی، تھکاوٹ، بھوک کا ختم ہو جانا، بخار، اینٹھن اور خون والے پاخانے ہیں۔ پھیپھڑوں پہ حملے کی علامت میں فلو اور بخار کے ساتھ چھاتی میں درد محسوس ہوتا ہے اور خون آتا ہے۔
انتھراکس متعدی بیماری نہیں ہے۔ یعنی ایک سے دوسرے شخص کو نہیں لگتی۔ بروقت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تشخیص اور درست علاج موثر ثابت ہوتا ہے۔اس مرض کے مریضوں کے علاج ابتدائی حالت ہی میں نہایت آسانی سے کیا جاسکتا ہے اوراس کیلئے اینٹی بائیوٹک ادویات استعمال کی جاتی ہیں۔

احتیاطی اقدام کے طور پر گوشت کی خریداری پہ توجہ دی جائے۔معمولی سا شبہ بھی پیدا ہو جائے تو مشکوک گوشت مت خریدیں اور زیر استعمال نہ لائیں۔ذبح کیئے گئے جانور کا گوشت اپنے رنگ روپ سے صحت مند نظر آ جاتا ہے۔

جن کارخانوں میں جانوروں کے اعضا، اون، بال، گوشت وغیرہ سے مصنوعات تیار کی جاتی ہیں وہاں کارکنوں کو احتیاط کی ضرورت ہے۔کام کے دوران ناک پہ ماسک مناسب احتیاطی اقدام رہتا ہے۔

ڈاک وغیرہ سے آپ کو مشکوک لفافہ یا پیکٹ موصول ہو تو نہ تو اس کو ہلائیں اور نہ اس کے اندر سے کوئی چیز نکالیں۔ایسے لفافے یا پیکٹ کو کسی پلاسٹک کے تھیلے یا ڈبے میں ڈال کر اچھی طرح بند کردیں تاکہ اندر کا مواد باہر نہ نکلے۔انتھراکس کا پاؤڈر اور پاؤڈر والا لفافہ نیچے گر جائے تو صاف کرنے کی کوشش نہ کیجئے۔اسے کسی موٹے کاغذ یا برتن سے ڈھانپ کر متعلقہ ذمہ دار سرکاری اہل کاروں کو مطلع کیجئے۔جس کمرے میں انتھراکس کے پاؤڈر کی موجودگی کا پتہ چلے اس کے کھڑکیاں دروازے بند کر کے اسے باقی عمارت سے الگ تھلگ کردیں۔خطرے کا نشان لگا کر اس کمرے یا اس جگہ سے لوگوں کو دور رکھیں۔

اگر آپ کے ہاتھوں سے مشکوک لفافہ گزر چکا ہے تو اپنے ہاتھ صابن اور پانی سے خوب دھوئیں اور مذکورہ اقدامات کے بعد فوراً مقامی پولیس کو اطلاع دیں۔

سوال یہ ہے کہ اگر لوئی پاسچر نے 1881ء میں چکن کولرا کے خلاف اپنی ویکسین بنانے سے پہلے انتھراکس کے خلاف ویکسین بنالی تھی تو اب 2001ء میں اتنی پریشانی کیوں ہے......؟اب تک تو یہ اتنی عام ہو جانا چاہیے تھی جتنی دوسرے امراض کی ویکسین ہیں۔لیکن جو ویکسین بنائی گئی تھی وہ جانوروں کیلئے تھی۔کیونکہ انتھراکس جانوروں کی بیماری تھی لیکن حضرت موسیٰؑ کا معجزہ تھا کہ اس سے فرعون کے سپاہی بھی متاثر ہوئے۔تب سے یہ انسانوں

کو بھی لاحق ہو جاتی ہے۔لیکن اتنی عام نہیں جس طرح دیگر وبائی امراض ہیں۔البتہ اسے ایک جنگی ہتھیار کے طور پر زیر استعمال لانے کیلئے تجربات کئے گئے اور پھر اس کا بیکٹیریا لیبارٹریوں میں تیار کرلیا گیا۔لیکن یہ بیکٹیریا بنانے کا طریقہ کار دودھ کو دہی میں تبدیل کرنے جیسا آسان اور سستا طریقہ کار نہیں ہے جسے کوئی بھی ملک اور کوئی بھی تنظیم اندھادھند اخراجات کر کے تیار کرتی پھرے۔دراصل امریکہ بہادر اپنی سوچی سمجھی حکمت عملی کے تحت افغانستان میں مستقل طور پر اترنے کیلئے ایک اور جواز بنا رہا ہے۔جس طرح اس نے خلیجی جنگ سے پہلے صدام حسین کی عسکری تجربہ گاہوں میں حیاتیاتی بم بننے کی سنسنی خیز رپورٹیں شائع اور نشر کروائی تھیں۔اسی طرح افغانستان میں کسی بھی طرح کی مزاحمت کو کچلنے کی سرگرمیوں کا جائز جواز بین الاقوامی برادری کے سامنے رکھنے کیلئے انتھراکس کے لفافے مختلف مقامات پر پہنچنے کی رپورٹیں نشر کی جارہی ہیں۔ان رپورٹوں کے ذریعے عالمی رائے عامہ کو یہ باور کرانا مقصود ہے کہ اگر افغانستان اور افغانستان سے باہر "القاعدہ" کا قلع قمع نہ کیا گیا تو یہ مہلک لفافے اس کی طرف سے ارسال ہوتے رہیں گے اور پوری دُنیا کیلئے خطرہ بنے رہیں گے۔

جس طرح عراق کے جراثیمی ہتھیاروں کے افسانے وقت گزرنے کے ساتھ بھلا دیئے گئے اسی طرح القاعدہ کے انتھراکس لفافے بھی طاق نسیاں کی نذر ہو جائیں گے کیونکہ نہ پہلے افسانوں میں کوئی حقیقت تھی اور نہ موجودہ ڈراموں کا حقائق سے تعلق ہے۔افغانستان میں حالات کا اونٹ جس کروٹ بیٹھ رہا ہے لگتا ہے اب انتھراکس کی بجائے کچھ اور قسم کی "دہشت گردیوں" کی بیخ کنی کا آغاز ہونے والا ہے۔

دیکھیئے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا کیا ہے؟

دسمبر 2001ء

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سمندر پار پاکستانی

گیارہ ستمبر 2001ء کے بعد دُنیا نے امریکہ اور اہل مغرب کا ایک نیا چہرہ دیکھا ہے۔ یہ چہرہ جس خوبصورت نقاب کے پیچھے تھا، اسے ورلڈ ٹریڈ ٹاورز کی تباہی نے ایک ہی جھٹکے میں نوچ کر پرے پھینک دیا ہے۔ وسیع المشربی، روشن خیالی، عدم امتیاز، سیکولرازم اور جمہوری اقدار ایک ہی ریلے میں بہہ گئے ہیں۔ امریکی ارباب بست وکشاد نے "نیو ورلڈ آرڈر" کی جو بات چھیڑ رکھی تھی اس کی عملی صورت سامنے آ گئی ہے۔ لیکن نیو ورلڈ آڈر پہ عملدرآمد کا یہ انداز کتنا قابل نفرت ہے، اسے افغانستان میں ساری دُنیا نے دیکھ لیا ہے۔ یہ انداز اپنانے والے کتنے سفاک ثابت ہوئے ہیں۔ اس سنسنی خیز ڈرامے کی تکمیل کیلئے نہ جانے کن سادہ لوح "جانبازوں" کو طیاروں کے ذریعے خودکش حملوں پہ تیار اور استعمال کیا گیا، شاید کبھی اس سازش کو بے نقاب کیا جا سکے؟ اگر ان "دہشت گردوں" کو ٹاورز کی تباہی کے نتیجے میں مرتب ہونے والے عالمی اثرات کا رتی بھر اندازہ ہو جاتا تو وہ یقیناً کبھی بھی اس حماقت کیلئے تیار نہ ہوتے۔

ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے خونی ڈرامے کو اس طرح سٹیج کیا گیا کہ تہذیبوں کا تصادم تصور سے نکل کر عملی صورت اختیار کر گیا۔ امریکہ کے نزدیک انصاف کا تقاضا یہ ٹھہرا کہ صلیبی جنگوں کا قرض اتارا جائے۔ دُنیا کو مسلم اور مسیحی تقسیم سے روشناس کرایا جائے اور پھر یہ سب کچھ ہو گیا۔ تہذیبوں کے تصادم کے نام پر متعصب عیسائی اور یہودی دانشور یہ کام پچھلے کئی برسوں سے کر رہے تھے۔ بس ایک بڑے حادثے کی ضرورت تھی جو اپنے ٹائم ٹیبل کے مطابق اور سوچے سمجھے منصوبے کے تحت وقوع پذیر ہوا اور اس کی آڑ میں نیو ورلڈ آرڈر، مذہبی تعصب، تجارتی مفادات اور اقتصادی تسلط کے تمام اہداف حاصل ہو گئے۔

ترقی یافتہ دُنیا جو اگرچہ مسیحی ہے لیکن اپنی مذہبی وابستگی یا نسبت کا مظاہرہ صرف کرسمس کے موقعہ پر ایک شائستہ اور خوبصورت انداز میں کیا کرتی تھی یکا یک "صلیبی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جذبے" سے بھر گئی ہے۔ امریکہ، کینیڈا اور یورپ سے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ تک مسلمانوں کو شعلہ بار نظروں سے دیکھا جانے لگا ہے۔ امن و سلامتی کی روح رکھنے والے اسلام کے پیروکاروں کو دہشت گرد قرار دے دیا گیا ہے۔

افغانستان میں امریکہ کا اترنا اس کے مفادات کے تحفظ کیلئے نہایت ضروری تھا۔ وسطی ایشیاء کی معدنی دولت اور چین کے محاصرہ کیلئے اپنی آمد کا جواز تو امریکہ نے بہرطور تلاش کرنا ہی تھا۔ اسامہ بن لادن اور طالبان کو مجرم قرار دے دیا گیا۔ لیکن اس تمام تر قضیئے میں پاکستان کا نام بھی زبان زد خاص و عام ہو گیا۔ اب "آزاد دُنیا" میں مسلمان معتوب، عرب ناپسندیدہ اور پاکستانی ناقابل اعتبار بنا دیئے گئے ہیں۔ پاکستان تو خاص طور پر عجیب و غریب صورتحال سے دوچار ہے۔ اس کی تجارت نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔ جو تھوڑا بہت مال بیرون ملک جا رہا ہے۔ اس پر بھی "ساختہ پاکستان" لکھنے کی اجازت نہیں۔ جو امداد اور قرض پاکستان کو دیا گیا ہے اس سے کئی گنا زیادہ نقصان ہو چکا ہے اور مسلسل ہو رہا ہے۔ انٹرنیٹ پر مہذب دنیا پاکستان کے لوگوں کے ساتھ چیٹنگ بھی گوارا نہیں کرتی۔ انہیں کسی طرح کی معلومات فراہم نہیں کی جا رہی ہیں۔ بیرون ملک سفر کرنے والے پاکستانی خاص طور پر لوگوں کی ناپسندیدہ نظروں کا نشانہ بنتے ہیں۔ پاکستانیوں کا امیج اگرچہ ماضی میں بھی کچھ زیادہ اچھا نہیں تھا اور اس کے ذمہ دار ہم خود ہیں لیکن اب نئی صورتحال میں ان کے خلاف تعصب میں شدت پیدا کر دی گئی ہے۔

11 ستمبر سے پہلے پاکستان کا ہر وہ شخص جو کالے یا سفید دھن کا مالک تھا، پاکستان سے نکلنے کیلئے کالے یا سفید جتن کر رہا تھا۔ سرمایہ باہر بھجوانے کا عمل تو خیر سے بڑی باقاعدگی اور منظم طریقے سے جاری تھا۔ وہ طبقات جو اقتدار میں یا اقتدار کے قریب تھے۔ بیورو کریسی میں یا اس کے چہیتے تھے وہ تو اپنے بنک اکاؤنٹ رکھتے ہی باہر تھے۔ دبئی اس کام کیلئے بہترین اور قریب ترین مقام ہے۔ وہاں جانے کیلئے ویزے وغیرہ کا بھی کوئی مسئلہ درپیش نہیں ہوتا۔ بس ٹکٹ لیجئے۔ جہاز میں بیٹھ کر ویزا فارم پر کیجئے ایئرپورٹ پر اتر کر امیگریشن سے ویزے پر 15 دن کی مہر لگوایئے اور پھر جو جی چاہیے کیجئے۔ مزید قیام کرنا ہو تو ویزے میں پندرہ دن کی مزید توسیع ہو سکتی ہے۔ دبئی میں دُنیا بھر کے بنک موجود ہیں۔ جس

طرح کا چاہے اکاؤنٹ کھلوایئے اور پھر دُنیا کے کسی کونے میں اپنی رقم منتقل کر لیجئے۔

سرمایہ باہر منتقل کرنے کے علاوہ خود باہر منتقل ہونے کا رجحان بھی جنون کی حدوں کو چھو رہا تھا۔ امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا اور یورپ کی چمک دمک اور کھل کھیلنے کے مواقع پاکستانیوں کو اپنے ہاں نقل مکانی کی دعوت دیتے ہیں اور پاکستانی اپنی مہارتوں اور اثاثوں سمیت وہاں جانے کیلئے بےقرار اور اس کیلئے ہر جائز و ناجائز ذریعہ اختیار کرنے کیلئے تیار رہتے ہیں۔ 11 ستمبر سے پہلے صورتحال مختلف تھی۔ امریکہ کے ویزا لاٹری سسٹم اور آسٹریلیا اور کینیڈا کے امیگریشن سسٹم کے تحت پاکستانی کشاں کشاں ان ملکوں کو منتقل ہو رہے تھے۔ برطانیہ اور جرمنی تو ہمارے ہم وطنوں کی بہت پرانی منزلیں تھیں۔ لیکن اب امریکہ نے ویزا لاٹری سسٹم میں سے پاکستان سے آنے والی درخواستوں کو شامل کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ دوسرے ممالک بھی پاکستانیوں پر اپنے دروازے بند کر چکے ہیں۔ لیکن حیرت ہے کہ پاکستانی اخبارات میں اب بھی ان ملکوں کو بھجوانے والے تجارتی اداروں اور ان کے ایجنٹوں کے پورے پورے صفحے کے اشتہارات شائع ہو رہے ہیں۔ اب بھی جھانسے دیئے جا رہے ہیں کہ ہم آپ کو اثاثوں سمیت مذکورہ ملکوں میں مستقل سکونت دلوا سکتے ہیں۔ کیا ان کو پوچھنے والا کوئی نہیں؟ کیا حکومت ان لٹیروں سے یہ نہیں پوچھ سکتی کہ آپ لوگ کس بنیاد پر یہ اشتہار چھپوا رہے ہیں۔ جب کچھ لٹیرے سادہ اور لاعلم مگر بیرون ملک جا بسنے کے جنون میں مبتلا لوگوں کو چکمہ دے کر غائب ہو جائیں گے تو پھر قانون حرکت میں آئے گا؟

خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی۔ ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ نئی صورتحال میں یورپ، امریکہ اور آسٹریلیا جیسے ممالک میں پاکستان کا نام لینا بھی گناہ بن چکا ہے۔ وہاں رہنے والے پاکستانی ہی جانتے ہیں کہ اب وہ کس عذاب سے گزر رہے ہیں۔ ناجائز ذرائع سے وہاں داخل ہونے والوں کی حالت تو رہی ایک طرف، جائز طریقے سے اور متعلقہ ممالک کی شہریت کے ساتھ برسوں سے وہاں رہنے والے پاکستانی اچھوت بن کر رہ گئے ہیں۔ ہر بستی، بلاک، بازار اور دفاتر میں پاکستانیوں کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ صرف امریکہ سے روزانہ 25 تا 30 خاندان اپنا بوریا بستر سمیٹ کر واپس وطن آ رہے ہیں جبکہ زیادہ تر پاکستانی وطن عزیز کی سماجی اور اقتصادی صورت حال

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے نالاں ہونے کی وجہ سے واپسی کی بجائے افریقہ اور مشرق وسطیٰ میں منتقل ہو رہے ہیں۔

یہ صورتحال عارضی نہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں پاکستانیوں کا رہنا اب روز بروز مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ 11 ستمبر کے بعد عالمی بساط پہ جو کچھ ہو رہا ہے اس میں اب ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ سمندر پار پاکستانی جن مسائل سے دوچار ہو رہے ہیں ان کا حل کیا ہے۔ ہم اپنے ان بھائیوں کیلئے کیا کر سکتے ہیں اور مسائل کا مستقل حل کیا ہے؟

ہر تخریب میں تعمیر کا پہلو بھی مضمر رہتا ہے۔ حالات نے ہمیں ایک اچھا موقعہ دیا ہے کہ بیرون ملک رہنے والے پاکستانیوں کو وطن واپسی پہ مائل کریں۔ انہیں اپنے اثاثوں سمیت ایک ملک سے اٹھ کر دوسرے ملک میں جا بسنے کی بجائے اپنے وطن لوٹ آنے کی ترغیب دیں۔ جدید ذرائع ابلاغ نے دنیا کے دور دراز گوشوں میں مقیم لوگوں سے رابطے کا کام آسان بنا دیا ہے۔ ان ذرائع ابلاغ کو استعمال میں لا کر سمندر پار بسنے والے پاکستانیوں کو وطن کی یاد دلائیں۔ انہیں باور کرائیں کہ آخری پناہ ہمیشہ اپنی دھرتی ہوا کرتی ہے۔ انہیں دھرتی ماں سے ناطہ توڑنے کی سزا مل رہی ہے۔ مانا کہ اپنے وطن میں معیار زندگی اور سماجی قدریں مثالی نہیں ہیں لیکن ماں چاہے بدصورت ہو، ماں ہی ہوتی ہے اس سے رشتے توڑے نہیں جاتے۔ دھرتی ماں ان کیلئے بازو پھیلائے ہوئے ہے۔ اس کے دامن میں پناہ لیں۔ اس وطن کی بدنمائیاں اور بدصورتیاں دور کرنے کا عزم لے کر واپس آئیں۔ بیرون ملک اخبارات اور ٹی وی چینلو کے ذریعے انہیں پیغامات پہنچائیں۔ جس طرح ٹورسٹوں کو مائل کرنے کیلئے تشہیری مہم چلائی جاتی ہے۔ اسی طرح دھرتی کے بیٹوں کو اپنی دھرتی، اپنی ثقافت، اپنے مذہب اور اپنی تہذیب سے ٹوٹے رشتے جوڑنے پر آمادہ کریں۔

سرکاری سطح پر ان امور کو زیر غور لایا جائے جو بیرون ملک رہنے والے پاکستانیوں کو وطن واپسی سے روکے ہوئے ہیں۔ رکاوٹوں کو دور کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ وہ تمام عملی اقدامات کئے جائیں جو دھرتی ماں کے روٹھے ہوئے بیٹوں کو واپس لا سکتے ہیں۔ کامیاب حکمت عملی اپنانے کیلئے فوری طور پر ملک میں سیمینار منعقد کرائے جائیں۔ فوری اور دوررس منصوبہ بندی کی جائے۔ ماضی میں بیرون ملک منتقل ہونے والوں کو مندرجہ ذیل امور نے ترک وطن پہ مجبور کیا۔

1- عدم تحفظ (اقتصادی اور سماجی)

2- سرکاری اہل کاروں کا منفی رویہ

3- کاروبار اور ملازمتوں کے کم مواقع اور ناکافی آمدنیاں

4- کمزور معاشی ماحول

5- ٹیکسوں کا نظام

6- مہنگائی

مندرجہ بالا نکات میں یقیناً بہتری آ چکی ہے۔ اوورسیز پاکستانیوں کو اب باور کرایا جا سکتا ہے کہ بیرون ملک تیسرے درجے کے شہری بننے اور نفرتوں کا نشانہ بننے کی بجائے وطن میں رہنا اب ماضی کے برعکس زیادہ مناسب اور موزوں ہے۔ امن و امان کی صورتحال بلاشبہ بہتر ہے۔ اکا دکا واقعات برسوں کے اثرات کی معمولی تلچھٹ ہے۔ اگر ہم اپنے سرمایہ داروں، ہنرمندوں اور مختلف شعبوں کے ماہر افراد کو واپس لے آئیں اور انہیں ان کی صلاحیتوں کے مطابق کام کرنے کا موقعہ دیں تو وہ اپنے ساتھ کروڑوں ڈالر لیکر واپس آئیں گے۔ ان کی صلاحیتیں درست سمت میں مرکوز ہوں گی تو ہمارے ملک کے ہی نہیں خود ان کے بہت سے مسائل حل ہوں گے۔

اوورسیز پاکستانیوں کو درپیش مسائل کا حل ان کی وطن واپسی میں ہے۔ انہیں ترغیبات دی جائیں۔ انہیں رعائتیں دی جائیں۔ ان کے ذہنی تحفظات کو دور کیا جائے۔ ان لوگوں کی واپسی سے سرمایہ کاری میں اضافہ ہوگا۔ ہماری بچتوں کی شرح بڑھے گی۔ مختلف شعبوں کی پیداوار اور کارکردگی بڑھے گی۔ ہم بہت سی درآمدات سے بے نیاز ہو جائیں گے۔ قیمتی زرمبادلہ بچے گا۔ ملک قرض کی لعنت سے نجات پا سکے گا۔ یقین کیجئے ماضی میں ہمارے ملک سے سرمائے اور ذہن کی دولت کا جو سیلاب امریکہ اور مغرب کی طرف رواں دواں تھا۔ وہ اب واپسی کا رخ اختیار کر سکتا ہے۔ ہماری قسمت بدل سکتی ہے۔ اس کا رخ موڑیئے اور اس کا استقبال کیجئے۔ قوموں کی زندگی میں ایسے مواقع بار بار نہیں آیا کرتے۔

جنوری 2002ء

ایشیا میں امریکی مفادات اور پاکستان

بھارت مسلسل پاکستان کی سرحدوں پر اپنی فوجوں کا اجتماع برقرار رکھ کر پاکستان کو بلیک میل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ بھارت کے اس اقدام کو امریکہ کی پشت پناہی بھی حاصل ہے۔ امریکہ کی موجودہ حکومت ایشیا میں اپنے مقاصد حاصل کرنے کیلئے پاکستان سے زیادہ سے زیادہ کام لینا چاہتی ہے اور اگر کسی مرحلہ پر پاکستان امریکی عزائم کی تکمیل میں لیت ولعل سے کام لے تو اسے بھارت کا ہوا دکھایا جا سکے۔ اس وقت صورتحال یہ ہے کہ امریکہ پاکستان کے ایک پڑوسی افغانستان میں عملاً موجود ہے۔ دوسرے پڑوسی بھارت کے ساتھ تاریخ کے سب سے بڑے فوجی، تکنیکی اور سیاسی تعاون میں مصروف ہے۔ اسے مستقبل کے خاکے میں اپنی مرضی کا رنگ بھرنے کیلئے پاکستان کے ساتھ ساتھ بھارتی اعانت کی بھی ضرورت ہے۔ ان حالات میں پاکستان کو مشورہ دیا جا رہا ہے کہ وہ کشمیر کے مسئلہ کو اپنی ترجیحات سے نکال نہیں سکتا تو نیچے ضرور لائے۔

امریکی حکام پاکستان کے عوام اور حکومت کو اشاروں کنایوں میں اور کبھی کھل کر ''سمجھانے'' کی کوشش کر رہے ہیں کہ کشمیر میں سیز فائر لائن کو مستقل اور بین الاقوامی سرحد تسلیم کر کے کشمیر کا جھگڑا ہمیشہ کیلئے ختم کر دے اسی میں عافیت اور خوشحال مستقبل کا راز پنہاں ہے۔ ورنہ بھارت اسے ''سبق سکھانے'' کیلئے تیار بیٹھا ہے اور اسے صرف امریکہ نے روکا ہوا ہے۔ اسی پس منظر میں بھارتی حکمران آئے دن پاکستان کو دھمکیاں دیتے رہتے ہیں۔ کبھی امریکہ کی طرح پاکستان کو افغانستان بنانے کی گیدڑ بھبھکی دی جاتی ہیں اور کبھی لاہور اور کراچی میں ترنگا لہرانے کی بڑھکیں ماری جاتی ہیں۔ واجپائی اور ایڈوانی صبح و شام یہی راگ الاپتے رہتے ہیں کہ ''پاکستان سے مذاکرات نہیں ہو سکتے۔ پاکستان کا رویہ درست نہیں۔'' اور اب عراق پر امریکی حملے کی امکانی فضا میں کہا گیا ہے کہ بھارت بھی امریکہ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے پاکستان کو عراق بنا دے گا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ان حالات میں صدر جنرل پرویز مشرف نے بہت بروقت اور بہت مناسب جواب دیا ہے کہ "نہ آپ امریکہ ہیں اور نہ ہم عراق......اگر ہم پر جنگ تھونپی گئی تو بھرپور جواب دیں گے۔" صدر پرویز مشرف نے بلاشبہ ہمیشہ پاکستان کا موقف جرأت مندانہ طریقے سے بیان کیا ہے۔ بالخصوص کشمیر کے حوالے سے ان کا دوٹوک انداز پاکستانی رائے عامہ کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ انہوں نے امریکی دورے اور اقوام متحدہ میں اپنے خطابات کے دوران کنٹرول لائن کو مستقل بنانے کی تجویز کو بار بار مسترد کیا ہے۔ پاکستان کے نکتہ نظر سے یہ کوئی ہٹ دھرمی یا شرانگیزی نہیں ہے۔ پچپن سال سے پاکستان ایک منصفانہ اور معقول موقف اپنائے ہوئے ہے۔ اس کیلئے اپنی توانائیاں صرف کر رہا ہے۔ آج وہ کس طرح امریکی مفادات کیلئے اپنے عوام کی پچپن سالہ قربانیاں بھارت کی جھولی میں ڈال دے۔ غلط موقف پر تو رجوع کیا جاسکتا ہے۔ اپنی غلطیوں کا تو اعتراف کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ایک جائز اور منصفانہ موقف سے آخر کیوں دستبردار ہوا جائے؟

بین الاقوامی فضا بتا رہی ہے کہ امریکہ عراق پر حملہ ضرور کرے گا۔ اسے اپنے منصوبوں کی تکمیل کیلئے ایشیاء میں ایک قدم اور آگے بڑھانا ہے۔ لیکن اس دفعہ عراق پر امریکی یلغار کی پشت پر 1990ء کی طرح بھرپور عالمی رائے عامہ نہیں ہوگی۔ روس، جرمنی اور یورپ کے دیگر ممالک امریکہ کی غیر مشروط حمایت نہیں کریں گے بلکہ اس دفعہ امکان ہے کہ ان کی پالیسیاں ذرا مختلف ہوں گی۔ ان حالات سے فائدہ اٹھانے کیلئے پاکستان کو سرگرم ہونے کی ضرورت ہے۔ چین، روس، ایران اور جرمنی جیسے ممالک سے رابطے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ صدر مشرف نے جنرل اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے واضح انداز میں کہا ہے کہ عراق پر امریکی حملہ پاکستان اور خطے میں مسلم شدت پسندی کو بھڑکائے گا۔ افغانستان میں امریکی اقدامات نے پاکستان کو پہلے ہی انتہا پسندوں کا نشانہ بنا رکھا ہے۔ عراق پر امریکی حملے کا ردعمل صرف پاکستان کو ہی نہیں امریکی مفادات کو بھی نقصان پہنچائے گا۔ صورتحال کو سنگینی سے بچانے اور دہشت گردی کے خلاف پاکستان کو بھرپور کردار ادا کرنے کے قابل بنانے کیلئے امریکہ کو چاہیے کہ بھارت کو اپنی فوجیں واپس بلانے اور پاکستان کے ساتھ بامقصد مذاکرات کی میز پر آنے پر مجبور کرے ورنہ جنوبی

ایشیا کا منظر امریکہ کیلئے سازگار نہیں رہے گا۔

پاکستان کیلئے اب ضروری ہو گیا ہے کہ وہ اپنی آزادی، خودمختاری اور سالمیت کیلئے "پروفیشنل آرمی" کے ساتھ ساتھ 14 کروڑ عوام کی طاقت کو منظم کرے، نیشنل آرمی مرتب کرے اور ایک چوتھی لڑائی لڑنے کیلئے تیار رہے۔ ہماری سرحدوں پر تقریباً سال بھر سے دشمن نے ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔ دشمن اپنے ملک میں عوام کو منظم کر رہا ہے۔ ہم اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی بات تو کرتے ہیں۔ بین الاقوامی برادری کو بھی بتاتے ہیں کہ بھارت کے ایک غلط اندازے سے امن تباہ ہو سکتا ہے۔ لیکن خدانخواستہ اگر بھارت امن تباہ کرنے پر تل گیا تو ہم اپنے شہریوں کے جان و مال کے تحفظ اور عوام کا مورال بلند کرنے کیلئے عوامی سطح پر کیا کر رہے ہیں؟ ان باتوں کی تیاری تو راتوں رات نہیں ہوتی۔ ادھر بھارت نے "شیو سینا" ہندو قوم پرست خفیہ فوج گلی گلی پھیلا دی ہے۔ شہری بستیوں میں ہر گلی میں کم از کم پانچ افراد پر مشتمل ایک بنیادی یونٹ بنا دیا گیا ہے ادھر ہم جنگ سے بچنے کی باتیں کرتے ہیں یقیناً جنگ سے گریز اور پہل نہ کرنا مسلمان کی روایت ہے۔ لیکن اپنے گھوڑے تیار رکھنا بھی مسلمان کا فرض ہے۔ پاکستانی شہریوں کو تو آج تک بلیک آؤٹ شہری دفاع اور کرفیو کی ریہرسل بھی ایک دفعہ نہیں کرائی گئی۔ غالباً سرکاری سطح پر یہ موقف اختیار کیا گیا ہے کہ اس طرح کے اقدامات سے ہراساں ہونے کا تاثر ملتا ہے۔ لیکن اس سے دشمن کو یہ بھی تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا مدمقابل پوری طرح تیار ہے اور پھر اپنے عوام کو شہری دفاع کی تربیت دینے میں آخر کیا قباحت ہے؟

کچھ حلقے یہ تاثر دے رہے ہیں کہ امریکہ بھارت کو پاکستان کے خلاف جارحیت سے روکے ہوئے ہے اور یہ اُن یقین دہانیوں میں سے ایک ہے جو ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی کے بعد پاکستان سے تعاون کے بدلے کرائی گئی تھیں۔ پاکستان کو یقین دلایا گیا تھا کہ بھارت آپ کے ساتھ کوئی گڑبڑ نہیں کرے گا۔ بھارت کے ساتھ آپ کے مذاکرات شروع کرائے جائیں گے اور کابل میں شمالی اتحاد کی حکومت نہیں بنے گی۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ امریکی اپنے وعدے بھول گئے۔ افغانستان میں حکومت تشکیل دینے کیلئے جو بون ایگری منٹ ہوا، اس میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پاکستان کی خواہشات کو نظر انداز کر دیا گیا۔ بھارت کے ساتھ بامقصد مذاکرات شروع کرانے کی بجائے بھارت کی طرف سے دھمکیاں دلوائی جارہی ہیں۔ کشمیر کے مسئلہ کو حل کرنے کیلئے کنٹرول لائن کو مستقل لائن تسلیم کرنے کے مشورے دیئے جارہے ہیں۔

ان حالات میں ہمیں اپنے داخلی، خارجی اور سفارتی محاذوں پر بھرپور ذہانت کے ساتھ سرگرم عمل ہونا پڑے گا۔ امریکہ ہمیشہ سے پاکستان کا ناقابل اعتماد حلیف ثابت ہوا ہے۔ ظاہر ہے جب تک امریکہ کو پاکستان کی ضرورت ہوتی ہے وہ پیار دلار کا اظہار کرتا رہتا ہے۔ جوں ہی اس کی ضرورت پوری ہو جاتی ہے وہ طوطا چشمی پر اتر آتا ہے۔ ہمیں اس پر شکوہ کناں ہونے کی ضرورت نہیں۔ بین الاقوامی سطح پر ملکوں اور قوموں کی دوستیاں ہمیشہ اپنے اپنے مفادات کے تابع ہوتی ہیں۔ وفاداریوں کا انداز بدلتا رہتا ہے۔ چنانچہ ہمارے پالیسی سازوں اور خارجی حکمت عملیاں وضع کرنے والوں کا فرض ہے کہ وہ صرف معروضی حالات پر نظر نہ رکھا کریں۔ آنیوالے دنوں میں حالات کا اونٹ کس کروٹ بیٹھ سکتا ہے اس کو بھی پیش نظر رکھا کریں۔ خصوصاً آجکل جو کچھ ہو رہا ہے وہ چھ ماہ یا ایک سال کے بعد نہیں ہوگا۔ ہمیں دور اندیشی کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔

عراق دُنیا کا دوسرا بڑا تیل کا ذخیرہ رکھتا ہے۔ افغانستان وسط ایشیا کی معدنی دولت کی آؤٹ پوسٹ ہے۔ امریکہ کو افغانستان اور عراق میں خود رہنا ہے یا ایسی حکومتوں کو لانا ہے جو اس کے اشارہ ابرو کی منتظر رہا کریں۔ چین کی زقندیں بھرتی ہوئی ترقی اب امریکہ کیلئے ناقابل برداشت ہے۔ وہ چین کو ایشیا اور افریقہ کی منڈیوں پر قبضہ کرتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ اسے روکنے اور محصور کرنے کیلئے جو کچھ وہ چاہتا ہے اس پر عملدرآمد میں تاخیر نہیں کر سکتا۔ ان تمام اہداف کے ساتھ ساتھ اسے القاعدہ جیسی تنظیم سے بھی نمٹنا ہے۔ کراچی سے رمزی الشیبی جیسے القاعدہ کے اہم رکن کی گرفتاری اس خدشے کو تقویت دیتی ہے کہ القاعدہ کے ارکان افغانستان سے نکل کر پاکستان سمیت دوسرے ممالک میں پناہ لئے ہوئے ہیں۔ ان کی گرفتاری کیلئے ضروری ہے کہ پاکستان کا تعاون امریکہ کو حاصل رہے۔ مذکورہ بالا تمام مقاصد کے حصول کیلئے امریکہ کو پاکستان کی فی الوقت شدید ضرورت ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے کار پردازان اس صورتحال سے کس طرح فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کیا اب بھی ہم امریکہ کی طرف سے "مونگ پھلی" ملنے پر بہل جائیں گے اور روسیاہی کا ماتم کرتے رہیں گے یا پاکستان کے حقیقی مفادات کا حصول یقینی بنائیں گے۔

آج کل امریکہ کو پاکستان کی ضرورت ہے۔ افغانستان میں وہ اسی صورت میں مضبوطی سے قدم جما سکتا ہے کہ اسے پاکستان کی مکمل مدد حاصل رہے۔ پاکستان کے بغیر اسے افغانستان میں آنیوالے ہر دن میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ان مشکلات کا دُنیا کو اب اچھی طرح اندازہ ہو رہا ہے۔ عراق پر حملے کیلئے اور حملہ کے بعد جو ردعمل شدت پسند عناصر کی طرف سے اُبھرے گا اس میں پاکستان کی اعانت کے بغیر امریکہ اپنے مفادات کو تحفظ نہیں دلا سکتا۔ القاعدہ کی "بیخ کنی" پاکستان کی عملی مدد کے بغیر کیسے ممکن ہے؟ چین کے گرد حصار پاکستان کو شامل کئے بغیر ناممکن ہے۔ ان تمام تر حالات کو اپنے حق میں منفعت بخش بنانا ہی ہماری ڈپلومیسی اور خارجہ پالیسی کا کمال ہوگا۔

ہماری وزارت خارجہ کو ناک سے آگے دیکھنے کا ہنر نہ جانے کب آئے گا؟ ان ہی حالات کو بھارت اپنے لئے "نقد آور" بنا رہا ہے اور ہم ہیں کہ وعدہ فردا پر بہل رہے ہیں۔ ہمارے مفادات کا تقاضا ہے کہ امریکہ کو مجبور کریں کہ وہ بھارت کو ہماری سرحدوں سے فوجیں واپس بلانے اور مسئلہ کشمیر حل کرنے کیلئے مفید مذاکرات کی طرف لائے۔ خود امریکہ ہمیں ایف سولہ طیارے دے یا ان کی قیمت ادا کرے۔ قرضے ری شیڈول کرنے کی بجائے ان کو رائٹ آف کرے۔ ہمارے لٹیرے سیاستدانوں نے جو اربوں ڈالر پاکستان سے نکال کر امریکہ، سوئٹزر لینڈ اور آف شور کمپنیوں میں لگا رکھے ہیں ان کی واپسی کیلئے حکومت پاکستان کی مدد کرے۔

امریکہ کو ان اقدامات پر مجبور یا قائل کرنا ہی ہمارے "عالی دماغوں" کا ہنر ہوگا۔ اگر مصر 90ء کی عراق امریکہ جنگ میں اپنے قرضے ختم کرا سکتا ہے تو ہم ایسا کیوں نہیں کر سکتے۔ خدا کیلئے معمولی مفادات کا کھیل چھوڑیئے۔ آنے والے دنوں بلکہ آنے والی پاکستان کی نسلوں کا سوچئے، ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف کے شکنجے سے نکلنے اور آنے والی نسلوں کو اس سے محفوظ رکھنے کی حکمت عملی اپنایئے۔

اکتوبر 2002ء

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نیا استعمار۔ ہلاکو کے نقش قدم پر

صدر بش نے ہلاکو خان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے یلغار کی اور سقوط بغداد کا المیہ اپنی تمام تر ہولناکیوں کے ساتھ ایک بار پھر تاریخ اسلام کے خونچکاں ابواب میں شامل ہو گیا۔ وہی سب کچھ ہوا جو اپنے وقت کی طاقت کیا کرتی ہے۔ لیکن اس دفعہ یہ المیہ جمہوریت کے علمبردار، انسانی حقوق کے چمپئن اور روشن خیالی کے پرچارک امریکہ کے ہاتھوں رونما ہوا اور عراقی عوام کو ''آمریت'' کے چنگل سے نکالنے اور آزادی دلانے کے مقدس کام کے نام پر ہوا۔

کچھ لوگوں کو اس انجام کی توقع تھی۔ انہیں علم تھا کہ جلد یا بدیر عراق کو امریکہ کی بے پناہ طاقت کے سامنے سرنگوں ہونا ہے چنانچہ یہ ہو کر رہا۔ کچھ لوگوں کو صرف اس بات پر حیرت ہے کہ یہ موڑ بہت جلد آ گیا لیکن ابھی تک ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اچانک صدمہ جیسی کیفیت سے دوچار ہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ عراق، افغانستان نہیں اور صدر صدام، ملا عمر نہیں۔ افغانستان کے پاس باقاعدہ فوج نہیں تھی، فضائیہ نہیں تھی اور ملا عمر کو عسکری فہم و تجربہ میسر نہیں تھا جبکہ صدام دس برس تک ایران کے ساتھ جنگ کا تجربہ رکھتے ہیں۔ 1990ء میں انہوں نے کویت پر قبضہ کیا اور خلیج کی جنگ میں اتحادیوں کے سامنے (بظاہر) خم ٹھونک کر آ گئے۔ عراق کے پاس پیشہ ور فوج بلکہ ایک موثر جنگی مشینری ہے۔ ان لوگوں کی توقعات اس لئے بھی اوج ثریا پر تھیں کہ حالیہ یلغار کے پہلے روز جب اتحادیوں نے پہلا فضائی حملہ صدر صدام کے ایک محل پر کیا تو صدام انتظامیہ (صدام سے صحاف تک) نے زبردست بھڑک بازی کی۔ دعوے کئے گئے کہ حملہ آوروں کے خون سے عراق کی سرزمین لالہ زار ہو جائے گی۔ اتحادیوں کو ایسا جواب ملے گا کہ وہ بقیہ زندگی اپنے زخم چاٹتے رہیں گے۔

اِدھر پیش قدمی جاری رہی اور اُدھر بھڑک بازی جاری رہی۔ ''منظر عام'' سے غائب ہونے سے کچھ گھنٹے پہلے تک صدام انتظامیہ تاثر دے رہی تھی کہ بغداد اتحادیوں کیلئے لوہے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے چنے ثابت ہوگا۔ شہر میں چھ ماہ کیلئے خوراک اور دیگر ضروریات زندگی کا ذخیرہ کرلیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ پانی کیلئے تین گھروں کیلئے ایک ٹیوب ویل اور بجلی کا متبادل انتظام بھی کر لیا گیا ہے۔ بغداد پہنچنے پر اتحادیوں کو ایسی غیر روایتی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا کہ دُنیا حیران رہ جائے گی۔

اور پھر دُنیا واقعی حیران رہ گئی کہ بغداد کسی پکے ہوئے پھل کی طرح امریکہ کی جھولی میں آن گرا۔ ایک بار پھر مبصرین قیاس آرائیوں میں مصروف ہوگئے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ صدام انتظامیہ نے امریکہ سے "ڈیل" کرلی ہے۔ چنانچہ مزاحمت نہیں کی گئی۔ کچھ مبصرین کا کہنا ہے کہ امریکیوں نے ایسے جدید بم ری پبلکن گارڈز کے مراکز پر گرائے کہ بنکروں اور تہہ خانوں میں موجود انسان چشم زدن میں ڈھانچے بن گئے۔ مزاحمت کرنے والا کوئی گارڈ بغداد میں بچا ہی نہیں تھا۔ لیکن مبصرین کے ایک حلقہ کا خیال ہے کہ صدام انتظامیہ کو صورت حال کا پوری طرح اندازہ تھا۔ وہ امریکہ کی جدید ٹیکنالوجی کا مقابلہ کر ہی نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ صدام انتظامیہ نے یہ حکمت عملی اپنائی کہ جنگ میں لفظوں کے ہتھیار اس طرح استعمال کئے جائیں کہ اتحادی ضرورت سے زیادہ محتاط ہو جائیں۔ وہ سب کچھ بلڈوز کرتے ہوئے فوراً بغداد میں نہ داخل ہو جائیں۔ جوابی کارروائی کے خوف سے رک رک کر اور سنبھل کر پیش قدمی کریں۔ دراصل یہ وقت حاصل کرنے کا ایک حربہ تھا۔ صدام انتظامیہ نے مفروضہ قائم کیا تھا کہ سست پیش قدمی میں وقت لگے گا۔ اس دوران بین الاقوامی ردعمل منظم ہو جائے گا۔ پوری دنیا میں رائے عامہ امریکی حملہ کے خلاف ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں شدت آئے گی۔ روس فرانس اور جرمنی جیسے ملک اقوام متحدہ میں متحرک ہو کر امریکہ کو رک جانے پر مجبور کریں گے۔ صدام انتظامیہ کی یہ حکمت عملی ابتداء میں کسی حد تک کامیاب رہی۔ ابتدائی چوبیس گھنٹوں میں امریکی و برطانوی فوجی الناصریہ تک پہنچ گئے تھے۔ لیکن پھر کوئی مزاحمت نہ ملنے پر ٹھٹک کر رک گئے۔ اتحادی کمان بھی صحاف کی بھڑکوں سے کچھ مرعوب سی ہوگئی چنانچہ مزید پیش قدمی بوجوہ انتہائی سست رفتاری سے ہوئی۔ بغداد ایئرپورٹ پر قبضہ کے بعد تو باقاعدہ گرین سگنل کا انتظار کیا گیا۔ اتحادیوں کی پیش قدمی میں تو

صدام انتظامیہ کی توقع کے مطابق تاخیر ہوئی لیکن بین الاقوامی سطح پر ان کی توقع کے خلاف کچھ بھی نہ ہوا......اور پھر بغداد میں غیر روایتی مزاحمت کے دعوے کرنے والے روایتی انداز میں غائب ہوگئے۔

نئی صدی کے آغاز کے ساتھ ہی امریکہ، ایشیاء میں منڈلا رہا ہے۔ پہلے وہ افغانستان پر جھپٹا اور اب عراق کو نوچ رہا ہے۔ گیارہ ستمبر کا مظلوم، اپنی مظلومیت کا نقاب اتار کر ایک سفاک ظالم کے روپ میں سامنے آچکا ہے۔ امریکی ڈھنڈورچی کچھ بھی کہیں، دنیا جانتی ہے کہ افغانستان میں اس کی آمد وسطی ایشیاء اور چین کیلئے اس کے عزائم کا شاخسانہ ہے۔ جبکہ عراق میں وہ عراقی تیل پر قبضہ، اسرائیل کے تحفظ اور عرب ریاستوں کو اپنے اشاروں پہ نچوانے کیلئے آیا ہے۔ دُنیا کا سب سے سستا تیل اور تیل کا سب سے بڑا ذخیرہ عراق میں پایا جاتا ہے۔ اس پر قبضہ کے بعد وہ اوپیک کو ختم کرے گا یا اقوام متحدہ کی طرح پس پشت ڈالے گا اور پیٹروڈالر کی معیشت اپنی منصوبہ بندی کے مطابق چلائے گا اور پھر پوری کوشش کرے گا کہ دُنیا میں کوئی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے والا نہ ہو۔

ستر کے عشرہ میں پاکستان کے اس وقت کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے سعودی فرمانروا شاہ فیصل کے ذریعے عرب ریاستوں اور تیل کی دولت سے مالا مال اسلامی ممالک کو دُنیا میں اپنا مستقبل محفوظ کرنے کیلئے تیل کا ہتھیار استعمال کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ چنانچہ اسلامی دُنیا کے اتحاد، اسلامی ممالک کی دولت مشترکہ، عالم اسلام کے مشترکہ دفاع اور ورلڈ بینک کے مقابلہ میں اسلامی بینک کے قیام جیسی تجاویز سامنے آئیں۔ مسلمان ممالک تو ان تجاویز کی دلکشی پر واہ واہ کر کے خاموش ہو بیٹھے لیکن امریکی عقاب سنجیدہ ہو گئے۔ مغلیہ سلطنت کے ایک شہنشاہ کے بھائی نے خواب میں دیکھا کہ وہ بادشاہ بن گیا ہے۔ اس نے یہ خواب بھائی کو بھی سنادیا۔ شہنشاہ نے فوراً اس بھائی کا سر قلم کرنے کا حکم دیا کہ آج یہ خواب دیکھ رہا ہے کل کو بیداری میں بھی یہی کچھ چاہے گا۔ چنانچہ امریکہ نے پیش بندی کرتے ہوئے، ستر ہی کے عشرہ میں مسلمانوں، ان کے تیل اور ان کے اتحاد کے خواب کو اپنا ہدف بنالیا۔ بھٹو اور فیصل کو تو فوراً ہی اپنے راستے سے ہٹادیا گیا۔ جبکہ بقیہ معاملات کو طویل

www.iqbalkalmati.blogspot.com

المیعاد منصوبہ بندی کا حصہ بنالیا۔ ایشیاء اور عالم اسلام کا جو نقشہ امریکہ کے ماہرین نے آج سے 30 برس پیشتر بنایا تھا۔ اس میں رنگ بھرنے کا عمل اب شروع ہو چکا ہے۔

امریکہ تو پیش بندی میں اتنا آگے چلا گیا ہے کہ اب مسلمانوں کو تعلیم اور سائنس و ٹیکنالوجی کے شعبوں میں حدود و قیود میں رکھنے کی تجاویز منظر عام پر آ رہی ہیں۔ کہا جا رہا ہے کہ یورپی اور امریکی یونیورسٹیوں میں مسلمان طالب علموں کو ایک مخصوص درجہ سے آگے علم حاصل کی اجازت نہ دی جائے۔ مسلمان ممالک کو ایک مخصوص حد سے زیادہ ٹیکنالوجی کے حصول سے روکا جائے جو ان حدود کو پھلانگے، اسے دہشت گرد قرار دیا جائے۔ امریکی دراصل انہی یورپی صلیبی محاربین کی اولاد ہیں جنہیں صلیبی جنگوں میں مسلمانوں سے ہزیمت اُٹھانا پڑی تھی۔ ان کے اجتماعی شعور میں انتقام کی چنگاریاں سلگتی رہتی ہیں۔ صدر بش نے تو گیارہ ستمبر کے واقعات کے فوراً بعد اضطراری کیفیت میں صلیبی جنگوں کا ذکر کر دیا تھا۔

اب عالم اسلام کو فیصلہ کرنا ہے کہ کیا آنے والے دنوں میں اس نے نئے استعمار امریکہ کی غلامی قبول کرنا ہے یا ملی غیرت وحمیت کے ساتھ باوقار زندگی گزارنی ہے۔ نیا استعمار سولہویں صدی کے استعمار سے ہزار گنا زیادہ طاقتور اور بے رحم ہے۔ اس کا مظاہرہ افغانستان اور عراق میں ہو چکا ہے۔ شام، ایران اور پاکستان جیسے ملک اس کی غیر اعلان شدہ اور اعلان شدہ ہٹ لسٹ پہ ہیں اور اب تو صاف صاف نظر آ رہا ہے کہ بات صرف اسلامی ملکوں تک محدود نہیں رہے گی۔ موجودہ صدی کا عالمی نظام اپنی مرضی سے ترتیب دینے کیلئے کسی بھی ایسے ملک کے دانت توڑ دیئے جائیں گے جو امریکہ کے راستے میں آنے کی ہمت دکھائے گا۔ چنانچہ شمالی کوریا کے بعد ہندوستان کی بھی باری آ جائے گی۔ عسکری، اقتصادی اور سیاسی بالا دستی کا جنون کوئی امتیاز نہیں رکھے گا۔

بہت غفلت ہو چکی۔ بہت گراں خوابی ہو چکی۔ عالم اسلام اور تیسری دُنیا کو پوری طرح بیدار ہونا پڑے گا۔ اپنی قوتیں اور صلاحیتیں منظم کرنا ہوں گی۔ تاریخ گواہ ہے کہ نئی ٹیکنالوجی ہی پرانی ٹیکنالوجی کو مغلوب کرتی ہے۔ لٹھ بردار پر تلوار بردار غالب آیا تھا۔ تلوار کو بندوق نے گرایا تھا۔ بندوقوں پر توپیں حاوی ہوئی تھیں۔ توپوں پر ہوائی جہاز بالا دست

ہوئے تھے۔ ہوائی جہازوں کو میزائیلوں نے ناکارہ بنایا۔ میزائیلوں کو لیزر ٹیکنالوجی خاکستر بنا رہی ہے۔ افغانستان اور عراق کے انجام نے واضح کر دیا ہے کہ فضائی برتری اور ایئر ڈیفنس کے بغیر آپ کی عسکری قوت بے معنی ہے۔ اب تو آپ کو اپنی فضائی حدود میں لیزر کا ایک ایسا جال بننا ہوگا جس میں آنے والی دشمن کی ہر چیز فوراً خاکستر ہو جائے۔ اس طرح کی ٹیکنالوجی کسی ایک ملک کے بس کی بات نہیں۔ عالم اسلام اور تیسری دُنیا کی قیادتوں کو اپنے بے معنی اختلافات ختم کر کے متحد ہونا پڑے گا۔ اپنے وسائل مجتمع کرنے ہوں گے۔ حکمرانوں کو اپنے اپنے ملکوں کے صنعت کاروں، انجینئروں اور سائنسدانوں کے وسائل، مہارتیں اور علم یکجا کر کے اپنے توانائیاں ایک مخصوص سمت میں اور مخصوص نکتہ پر مرکوز کرنا ہوں گی۔ یہ کام بہت مشکل ہے۔ سازشیں راستہ روکیں گی۔ انائیں مزاحمت کریں گی۔ خود فریبیاں آڑے آئیں گی۔ لیکن دیوہیکل دشمن کا مقابلہ کرنے کیلئے ہاتھوں میں ہاتھ دینا پڑیں گے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ عالم اسلام اور تیسری دُنیا سائنس اور ٹیکنالوجی کا رُخ کرتی ہے یا اپنے کوتاہ اندیش حکمرانوں کی مصلحتوں کی بھینٹ چڑھتی ہے۔

مئی 2003ء

www.iqbalkalmati.blogspot.com

امریکی استعمار آگے بڑھ رہا ہے

امریکہ اور برطانیہ کا اگلا ہدف اب محسوس ہوتا ہے، ایران اور شام ہیں۔ ایران کے صدر احمدی نژاد نے امریکہ کی چشم برہم کو نظر انداز کرتے ہوئے اور تجارتی پابندیوں کی دھمکیوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنا ایٹمی پروگرام جاری رکھنے کا نہ صرف اعلان کر دیا بلکہ یورنیم کی افزودگی کا عمل باقاعدہ شروع کرا دیا۔ امریکہ اور یورپی یونین چیں بجبیں ہیں۔ صدر بش نے اپنا چنگیز خانی رویہ برقرار رکھتے ہوئے طاقت کے استعمال کے اشارے بھی دے دیئے ہیں۔

ایرانی صدر محمود احمدی نژاد نے یورپی یونین کی طرف سے جوہری تعاون کی پیشکش کو ایرانی عوام کی توہین قرار دیا ہے تاہم اُنہوں نے ایٹمی بحران کے حل کیلئے نئی تجاویز پیش کرنے کا عندیہ دے دیا ہے۔ امریکہ اور یورپی یونین کی خواہش ہے کہ ایران کو جدید ایٹمی ٹیکنالوجی پر دسترس حاصل کرنے سے روکا جائے گا۔ ادھر بین الاقوامی ایٹمی ایجنسی کے سربراہ محمد البرادی اور ایجنسی کے ماہرین نے اعتراف کیا ہے کہ ایران میں ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری یا موجودگی کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔

امریکہ نے عراق پر حملہ آور ہونے سے پہلے اسی طرح کے الزامات عائد کئے تھے۔ دُنیا کو یقین دلا دیا تھا کہ عراق میں وسیع پیمانے پر انسانی ہلاکتوں کا ذریعہ بننے والے ہتھیار تیار کئے جا رہے ہیں۔ عراقی حکام انہیں دُنیا کی نظروں سے پوشیدہ رکھے ہوئے ہیں اور بین الاقوامی انسپکٹروں کو جھانسہ دے کر اپنی بے گناہی کا شور مچایا جا رہا ہے۔ اور پھر امریکہ نے اپنے پروگرام اور منصوبہ کے مطابق عراق پر ہلہ بول دیا۔ اب امریکی فوجیں عراق میں موجود ہیں۔ وہاں ایک ایک اینٹ کو کھنگال کر دیکھ لیا گیا ہے۔ سابق صدر صدام کو بھی کسی تہہ خانے سے برآمد کر لیا ہے۔ ایک نہیں مل سکے تو وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہتھیار جن کی موجودگی کا بہانہ کر کے یہ بھیڑیا میمنے پر جھپٹا تھا۔

بھارت اور اسرائیل کی ایٹمی سرگرمیوں سے بے نیاز امریکہ کیلئے صرف مسلمان ممالک کے ایٹمی پروگرام ہی نا قابل برداشت ہیں۔ ایران کے خلاف امریکہ، بین الاقوامی ایٹمی ایجنسی اور یورپی یونین کا رد عمل تمام مسلمان ملکوں کی آنکھیں کھول دینے کیلئے کافی ہے۔ امریکہ کیلئے کسی مسلمان ملک کی ایٹمی صلاحیت قابل برداشت نہیں۔ امریکہ کا مقصد تو صرف ایک ہی ہے۔ وہ امت مسلمہ کو تباہ کر کے اس کے وسائل پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ افغانستان اور عراق مین وہ اسی لئے ہر طرح کی اخلاقیات کو روندتا ہوا، در آیا ہے۔ اب یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ وسط ایشیا اور مشرق وسطیٰ کے قدرتی وسائل پر اس کی نظریں ایک عرصہ سے تھیں۔ ان وسائل سے براہ راست استفادہ کی ایک ہی صورت تھی کہ وہ ''موقعہ پر موجود رہے'' موقعہ پر موجود ہونے کا راستہ صاف کرنے کیلئے اس نے پہلے سوویت یونین پہ کاری ضرب لگائی۔ سوویت یونین کے انہدام کے بعد علاقے میں اپنی آمد کے جواز کیلئے اس کو کچھ دہشت گردی کے واقعات کی ضرورت تھی جو ٹھیک اس کی مرضی اور ضرورت کے مطابق ہوئے۔ اب وہ افغانستان اور عراق میں موجود ہے۔ اور بقول صدر بش اس خطے کے لوگوں کو جمہوریت اور آزادی کی نعمتوں سے مالا مال کرنے کیلئے آیا ہے۔

تاریخ کے طالب علموں کو اچھی طرح یاد ہے کہ استعماریت اور نوآبادیاتی دور میں کچھ یورپی ممالک بڑے زور شور کے ساتھ دعویٰ کرتے تھے کہ وہ افریقہ میں محض اس لئے جا رہے ہیں یا اس لئے موجود ہیں کہ تاریک براعظم کو تہذیب کی روشنی سے منور کر سکیں اور ان کی مہذب یلغار سے زخمی افریقہ آج تک سسک رہا ہے۔ جس طرح سولہویں، سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں یورپی استعمار نے افریقہ اور جنوبی امریکہ کی سونے کی کانوں اور دیگر قیمتی معدنیات پر قبضہ کیا اور پھر ان براعظموں کے ساتھ ساتھ ایشیاء میں اپنی نوآبادیاں قائم کیں۔ آج کا استعمار امریکہ بھی وہی کچھ کر رہا ہے۔

آج اکیسویں صدی ہے۔ گذشتہ پانچ صدیوں میں انسان نے حیرت انگیز ترقی کر لی ہے۔ موجودہ صدی کو ٹیکنالوجی اور علم و شعور کی صدی کہا جاتا ہے۔ آج یورپی

استعماریت کے دور کی جہالت، پس ماندگی اور فاصلے نہیں ہیں۔ یورپی استعماریت کے دور میں رابطے محدود اور مسدود تھے۔ ہر ملک بقیہ دُنیا سے الگ تھلگ ہوتا تھا۔ استعماران ملکوں کے برعکس ترقی یافتہ تھا۔ استعماری قوتیں ایک ایک ملک کو دبوچتی ہوئی سب پر غالب آ گئیں۔ آج ٹیکنالوجی کے دور میں اگرچہ وہ دوریاں اور بے خبریاں نہیں ہیں لیکن جدید استعمار مسلمان ملکوں کو ایک ایک کر کے مغلوب کرنے کی اسی پالیسی پر گامزن ہے۔ عالم اسلام متحد ہو کر ہی درپیش نئے چیلنج کا جواب دے سکتا ہے لیکن المیہ یہ ہے کہ اُمت مسلمہ کو اس خطرہ اور چیلنج کا احساس ہی نہیں۔

57 مسلمان ممالک دُنیا کی ایک بڑی آبادی اور ہر قسم کے قدرتی وسائل سے مالا مال ہونے کے باوجود پسماندگی، غربت، جہالت اور احساس محرومی کا شکار ہیں۔ اسلامی دُنیا کے وسائل کا تمام تر فائدہ ترقی یافتہ ممالک اٹھا رہے ہیں اور ان کی حکمت عملیاں مسلمان ممالک کیلئے مشکلات پیدا کر رہی ہیں۔ اس وقت صورتحال یہ ہے کہ تیل کی دولت رکھنے والے مسلم ممالک کا زیادہ تر سرمایہ مغرب کے بینکوں میں ہے۔ مغرب کی پالیسیوں کے نتیجہ میں کئی دولت مند مسلمان ملک بھی قرضوں کے بوجھ تلے آ چکے ہیں۔ غریب اور ترقی پذیر مسلم ممالک عالمی مالیاتی اداروں سے قرضے لینے پر مجبور ہیں جو یورپ اور امریکہ کے زیر اثر ہیں۔ ان حالات میں مسلمان ملک امریکہ کی چنگیز خانیوں پہ کوئی رد عمل نہیں دیتے مثلاً جب افغانستان اور پھر عراق پر امریکہ نے حملے کا فیصلہ کیا تو مسلم اُمہ میں بدقسمتی سے کوئی مسلم حکمران کھل کر مخالفت یا مقابلہ پر نہ آیا۔ کچھ تو عسکری لحاظ سے اس قابل نہ تھے اور کچھ نے دبے الفاظ میں ان حملوں کی مذمت کی لیکن وہ بھی اپنے عوام کی نظروں میں سرخرو ہونے کیلئے۔ چنانچہ سب کچھ بے اثر رہا۔ آئندہ بھی محض مخالفانہ نعروں یا جلسے جلوسوں سے کچھ نہیں ہوگا۔ بدمست ہاتھی جھومتا ہوا جسے چاہے گا روندنے کی کوشش کرے گا۔

اگرچہ افغانستان اور عراق میں اس بدمست ہاتھی کی طرف سے طاقت کا استعمال مسلسل ناکام ہو رہا ہے۔ ان دونوں ممالک میں فوجی قوت کا بے محابا استعمال لاکھوں بے گناہ شہریوں کی ہلاکت کا سبب بنا لیکن دراندازہونے والی امریکی اور اتحادی فوجوں کو ابھی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تک مطلوبہ نتائج نہیں مل سکے۔ عراق میں تو روزانہ سینکڑوں لوگ ہلاک ہو رہے ہیں۔ قابض افواج کو بھی نقصان پہنچایا جا رہا ہے۔ افغانستان اور عراق کے غیور عوام جس طرح بے جگری سے مقابلہ کر رہے ہیں اور اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر رہے ہیں اس کی مثال ڈھونڈنا بہت مشکل ہے۔ لیکن یہ مزاحمت کمزور پڑ سکتی ہے۔ دُنیا کی سپر پاور کے وسائل اور عسکری قوت کا مقابلہ کرنے والے جرات مند عراقیوں اور افغانیوں کی عزیمت اور استقلال کا ساتھ دینے اور دُنیا کو امریکہ کی دہشت گردی سے محفوظ رکھنے کیلئے اُمت مسلمہ کے حکمرانوں کو ہوش کے ناخن لینا ہوں گے۔ اپنے قدرتی وسائل کو امریکی استعمار سے بچانے اور اپنی آنے والی نسلوں کے محفوظ مستقبل کیلئے انہیں منتقل کرنے کیلئے سیاسی عزم اور اتحاد کا سہارا لینا پڑے گا۔ اپنے اقتدار کے تحفظ کیلئے، اپنے چھوٹے چھوٹے مفادات کیلئے اُمت مسلمہ کے مستقبل کو داؤ پہ لگانے سے گریز کرنا ہوگا۔ اگر مسلمان ممالک اپنی داخلی کمزوریوں پہ قابو پانے میں کامیاب نہ ہوئے، اپنے ذاتی مفادات کو اُمت کے مفادات پر قربان نہ کیا۔ اپنی سفارتی اور اقتصادی توانائیوں کو مربوط نہ کیا۔ اپنی افرادی اور قدرتی وسائل کی قوتوں کو درست دھارے میں نہ لائے تو یاد رکھیں فطرت افراد سے اغماض برت لیتی ہے لیکن قوموں کی غلطیوں کی گرفت ضرور کرتی ہے۔

ستمبر 2003ء

عمل اور ردِ عمل

اکیسویں صدی کے ہلاکو خان، صدر بش جب لندن پہنچے تو ہزاروں شہریوں نے ان کی آمد پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ جب تک وہ برطانیہ میں رہے لوگوں نے ان کے اور ان کے دم چھلے، ٹونی بلیئر کے مشترکہ فریب، جھوٹ کے طومار اور اس طومار کی آڑ میں عراق پر قبضہ اور بربریت کی مذمت کی۔ سینکڑوں افراد نے نقلی استقبالیہ کا انعقاد کر کے بش کا مذاق اڑایا۔ کہا گیا کہ بش نے صدارت چرائی اور بلیئر نے جھوٹ بولا، دونوں مل کر ہمیں جنگ کے راستے پر لے گئے۔ اس سے اگلے روز لندن میں ڈیڑھ لاکھ افراد نے امریکی صدر کے خلاف مظاہرہ کیا۔ قاتل بش واپس جاؤ کے نعرے لگائے گئے۔ بش کا مجسمہ زمین بوس کیا گیا، جس روز صدر بش بکنگم پیلس میں ملکہ برطانیہ سے ملنے والے تھے ٹھیک اسی روز استنبول (ترکی) میں برطانوی قونصلیٹ پر خودکش حملہ ہوا۔ برطانوی قونصل جنرل ہلاک ہو گئے۔ بارود سے بھری وین کو قونصل خانے سے ٹکرایا گیا۔ پھر برطانوی بنک اور شاپنگ مال کے باہر کار بم دھماکے ہوئے۔ 27 افراد ہلاک اور 450 سے زائد زخمی ہوئے۔ مالی نقصان اس کے علاوہ تھا۔ حملہ آوروں کا مقصد برطانیہ کو یہ باور کرانا تھا کہ عالمی سطح پر اس کے مفادات خطرے میں ہیں اور یہ خطرہ انہیں صرف اور صرف امریکہ کی غیر ضروری اور ناشائستہ حمایت کرنے پر درپیش ہے۔

مشرق وسطیٰ کے قدرتی وسائل پر براہِ راست کنٹرول حاصل کرنے کیلئے صدر بش نے اخلاقیات کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے، جس طرح عراق میں اپنی فوجیں اُتاری ہیں اس کی مذمت تو بہر حال دُنیا بھر میں جاری ہے لیکن براہِ راست امریکہ کو عراق اور دُنیا بھر میں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ وہ یقیناً اس کی توقع کے خلاف ہیں۔ عراق سے امریکی فوجیوں کے تابوتوں کی وطن روانگی میں تسلسل آ گیا ہے۔ خود خودکش حملوں میں اضافہ ہوتا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جا رہا ہے۔ جواب میں امریکی طیاروں سے دو دو ہزار پونڈ وزنی بم برسائے جا رہے ہیں۔ مقامی مزاحمت اور ردعمل کا حال یہ ہے کہ اگلے روز گدھا گاڑیوں سے بغداد میں وزارت پٹرولیم اور دو ہوٹلوں پر راکٹوں سے حملے کیے گئے، اس طرح کے واقعات اب معمول بن گئے ہیں۔ کربلا میں تھائی لینڈ کے فوجی کیمپ پر مارٹر گولوں سے حملہ ہوا۔

ایک ٹی وی رپورٹ کے مطابق عراق میں فوجیوں کی ہلاکتیں ویت نام سے بڑھ گئی ہیں۔ آٹھ ماہ کے دوران عراق میں 397 جبکہ ویت نام میں پہلے دو سال میں 392 امریکی فوجی ہلاک ہوئے تھے۔ ویت نام کی جنگ میں 12 سال کے دوران 58000 امریکی فوجی ہلاک ہوئے تھے اور اس کا سبب ریگولر فوج کا مقامی گوریلا فوج سے مقابلہ تھا۔ امریکی فوجی مبصرین کیلئے تشویش کی بات یہ ہے کہ ویت نام کی جنگ کے وقت ہلاکت خیزی کے آلات وہتھیار آج کے مقابلے میں بہت معمولی تھے۔ آج سائنس وٹیکنالوجی کی ترقی یافتہ صورت جس میں امریکہ کا حصہ ہی سب سے زیادہ ہے، عراق میں بالخصوص اور پوری دُنیا میں بالعموم امریکہ کیلئے ایک اذیت ناک تصور بن چکی ہے۔ گیارہ ستمبر کی دہشت ابھی امریکیوں کے دل ودماغ سے نہیں نکل سکی۔

صدر بش...... کے والد نے صدر صدام کو دہشت گرد قرار دے کر امریکی منصوبے کے مطابق خلیجی جنگ چھیڑی تھی اور کویت کو آزاد کرانے کے بعد خلیج میں امریکی افواج کی موجودگی پر اکتفا کر لیا تھا۔ لیکن بیٹے نے امریکی منصوبوں کو جلد از جلد اور ہر قیمت پر مکمل کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ چنانچہ پہلے افغانستان اور پھر عراق پر پنجے گاڑ دیئے۔ امریکیوں کو اپنے منصوبوں کی تکمیل کیلئے جو قیمت ادا کرنا پڑے گی اس کا اندازہ شائد ان منصوبہ سازوں کو قطعاً نہیں تھا۔ افغانستان میں اس کی توقع کے خلاف مزاحمت میں پھر توانائی آ گئی ہے۔ طالبان ایک بار پھر منظم ہو رہے ہیں۔ صوبہ خوست اور پکتیا میں اتحادی افواج پر حملوں میں مزید شدت آ گئی ہے۔ پکتیا میں امریکی فوجی اڈوں پر راکٹوں سے حملہ ہو چکا ہے۔ امریکی فوجی، ہونے والے حملوں کی تفصیلات بتانے سے گریز کرتے ہیں۔ یہ بات ثابت کرتی ہے کہ صورت حال تشویشناک ہوتی جا رہی ہے۔

عراق میں بھی صورتحال اتنی تشویشناک ہے کہ عراق کیلئے امریکی منتظم پال بریمر نے

صدر بش سے کہا ہے کہ عراقی عوام کو اقتدار جلد از جلد منتقل کرنے کیلئے طریقہ کار وضع کیا جائے۔ بش انتظامیہ کے ایک عہدیدار کا کہنا ہے کہ زیر غور آپشنز میں سے ایک یہ ہے کہ ایک نئے عبوری عراقی لیڈر کے نام کا اعلان کیا جائے جو اس وقت تک ملک کا حکمران رہے جب تک آئین نہیں بن جاتا اور انتخابات نہیں ہو جاتے۔ اس طرح عراق میں بھی افغانستان جیسی حکومت لانے کی اسکیم تیار کی جا رہی ہے۔ پال بریمر اور صدر بش کی ملاقات کے حوالے سے مبصرین کا خیال ہے کہ کچھ ہنگامی نوعیت کے فیصلے کیے جا رہے ہیں۔ کیونکہ عراقی گورننگ کونسل نئے آئین کی تیاری میں ناکام ہو چکی ہے۔ پال بریمر کے مطابق حقیقت یہ ہے کہ انہیں بہت مشکل وقت کا سامنا ہے۔ اُنہوں نے اعتراف کیا ہے کہ آنے والے دن مزید مشکل ہوں گے۔

جوابی حملوں پہ صدر بش کھسیا کر کھمبا نوچتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ صدر صدام کے وسیع پیمانے پہ تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کو برآمد کرنے اور انہیں تلف کرنے کیلئے عراق میں آئے تھے۔ لیکن جب اس طرح کا ایک بھی ہتھیار ان کو نہ مل سکا تو دُنیا بھر میں امریکی جارحیت کی مذمت شروع ہو گئی۔ صدر بش نے عالمی رائے عامہ کو گمراہ کرنے کیلئے پینترا بدلا ہے اور اب ان کا کہنا ہے کہ وہ عراقی عوام کو صدر صدام کی آمریت سے آزادی دلانے کیلئے یہ سب کچھ کرنے پر مجبور ہوئے تھے۔ مشرق وسطیٰ میں لوگوں کو جمہوریت کی نعمت سے محروم رکھا جا رہا ہے۔ جب عراق میں جمہوریت کا چھتنار لہلہانے لگے گا تو اڑوس پڑوس کی ریاستیں از خود جمہوری نظام کی طرف رجوع کریں گی۔

ایک لطیفہ تو صدر بش نے دُنیا کو چند دن پہلے سنایا۔ امریکی فوج پر ہونے والے ایک حملہ پر تبصرہ کرتے ہوئے صدر بش نے کہا تھا۔ ’’لگتا ہے دشمن کے سینے میں دل نہیں ہے۔‘‘ اب اس سے بڑا لطیفہ اکیسویں صدی میں اور کیا ہوگا کہ افغانستان اور عراق پہ کارپٹ بمبنگ کرنے والے ملک کا سربراہ...... دل اور درد دل کی بات کر رہا ہے۔

کھسیانی بلی اب یورپ کے حکمرانوں کو نئی منطق سکھا رہی ہے۔ بش ڈاکٹرائن یہ ہے کہ اگر وسطی ایشیا اور مشرق وسطیٰ میں امریکہ ناکام ہو گیا تو یہ ناکامی صرف امریکہ کی نہیں بلکہ پورے یورپ کی ناکامی ہوگی اور اس کے نتائج بھی امریکہ اور یورپ کو بھگتنا پڑیں گے اور یورپ تو ویسے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بھی براہ راست اور آسان نشانہ ہوگا۔ صلیبی جنگوں کے دور کا خوف اور فرانس تک عثمانیوں کی یلغار ابھی تک یورپ کے اجتماعی لاشعور میں موجود ہے۔ وہ تو بات بات پر مسلمانوں سے بدک اُٹھتے ہیں چنانچہ صدر بش کی منطق انہیں اچھی لگتی ہے۔ برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیئر نے تو صدر بش کے ساتھ کورس کے انداز میں کہا ہے کہ ترکی میں حملوں سے ہمارے حوصلے پست نہیں ہوئے۔ ہم دہشت گردی کے خلاف جنگ جاری رکھیں گے۔ جنوبی عراق کے قصبے ناصریہ میں اٹلی کے فوجیوں پر خودکش حملے کے بعد جس میں 17 اطالوی فوجی ہلاک ہوئے۔ اٹلی کے صدر، وزیراعظم اور وزیرخارجہ نے کہا ہے کہ اٹلی ان حملوں سے خوف زدہ نہیں ہوگا۔ ہماری فوج عراق میں رہے گی۔ ہم دہشت گردی کا مقابلہ کرتے رہیں گے۔

لیکن دُنیا دیکھ رہی ہے کہ دہشت گرد کون ہے۔ عالمی رائے عامہ روز بہ روز امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے خلاف ہوتی جارہی ہے۔ صدر بش کیلئے امریکی رائے عامہ کا سامنا کرنا مشکل ہوتا جارہا ہے۔ اُنہوں نے قوم کو دہشت گردی کے خلاف آمادہ پیکار کرتے ہوئے کہا تھا کہ گیارہ ستمبر جیسے واقعات سے بچنے کیلئے بہترین دفاع...... آگے بڑھ کر دشمن کا سر کچل دینا ہے۔ تیل کے تاجروں کے مفادات کا تحفظ کرنے والے صدر بش نے عراق پہ یلغار کا حکم دے دیا۔ صدر صدام اور اس کی فوجوں نے کوئی مزاحمت نہ دکھائی اور آسانی سے بغداد سرنگوں ہوگیا۔ خوشیاں منائی گئیں۔ عراقی گورننگ کونسل بنادی گئی اور تاثر دیا گیا کہ امریکہ عراقی عوام کا نجات دہندہ بن کر یہاں آیا ہے۔ لوگ دیدہ و دل اس کیلئے فرش راہ کئے ہوئے ہیں۔ لیکن پھر صدر بش کو پتہ چلا کہ وہ اکلوتی عالمی طاقت ہونے کے باوجود نہ تو سترہویں صدی کا استعمار ہے اور نہ عراق کوئی نو آبادی۔ ناصریہ، فلوجہ، تکریت، بغداد غرضیکہ عراق کے کونے کونے میں مزاحمت اور جوابی حملے شروع ہوچکے ہیں۔ پال بریمر کہتے ہیں کہ انہیں آنے والے دن بہت سخت اور مشکل دکھائی دے رہے ہیں۔ صدر بش کہتے ہیں کہ لگتا ہے دشمن کے سینے میں دل نہیں۔ اور القاعدہ کا بعینہ بیان سامنے آتا ہے کہ امریکہ اور برطانیہ ہی نہیں۔ آسٹریلیا نیوزی لینڈ اور جاپان کے مفادات پر بھی حملے ہوں گے۔ جرمنی نے بغداد سے اپنے ماہرین بلالئے ہیں۔ فلپائن اپنے فوجی

واپس بلانے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ برطانیہ اور یورپ کے عوام بش اور بلیئر کو قاتل کہہ رہے ہیں اور یہ سب کچھ اس عمل کا ردعمل ہے جو صدر بش نے امریکہ کے "تیلیوں" کی منصوبہ بندی کے نتیجہ میں سرانجام دیا تھا۔ اس عمل کا ردعمل ہے جو اسرائیل کے ہاتھوں فلسطینیوں پہ ظلم و ستم کو جائز سمجھتا اور حریت پسندوں کو دہشت گرد قرار دیتا ہے۔

صدر بش کو خاطر جمع رکھنا چاہیے۔ قوانین فطرت اٹل اور غیر متبدل ہوتے ہیں۔ جو بویا جائے گا وہی کاٹنا پڑتا ہے۔ مرحوم فیض احمد فیض کا ایک شعر ہے۔

بجز دیوانگی واں اور کیا چارہ ہے تم بولو
جہاں عقل و خرد کی ایک بھی مانی نہیں جاتی

امریکہ سرکار اور بش بہادر عقل و خرد کی ایک نہیں مانتے۔ قوت کے اندھے گھوڑے پر سوار ہیں جو کچھ ان کے راستے میں آتا ہے اسے تہس نہس کرتے جارہے ہیں۔ فلسطین میں اگر بے گناہوں کا خون بہایا جائے تو وہ امریکہ کی نظر میں اسرائیل کا حق ہے اور اگر فلسطینی اپنے حقوق کیلئے کچھ کریں تو یہ دہشت گردی ہے۔ آپ گیارہ ستمبر کا ڈرامہ رچا کر افغانستان میں کارپٹ بمبنگ کریں تو درست، آپ کو جواب دیا جائے تو طالبان کی درندگی، آپ عراق پر آتش و آہن کی برسات کریں تو جائز اور جب امریکی فوجیوں کو نشانہ بنایا جائے تو دشمن بے رحم قرار دیا جاتا ہے۔ صدر بش کو یاد رکھنا ہوگا کہ ہر عمل کا ردعمل ہوتا ہے۔ یہ قانون فطرت ہے۔ فطرت یہ نہیں دیکھتی کہ اچھا یا بُرا عمل کرنے والا کون ہے۔ وہ عمل کو دیکھتی اور اس کے ردعمل کو اُبھرنے کی اجازت دیتی ہے۔ صدر بش یا امریکہ کے آنے والے صدر کو بہرحال دہشت گردی کی ٹھیک ٹھیک حدود کا تعین کرنا ہوگا۔ حریت پسندی کو دہشت گردی سے الگ دیکھنا ہوگا ورنہ یہ کرہ ارض تو اب واقعی چھوٹی سی دنیا بنتا جارہا ہے۔ آپ نے ہلاکت خیزی کی سائنس کو فروغ دیا ہے۔ آپ نے دُنیا کو سکھایا ہے کہ پیسے خرچ کرو اور تعمیر یا تخریب میں سے کسی کیلئے اعلیٰ درجہ کا سامان حاصل کرلو اور اگر پیسے نہ ہوں تو کیا کرو؟ اس کی تربیت بھی آپ دُنیا کو دیتے آئے ہیں۔ آپ کے اُٹھے ہوئے قدم واپس نہیں جاسکتے لیکن نتائج و عواقب کو روکنے والا تو کوئی نہیں ہوتا۔

دسمبر 2003ء

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لندن بم دھماکے

دہشت گردی کے اسباب دور کیجئے

جولائی میں وسطی لندن دہشت گردی کا نشانہ بنا اور متعدد بے گناہ شہری موت کی وادی میں اُتر گئے۔ دہشت گردی کہیں بھی ہو، پرامن انسانوں کی ہلاکت کسی بھی جگہ ہو، قابلِ افسوس اور قابلِ مذمت ہے۔ ہم بحیثیت انسان، مسلمان اور پاکستانی ان اندوہ ناک واقعات کی مذمت کرتے ہیں۔ بے گناہ انسانوں کے ساتھ بہیمت کسی مذہب اور کسی مہذب فلاسفی میں جائز اور قابل قبول نہیں۔ تمام امن پسند انسانوں کی طرح ہماری بھی یہ خواہش ہے کہ اس بربریت کا خاتمہ ہونا چاہیے۔ کرۂ ارض کو امن وامان کا گہوارہ بننا چاہیے۔

لندن بم دھماکوں کے فوراً بعد برطانیہ کے وزیر اعظم ٹونی بلیئر نے کہا کہ وہ دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ میں پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ اس طرح کے واقعات ان کی کمٹمنٹ کو ختم نہیں کر سکتے چنانچہ وہ پہلے کی طرح پوری قوت کے ساتھ وار آن ٹیرر میں ثابت قدمی کا مظاہرہ کریں گے۔ امریکہ کے صدر بش بھی مسلسل یہی بات کہتے آ رہے ہیں لیکن ٹونی بلیئر نے ایک قدم درست راستے پر اٹھاتے ہوئے کہا ہے کہ وہ دہشت گردی کے ''اسباب'' کا جائزہ لیں گے۔

لندن میں ہونے والے بم دھماکے خودکش حملے تھے اور ان حملوں میں ملوث کچھ افراد کا تعلق پاکستان سے بتایا جا رہا ہے۔ یہ صورتحال ہمارے لئے تشویشناک اور پریشان کن ہے۔ پاکستان کا امیج اس حوالے سے دُنیا بھر میں خراب ہو رہا ہے۔ پاکستان امن وسلامتی کے دین اسلام کے پیروکاروں کا ملک ہے۔ مسلمانوں اور بالخصوص پاکستانیوں کی طرف سے ایسے واقعات میں ملوث ہونا ہم سب کیلئے اضطراب انگیز ہے۔ یہ اضطراب ہم سب پاکستانیوں کو سنجیدگی سے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

امریکہ میں نائن الیون کے بعد اور اب وسطی لندن میں خودکش حملوں کے بعد مغرب کی بدحواسی عروج پر ہے۔ اہلِ مغرب زخم خوردہ سانپ کی طرح پھنکار رہے ہیں۔ صدر بش کی پھنکاریں تو کچھ زیادہ ہی شدت کے ساتھ گونج رہی ہیں۔ اکلوتی عالمی طاقت کے سربراہ کی حیثیت سے ان کا تلملانا سمجھ میں آتا ہے۔ اب برطانیہ بھی اپنے زخم سہلا رہا ہے۔ امریکہ اور برطانیہ کے ساتھ ساتھ یورپ کے تقریباً سبھی ممالک مسلمانوں اور بالخصوص ایشیائی مسلمانوں کو خشمگیں نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ امریکہ اور یورپ کا پیچ وتاب کھانا غیر متوقع نہیں ان کا یہ ردعمل بلاشبہ ایک جواز رکھتا ہے لیکن یہ جواز ادھوری سچائی ہے۔ پوری سچائی وہی ہے جو مغرب کے دانشور دُنیا کو "لاء آف ہارویسٹ" کے نام سے سکھاتے اور سمجھاتے ہیں۔ لاء آف ہارویسٹ کو ہمارے ہاں "جو بوؤ گے وہ کاٹو گے" کہا جاتا ہے۔ حیرت ہے امریکہ اور یورپ کے دانشور موجودہ دہشت گردی کی لہر کو اس زاویہ سے کیوں نہیں دیکھتے اور اپنی حکومتوں کو یہ قانون فطرت یاد کیوں نہیں دلاتے۔

دہشت گردی امریکہ میں ہو، برطانیہ میں ہو یا سپین میں یقیناً قابلِ مذمت ہے۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ ان میں مسلمان ہی کیوں ملوث ہیں؟ مسلمان شدت پسند کیوں ان کے پیچھے پڑے ہیں۔ کیا ان ملکوں کے اربابِ اقتدار ایک لمحہ کو رک کر یہ سوچنے کی زحمت گوارا کریں گے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ ان کے کسی عمل کا ردعمل ہے؟

ٹونی بلیئر صاحب کا یہ کہنا کہ وہ ان واقعات کے اسباب تلاش کرنے کی کوشش کریں گے، ایک معقول اور دانشمندانہ سوچ کی عکاسی ہے۔ خدا کرے کہ وہ سنجیدگی کے ساتھ خود بھی اس معاملے میں سوچیں اور اپنے باس صدر بش کو بھی ٹھنڈے دل کے ساتھ سوچنے پہ قائل کریں۔ ہمارا موقف اور نکتہ نظر یہ ہے کہ یہ کوئی پیچیدہ اور گنجلک سوال نہیں۔ اس کیلئے غور وفکر کے گہرے سمندر میں اُترنے کی ضرورت نہیں۔ دہشت گردی اور خودکش حملوں کی موجودہ لہر کے اسباب سب کے سامنے ہیں۔ صدر بش یا ٹونی بلیئر کو نظر نہیں آ رہے تو یہ چراغ تلے اندھیرا ہے۔ اپنے مفادات کے حصول کیلئے اپنائے گئے غلط طریقوں کو اپنے عوام کی نظروں سے اوجھل رکھنے کی کوشش ہے۔

مسلمانوں کے بارے میں امریکہ اور یورپ میں یہ تاثر پھیلایا جا رہا ہے بلکہ پھیلایا جا چکا ہے کہ یہ لوگ من حیث القوم شدت پسند اور خون ریزی کے دلدادہ ہیں۔ یہ غیر مہذب اور خون آشام ہوتے ہیں۔ مسلمانوں پہ اس سے بڑا بے بنیاد الزام شائد ہی کوئی ہو۔ مسلمان تو امن وسلامتی کے داعی اور دُنیا کو پہلی مرتبہ انسانی حقوق سے روشناس کرانے والے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پیروکار ہیں۔ رہی ان کے جنگ وجدل کی تاریخ تو من حیث القوم مسلمان بھی اتنے ہی جنگجو ہیں جتنی کوئی اور قوم ماضی یا حال میں پائی جاتی ہے۔

اگر تاریخ میں صرف مسلمان ہی جنگ وجدول اور ظلم وستم کی علامت ہیں تو پاپائے روم نے پچھلے دنوں صلیبی جنگوں کے دوران مسلمانوں پہ ہونے والے ظلم وستم پہ معذرت کس بات کی کی تھی۔ تاریخ گواہ ہے کہ تشدد پہ اتر آنے والوں میں بقیہ مذاہب کے پیروکار اور قومیں بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ اب رہی بات حالیہ دہشت گردی کی لہر میں کچھ مسلمانوں کے ملوث ہونے کی تو اس کے ذمہ دار بھی امریکہ، برطانیہ اور ان کے مغربی حلیف ہیں۔

گذشتہ صدی کی آخری چوتھائی میں امریکہ نے سوویت یونین کا شیرازہ بکھیرنے کیلئے کیمونزم کے خلاف مذہب کو ہتھیار بنایا۔ سوویت یونین افغانستان میں داخل ہوا تو امریکہ نے افغانستان کے مذہبی عسکریت پسند گروہوں کی مدد کیلئے دُنیا بھر سے شدت پسند مسلمانوں کو اکٹھا کیا۔ انہیں ڈالرز دیئے، اسلحہ دیا۔ تربیت دی، جہاد کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا اور افغان جنگ میں جھونک دیا۔ امریکہ بہادر مسلسل کئی برس تک جہادی تنظیموں کی پشت پناہی کرتا رہا۔ مدرسوں سے نوجوانوں کو جہاد کے نام پر نکال کر سوویت یونین کے خلاف اپنی جنگ جاری رکھنے کیلئے تربیت دیتا رہا۔ یہ سلسلہ صرف پاکستان تک محدود نہیں تھا۔ افغان جہاد میں شرکت کیلئے مصر، سوڈان، سعودی عرب، چیچنیا، بوسنیا یہاں تک کہ یورپ اور امریکہ سے عسکریت پسند مسلمانوں کو لایا گیا۔ جہاد کے جذبہ سے سرشار مجاہدین کی بھرتی اور تربیت وسیع پیمانے پر اس طرح ہوئی کہ افغان جہاد ختم ہو گیا لیکن جہادیوں کا جذبہ سرد نہ پڑا۔

سوویت یونین کا انہدام امریکیوں کی منزل نہیں ایک سنگِ میل تھا جو جہادیوں کے ذریعے عبور کیا گیا۔ ایشیا اور مشرق وسطیٰ میں امریکی اپنی منصوبہ بندی کے مطابق آگے بڑھنا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چاہتے تھے۔لیکن افغانستان اور عراق راستے کا کانٹا بن گئے۔ان کانٹوں کو صاف کرنے کیلئے نائن الیون اور صدام کے نام نہاد وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار بہانہ بن گئے اور پھر مہذب امریکہ اور برطانیہ جس طرح افغانستان اور عراق کے معصوم اور بے گناہ شہریوں کیلئے عذاب بن کر نازل ہوئے۔اس پہ انسانیت کانپ اُٹھی۔

یہ عذاب، یہ اذیت مسلسل جاری ہے۔سوال یہ ہے کہ جب آپ عراق اور افغانستان پہ کارپٹ بمنگ کریں گے،تورابورا جیسی قیامت لائیں گے تو آپ کی مشق ستم کا نشانہ بننے والے آپ کو پھول پیش کریں گے؟ٹونی بلیئر صاحب اگر آپ دہشت گردی کے اسباب جاننا چاہتے ہیں تو اپنا اور صدر بش کا داغدار دامن دیکھ لیجئے۔اس پہ بڑے بڑے دھبے آپ کی اُلجھن دور کریں گے اور اگر آپ شدت پسندوں کو امن پسند بنانا چاہتے ہیں تو جارج بش کو مشورہ دیجئے کہ وہ عراق پر حملے اور قبضے کا جواز پیش نہیں کر سکے چنانچہ عراق کو عراقیوں کے حوالے کر کے اتحادی افواج کو فوراً وہاں سے نکال لیں۔اقوام متحدہ کا کوئی چارٹر آپ کو اجازت نہیں دیتا کہ کسی ملک پر لولے لنگڑے جواز کے ساتھ حملہ کر کے قبضہ کر لیں اور اپنا قبضہ برقرار رکھنے کیلئے معصوم شہریوں پہ قیامت برپا کئے رہیں۔افغانستان کو اپنے شکنجہ میں کسنے کی بجائے وہاں کے عوام کو اپنی مرضی کی زندگی بسر کرنے دیں۔فلسطین کے عوام کو اسرائیلی بھیڑیوں کی خون آشامی سے بچا کر انہیں زندہ رہنے کا حق دیں۔فرانس کے سابق صدر اور برطانیہ کے سابق وزیر اعظم نے کہا تھا کہ وہ یورپ میں کوئی مسلم ریاست (بوسنیا) برداشت نہیں کریں گے۔اس طرح کی سوچ تہذیبوں کے تصادم کو جنم دیتی ہے۔اس سوچ کی بیخ کنی کریں۔امریکہ اور یورپ تیسری دُنیا اور بالخصوص مسلم ممالک کا استحصال کر کے ان کی دولت دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔ آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک بتاتے ہیں کہ دُنیا بھر کی لوٹی ہوئی دولت مغرب میں ہے۔تیسری دُنیا کے ممالک میں مغرب کے ایجنٹ حکمرانوں کو بھی لوٹنے کی اجازت ہے۔ان کی لوٹی ہوئی دولت یورپ اور امریکہ میں آف شور کمپنیوں اور بے نامی اکاؤنٹس کی صورت میں موجود ہے۔استحصال زدہ عوام میں آپ کے خلاف نفرت کے الاؤ دھک رہے ہیں۔گذشتہ پانچ برسوں سے جاری

دہشت گردی کے دو بڑے اسباب ہیں۔آپ کی جارحیت اور استحصال۔ابوغریب اور گوانتاناموبے جیسے زندانوں میں آپ کی تہذیب وشائستگی وحشی رقص پیش کرنا چھوڑ دے۔فلسطین، عراق اور افغانستان میں آپ کی جمہوریت پسندی اور انسان دوستی اپنی خون آشامی بند کر دے۔مسلمان ملکوں کا اقتصادی استحصال ختم کر دیا جائے۔ہر مسلمان کو دہشت گرد سمجھنا چھوڑ دیا جائے تو یقیناً اس عمل کا ردعمل نہیں اُبھرے گا۔

اگست 2005ء

www.iqbalkalmati.blogspot.com

امریکہ بھارت گٹھ جوڑ

گزشتہ ماہ صدر بش کے دورہ جنوبی ایشیا کو پاکستان کی ہزیمت امریکہ کا پاکستان سے امتیازی سلوک، اہانت آمیز رویہ اور نہ جانے کیا کیا نام دیئے جا رہے ہیں۔ صدر مملکت نے اس طرح کے تبصروں کو INDIA CENTRIC سوچ کہہ کر مسترد یا کم از کم نظر انداز کرنے کی کوشش کی ہے۔ پاکستان آجکل بھارت کے ساتھ اعتماد سازی کی کوششوں میں مصروف ہے اور کسی بات کو یہ عمل متاثر کرنے کیلئے اچھالنے سے گریزاں ہے۔ ہم بھارت کے ساتھ معمول کے تعلقات اور کشمیر سمیت سب تنازعات کے خاتمہ کے حامی ہیں۔ اور امریکہ بھارت تعلقات کی نئی نہج کو ایک اور پس منظر میں دیکھتے ہیں۔ سپوتنک کے صفحات گواہ ہیں کہ اس پس منظر کا تذکرہ ہم ان دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات میں نئی پیش رفت سے بہت پہلے سے کرتے آرہے ہیں۔

امریکہ کی طرف سے بھارت کو ایٹمی شعبہ میں تعاون کا مطلب ہے کہ امریکہ نے بھارت کو ایٹمی طاقت تسلیم کر لیا ہے اور اس ضمن میں سہولتیں اور مراعات دی جا رہی ہیں۔ مبصرین کا کہنا ہے کہ بھارت کو چین کے مدمقابل ایک بڑی طاقت بنانے اور ایشیا اور مشرق وسطیٰ کو چینی اثر و نفوذ سے محفوظ رکھنے کیلئے اس طرح کے اقدامات کئے جا رہے ہیں۔ امریکہ چین کو کارنر کرنے کیلئے اس سے بھی آگے جانے اور بھارت کو سلامتی کونسل میں مستقل نشست دلوانے پر تیار نظر آتا ہے۔ دوسری طرف اسے پاکستان کا ایٹمی پروگرام قابل قبول نہیں۔ وہ پاکستان کو ایٹمی طاقت کا درجہ دینے پر تیار نہیں۔ ایران کے ایٹمی پروگرام پر وہ تلملا رہا ہے۔ اسے طاقت کے ذریعے روکنے پر آمادہ دکھائی دیتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ایران جیسے ملک کا ایٹمی طاقت بننا دنیا کو خطرے میں ڈال دے گا۔ عراق کے معاملے میں بھی وہ اس طرح کا شور مچا چکا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہم اس صورت حال کو ایک اور (اپنے مخصوص) نکتہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ امریکہ نیو ورلڈ آرڈر میں اسلامی دنیا کو جس مقام پر رکھنا چاہتا ہے اس کیلئے تیزی سے مطلوبہ اقدامات کر رہا ہے۔ وہ نئی صدی میں اپنی فوقیت اور بالا دستی کو برقرار رکھنے کیلئے اسلامی دنیا کے قدرتی وسائل پر تصرف چاہتا ہے۔ اسلامی دنیا کو عسکری، ایٹمی یہاں تک کہ تجارتی اور سفارتی شعبوں میں مفلوج کرنا چاہتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امریکہ، بھارت کو اس لئے نواز رہا ہے کہ وہ خود جمہوریت پسند ہے اور بھارت کو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت سمجھتا ہے۔ کچھ مبصرین کا کہنا ہے کہ بھارت ایک ارب سے زیادہ صارفین کی منڈی ہے۔ امریکہ اور یورپ کی ملٹی نیشنل کمپنیاں ان صارفین کو کھونا نہیں چاہئیں اس لئے امریکہ بھارت کو زیادہ سے زیادہ مراعات دے رہا ہے۔

ہمارا موقف یہ ہے کہ چین کسی طرح کا خطرہ بن کر اچانک نمودار نہیں ہوا۔

1980ء کے عشرہ سے مغربی مبصرین واویلا کر رہے تھے کہ چین ایک ایسی صنعتی طاقت بن کر ابھر رہا ہے جو امریکہ اور یورپ سے ایشیاء اور مشرق وسطی کی منڈیاں چھین لیے گا۔ یہ خطرہ اب حقیقت میں ڈھل چکا ہے۔ چین ہر طرح کی مصنوعات کے ساتھ ساتھ ایشیاء اور افریقہ کے بعد یورپ میں بھی داخل ہو چکا ہے۔ لیکن صنعتی طاقت کی حیثیت سے چین اگر کسی طرح کا خطرہ ہے تو بھی اس خطرے کا سدباب بھارت کو ایٹمی شعبہ میں مراعات دینے اور اسے ایشیاء میں ایک بڑی عسکری طاقت بنانے سے نہیں کیا جاسکتا۔ چین نے کبھی توسیع پسندانہ عزائم کا اظہار بھی نہیں کیا کہ بھارت کو اس کے راستے کی دیوار بنانے کیلئے طاقتور بنایا جائے۔

امریکہ کا دعویٰ ہے کہ وہ کرہ ارض کو ایٹمی ہتھیاروں سے پاک کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ وہ لیبیا، ایران، عراق یا پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ لیبیا کا ڈنک تو اس نے نکال دیا ہے۔ عراق میں وہ بنفس نفیس آگیا ہے۔ پاکستان کو کسی حد تک اس نے پابند کرلیا ہے۔ ایران کیلئے اس کی پھنکاروں میں شدت آتی جارہی ہے۔ لیکن یہی امریکہ اسرائیل اور بھارت کے ایٹمی پروگرام کے معاملے میں امتیازی رویہ پر اتر آیا

ہے۔ بھارت نے ایٹمی ہتھیاروں کے عدم پھیلاؤ کے معاہدے پر آج تک دستخط نہیں کئے لیکن اسکے ایٹمی پروگرام پر کوئی قدغن لگانے کی بجائے اسے غیر عسکری سرگرمیوں کے نام پر جدید ٹیکنالوجی فراہم کرنے کے معاہدے سے نوازا جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ آخر بھارت اور اسرائیل کے نخرے کیوں اٹھائے جارہے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ امریکہ میں اسرائیل نواز عناصر کے ہاتھوں میں امریکی ارباب اقتدار کی ڈوریاں ہیں اور اس لئے بھی نہیں کہ بھارت دنیا کی بہت بڑی جمہوریت ہے اور وہ چین کے خلاف امریکہ کا دست راست بن سکتا ہے۔ یہ سب باتیں جزوی محرکات ہیں۔ اصل محرک ان دونوں ملکوں (اسرائیل اور بھارت کی مسلمان دشمنی ہے)۔ بھارتی سیکرٹری خارجہ نے تو صاف صاف لفظوں میں بتادیا ہے کہ امریکہ کرہ ارض کے مشرقی نصف کرہ میں ابھرتی ہوئی اسلامی قوس کو شدت سے روک دینا چاہتا ہے۔

اسرائیل کی اپنی بقا اسی میں ہے کہ اس کے اردگرد اسلامی ملک بے دست وپا ہوں۔ ایشیا اور افریقہ سے اسے کوئی خطرہ نہ رہے۔ امریکہ نے کسی حد تک اسکی یہ ضرورت پوری کردی ہے اردن اس کا تابع مہمل ہے۔ عراق میں وہ خود بیٹھ گیا ہے۔ ایران کو مغلوب کرنے کی کوششوں میں ہے۔ افغانستان میں اسکی کٹھ پتلی حکومت ہے۔ پاکستان کے معاملے میں اسے کچھ باتوں میں کامیابی حاصل ہوچکی ہے بقیہ باتوں کیلئے اسکی حکمت عملی ذرا مختلف ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں پر اسے بھارت کی ضرورت ہے اور بھارت کا کردار شروع ہوتا ہے۔

اسلامی قوس کو مزید ابھرنے اور پھیلنے کا موقع نہ دینا اکلوتی عالمی طاقت امریکہ کیلئے مستقبل میں کھل کھیلنے کیلئے بہت ضروری ہے۔ اسے دبانے سے نہ صرف مستقبل محفوظ کیا جائے گا بلکہ عیسائی دنیا کے اجتماعی لاشعور میں پوشیدہ صلیبی جنگوں کا حساب چکانے کی نفسیاتی تسکین کا اہتمام بھی ہوگا۔ کچھ لوگ اس بات کو ماضی میں رہنے اور تہذیبوں کی جنگ کے مفروضہ کی بنیاد پر خود کو اہم سمجھنے کا خبط قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ خبط نہیں ٹھوس حقیقت ہے۔ امریکہ، بھارت گٹھ جوڑ چین کے خلاف نہیں۔ عالم اسلام کے خلاف ہے ترکی، مصر،

www.iqbalkalmati.blogspot.com

افغانستان اور خلیجی ریاستوں کو اپنے اشاروں پر نچانا امریکہ کیلئے کافی نہیں۔ مسلمانوں میں پائے جانے والے جذبہ جہاد کا اسے اچھی طرح علم ہے۔ افغانستان سے سوویت یونین کو نکالنے کیلئے وہ اسے اپنے مفاد میں استعمال بھی کر چکا ہے یہ جذبہ قوم پرستی سے زیادہ شدید اور غیر مغلوب ہے۔ اسکا تجربہ اسے افغانستان اور عراق میں آجکل ہو رہا ہے۔

امریکی منصوبہ ساز اگلی نصف صدی کیلئے جو حکمت عملی مرتب کر چکے ہیں۔ امریکہ بھارت گٹھ جوڑ اسی کا ایک حصہ ہے۔ ایشیاء کی سیاسی تقسیم میں بھارت کو اہم ترین کردار سونپا جا رہا ہے۔ بغل میں چھری منہ میں رام رام کا کردار بھارت سے بہتر کون ادا کر سکتا ہے۔ بھارت دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہونے کے کھوکھلے اعزاز کی بجائے ہر طرح سے ہیوی ویٹ بننا چاہتا ہے۔ وہ کشمیر کا مسئلہ بھی اسی لئے حل کرنے کا خواہشمند ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اس کی نظروں میں کشمیر کا مسئلہ کیا ہے اور وہ اس کا کیا حل چاہتا ہے۔ آنے والے برسوں میں امریکہ کی ضرورت اور بھارت کی خواہش پوری کرنے کیلئے ہنود و یہود سازش مکمل طور پر تیار ہے۔ ہنود و یہود ان معنوں میں بھی کہ اسرائیل اور بھارت اسکے فعال اجزاء ہوں گے اور اس لئے بھی کہ امریکہ کے (یہودی) تھنک ٹینک اور بھارت کے (ہندو) تھنک ٹینک ایک مشترکہ ہدف اور مشترکہ حکمت عملی طے کر چکے ہیں۔

اس کا جواب، اس کا سدباب، اپنے گھوڑے تیار رکھنے میں ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ اسلامی دنیا کے قائدین اور سربراہان اپنے اقتدار کے تحفظ سے بلند ہو کر کچھ نہیں سوچیں گے۔ لیکن ہم اسے اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ پاکستان اور امت مسلمہ کو درپیش خطرات کی نشاندہی ہی کرتے رہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہنود و یہود گٹھ جوڑ کا توڑ کچھ جرأت مندانہ فیصلوں اور نئی حکمت عملی میں ہے۔ چین، پاکستان اور ایران پر مشتمل اتحاد یا کم از کم مربوط حکمت عملی اسکا موثر جواب ہوگی۔ ایران کو حصار میں لینے کے لئے امریکہ جو کھیل کھیل رہا ہے۔ بلوچستان میں ہونے والی گڑبڑ اسی کا شاخسانہ ہے۔ حکومت نے جس طرح داخلی محاذ پر بلوچستان اور وزیرستان کیلئے غیر لچکدار رویہ اپنایا ہے۔ اسے اسی طرح خارجی محاذ پر بھی اپنانا ہوگا۔ ایسے مواقع لیڈرشپ کا امتحان ہوتے ہیں۔ بین الاقوامی سطح پر عالم اسلام کو متحرک کیجئے اور نئی

صف بندی پہ قائل کیجئے۔ داخلی اور قومی رخ پر خود کو مضبوط رکھنا چاہتے ہیں تو مفاد پرست سیاستدانوں کے لشکر پر بھروسہ نہ کیجئے۔ عوام کے دکھ درد کا مداوا کیجئے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جمہوریت کا مقصد اور حتمی مقصد عوام کی فلاح و بہبود ہوتا ہے۔ عوام کی بہتری کیلئے کچھ کیجئے۔ انہیں روز بروز بڑھتی ہوئی مہنگائی کے عذاب سے نکالئے۔ انہیں عدم تحفظ اور بے روزگاری سے نکالئے وہ آپ کے شانہ بشانہ ہوں گے۔ آپ کا داخلی استحکام ہی آپ کو اعتماد کے ساتھ خارجہ معاملات قومی مفاد کے مطابق نمٹانے کی صلاحیت بخشتا ہے۔

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں لا الہ الا اللہ

اپریل2006ء

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں
www.iqbalkalmati.blogspot.com

امریکہ پاگل پن کے راستے پر

آجکل بین الاقوامی سطح پر دنیا کی توجہ کا مرکز ایران کے ایٹمی پروگرام کے حوالے سے تہران اور واشنگٹن کے درمیان پیچیدہ اور سنگین ہوتی ہوئی کشیدگی ہے۔ ایران کا موقف ہے کہ یورینیم کو پُر امن مقاصد کیلئے افزودہ کرنا اسکا حق ہے جس سے وہ دستبردار نہیں ہوگا۔ تاہم اسے ایٹمی توانائی کی بین الاقوامی ایجنسی (IAEA) کے ساتھ مل کر کام کرنے میں کوئی اعتراض نہیں۔ اسکا کہنا ہے کہ ایک آزاد اور خود مختار ملک کی حیثیت سے اپنی جوہری ضروریات کا تعین کرنا اس کا اپنا اختیار ہے اور اس سلسلے میں وہ کسی سے ڈکٹیشن لینے پر تیار نہیں۔ عالمی ادارے آئی اے ای اے کا موقف ہے کہ وہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ ایران کا جوہری پروگرام صرف پرامن مقاصد کیلئے ہے۔ لیکن وہ قطعیت کے ساتھ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ایران نے جوہری ہتھیار بنانے کی طرف کوئی خوفناک پیش رفت کر لی ہے۔ اس کے باوجود امریکہ کا مطالبہ ہے کہ ایران اپنی جوہری سرگرمیاں بند کر دے۔ امریکی رہنما کہہ رہے ہیں کہ وہ ایران کے خلاف اقوام متحدہ کے ذریعے اقتصادی پابندیاں عائد کرنے کے علاوہ فوجی آپشن بھی پوری طرح کھلے رکھے ہوئے ہیں اور جب تک ایران اپنی ان سرگرمیوں سے باز نہیں آتا اس وقت تک امریکہ اپنا یہ آپشن کھلا رکھے گا۔ صدر بش نے گزشتہ دنوں صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے اگرچہ مسئلہ کے سفارتی حل کی خواہش کا اظہار کیا ہے مگر ایرانی تنصیبات پر ایٹمی حملے کا امکان مسترد نہیں کیا۔ انہوں نے وہی دھمکی دہرائی جو وہ عرصہ سے دے رہے ہیں کہ ایٹمی طاقت کے استعمال سمیت تمام آپشنز ہمارے لئے کھلے ہیں۔ ایران ایٹم بم بنا رہا ہے اور اسے روکنا ضروری ہے۔

ایران کے صدر احمدی نژاد نے تہران میں فوجی پریڈ سے خطاب کے دوران اعلان کیا ہے کہ ایرانی فوج کسی بھی حملے کا بروقت مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے حملہ آوروں کے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہاتھ توڑ دیئے جائیں گے۔ انہوں نے بھی اپنی وارننگ کا اعادہ کیا کہ حملہ آور کو سبق سکھا دیا جائے گا۔ ایران اور امریکہ دونوں کے رویہ میں سختی ایک سنگین صورت حال پیدا کر رہی ہے۔

امریکہ نے ایران پر پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ اس کا اصرار ہے کہ سلامتی کونسل بھی ایران کے اثاثوں کو منجمد کرنے اور ویزے کی پابندیاں لگانے جیسے اقدامات کرے۔ نائب امریکی وزیر خارجہ نکولس برنز نے کہا ہے کہ عالمی برادری کو ایران پر عدم اطمینان ظاہر کرنا ہوگا۔

کچھ عالمی مبصرین کا خیال ہے کہ امریکہ اور ایران کے درمیان اعصاب کی جنگ جاری ہے۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے کو نفسیاتی طور پر جھکانے کی کوشش میں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ افغانستان اور عراق میں امریکہ اس طرح پھنس چکا ہے کہ وہ کوئی نیا محاذ نہیں کھولے گا۔ روس اور چین تہران کے خلاف سخت اقدامات کی ابتداہی سے مخالفت کر رہے ہیں۔ ماسکو میں چھ عالمی طاقتوں کے نمائندوں کے اجلاس میں تہران کے خلاف پابندیاں لگانے کے طریقہ کار پر اتفاق رائے نہیں ہو سکا۔ سابق ایرانی صدر علی اکبر ہاشمی رفسنجانی نے دورہ کویت کے بعد وثوق کے ساتھ کہا ہے کہ خلیجی ممالک ایران کے خلاف امریکہ کے کسی فوجی اقدام کی حمایت نہیں کریں گے۔ پاکستان کے وزیر خارجہ نے کھل کر کہا ہے کہ ایران کے خلاف کسی بھی کارروائی سے پاکستان کے مفادات متاثر ہوں گے اور عالم اسلام میں بے چینی پھیلے گی۔ افغانستان اور عراق میں فوجی کارروائیوں کے نتیجہ میں وسیع پیمانے پر انسانی ہلاکتوں کا سلسلہ جاری ہے۔ پورے خطے کے ممالک کو سیاسی' سماجی اور اقتصادی پریشانیوں کا سامنا ہے۔

لیکن یہ سوال اپنی جگہ موجود ہے کہ کیا امریکہ کو ان باتوں کی پرواہ ہے۔ عراق پر امریکی حملہ سے پہلے دنیا بھر میں کروڑوں لوگوں نے احتجاجی مظاہرے کئے۔ لیکن بش انتظامیہ کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ اسکے منصوبہ سازوں نے جو نقشہ مرتب کیا ہوا تھا۔ اس میں رنگ بھرنے کیلئے بربریت کا بھرپور مظاہرہ کیا گیا۔ آج امریکی عوام کی اکثریت عراق پر حملے کو ایک غلطی تسلیم کر رہی ہے۔ کئی سابق امریکی جرنیلوں کی طرف سے عراق پر حملے کو عاقبت نااندیشی کہا گیا ہے۔ امریکہ عملاً عراق میں مشکلات میں پھنس چکا ہے لیکن کیا

صدر بش اپنے اقدام کو غلط تسلیم کرنے کیلئے تیار ہیں۔ داخلی اور خارجی تنقید کے باوجود وہ مستقبل قریب میں امریکی فوجوں کے انخلا کی بات کرنے پر تیار نہیں۔

امریکہ اپنے ایجنڈے کی تکمیل میں مصروف ہے۔ اسے نہ تو عالمی برادری کی پرواہ ہے اور نہ عالمی معیشت پر تباہ کن اثرات کا خوف۔ اسے اس بات سے نہیں ڈرایا جا سکتا کہ مغرب اور عالم اسلام کے تعلقات میں حائل ہونے والی خلیج اس قدر وسیع ہو جائے گی کہ اسے پاٹنا ممکن نہیں رہے گا اور تہذیبوں کا تصادم ایک خوفناک صورت اختیار کر جائے گا۔ گزشتہ ربع صدی کے دوران ایشیا میں امریکی اقدامات پر نظر ڈالیں تو اس کے مقاصد اور آئندہ اقدامات سمجھنے کیلئے نیوٹن کے دماغ کی ضرورت نہیں رہتی۔ سوویت یونین ختم ہو چکا ہے۔ افغانستان میں امریکہ بنفس نفیس موجود ہے۔ بھارت کے ساتھ اس کے تعلقات اور تعاون جس سطح پر آ چکے ہیں اسکا تصور دو عشرے پہلے محال تھا۔ چین کے گرد گھیرا تنگ کیا جا رہا ہے۔ جنوبی ایشیاء اور مشرق بعید میں امریکہ کیلئے حالات پوری طرح سازگار ہیں۔ مشرق وسطیٰ میں صورت حال قابو میں لانے کیلئے تیزی سے اقدامات کئے جا رہے ہیں عراق میں آنے کی "عاقبت نااندیشی" اس نے کسی اضطراری کیفیت میں نہیں کی اس خطے میں اسے اپنے راستے کی رکاوٹ صرف ایران دکھائی دیتا ہے چنانچہ ایران کے ایٹمی پروگرام کو عراق کے نام نہاد کیمیائی، حیاتیاتی اور جوہری ہتھیاروں کی طرح دنیا کیلئے خطرہ بنا کر وہ اگلا قدم اٹھانا چاہتا ہے۔

امریکہ کا خیال ہے کہ وہ برق رفتاری کے ساتھ ایران کی ایٹمی تنصیبات پر حملہ کر کے مطلوبہ مقاصد حاصل کر لے گا۔ وہ خود محفوظ رہے گا۔ کیونکہ وہ دنیا کے مغربی نصف کرہ میں ہے۔ طاقت کے نشے میں نتائج کی پرواہ نہ کرنا نئی بات نہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ کرہ ارض پر ہمیشہ سے ایسا ہوتا آیا ہے۔ لیکن امریکہ کو یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ افغانستان اور عراق کمزور ملک تھے۔ ایران ان کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ طاقتور ملک ہے۔ ایران کے خلاف طاقت کا استعمال اسے بہت مہنگا پڑے گا۔ ابتدائی ردعمل میں اسرائیل اور مشرق وسطیٰ میں امریکی اڈے نشانہ بنیں گے اور پھر یہ عالمگیر تصادم میں تبدیل ہو جائے گا۔

طاقت کا استعمال کسی بھی مسئلہ کو حل کرنے کا درست طریقہ نہیں۔ جنگ کرنا مشکل

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

نہیں ہوتا۔ جنگ کی تباہ کاریوں سے نکلنا مشکل ہوتا ہے۔ پاکستان افغان جنگ کی بھاری قیمت ابھی تک ادا کر رہا ہے۔ اگر اس کے دوسرے پڑوسی ملک میں بھی فوجی کارروائی ہوگئی تو وہ براہ راست متاثر ہوگا۔ اسی لئے اس بحران پر پاکستان نے اپنی تشویش کا اظہار کیا ہے۔ پاکستان کا موقف ہے کہ یہ تنازعہ سفارت کاری کے ذریعے طے کیا جائے۔ وزیر خارجہ خورشید محمود قصوری نے دوٹوک انداز میں کہا ہے کہ دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ میں امریکہ کا اتحادی ہونے کے باوجود پاکستان ایران کے خلاف کسی بھی جارحیت کا حصہ نہیں بنے گا۔ انہوں نے اس بحران کو سفارت کاری کے ذریعے حل کرنے کیلئے تہران، واشنگٹن اور یورپی یونین کے درمیان مذاکرات کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ایران پر حملہ خود امریکی مفادات کے خلاف ہوگا۔

بش انتظامیہ کو اس کے پاگل پن سے روکنے کیلئے ضروری ہے کہ دنیا کے تمام امن پسند یکجہتی کا مظاہرہ کریں۔ یورپی یونین نیم دلانہ کوشش کے بعد خاموش ہوگئی ہے۔ اسے چاہئے کہ اپنا فعال کردار ادا کرے۔ امریکہ پر زور دے کہ وہ ایران کے ساتھ اس مسئلہ کو سفارتی کوششوں کے ذریعے حل کرے۔ ایران نے این پی ٹی پر دستخط کر رکھے ہیں۔ یہ سمجھوتہ اسے جو حقوق مہیا کرتا ہے انہیں نظر انداز نہ کیا جائے۔ روس، چین اور جرمنی تاریخ کے اس نازک موڑ پر اپنی ذمہ داریوں سے پہلوتہی نہ کریں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اسلامی تنظیم (او آئی سی) صورت حال کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے فعال کردار ادا کرے۔ سفارت کاری کے ذریعے جو کام یہ تنظیم کر سکتی ہے وہ کوئی اور بین الاقوامی فورم نہیں کر سکتا یہ تنظیم ابھی تک خاموش ہے۔ کیا وہ حملہ ہو جانے کے بعد جاگے گی؟۔ امریکہ اپنے پاگل پن کا مظاہرہ کرنے پر تلا بیٹھا ہے۔ اسلامی برادری کو اپنے اختلافات اور عارضی مفادات کو پس پشت ڈال کر آگے بڑھنا اور امریکہ کو روکنا ہوگا۔ ورنہ اس تصادم کے نتائج خطے کیلئے ہی نہیں عالم اسلام اور کرہ ارض کے لئے ہولناک ہوں گے۔ اور اس کی ذمہ داری امریکہ ہی نہیں عالم اسلام پر بھی عائد ہوگی۔ ظالم کو ظلم سے نہ روکنا بھی اتنا ہی بڑا گناہ ہے۔

مئی 2006ء